ہوتے ہیں۔ اس سے انکی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُن ہندؤں کو خوش کریں جو مسلمانوں کی زبان سے اپنی زبان کو تحریر کے ذریعہ الگ کرنا چاہتے ہیں ۔ ان اخباروں کے علاوہ آگرہ میں بغاوت ہند کے نام سے ایک ماہوار رسالہ اور نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کے مدیر مکند لال ہیں ۔ آگرہ کے اور دوسرے نئے اخبار حسب ذیل ہیں —

آفتاب عالمتاب ' یہ اردو کا اخبار ہے۔ اس کے مضامین ہندی رسم خط میں سورج پرکاش کے نام سے شائع ہوتے ہیں۔ ایک ہندو جنکا نام گنیش لال ہے اس کی ادارت کرتے ہیں —

اخبار حیدری اور اخبار حسینی دونوں اردو کے اخبار ہیں ۔ پہلے کے مدیر مرزا علی حسینی حیدری ہیں اور دوسرے کے سید حسین علی جو دلی کالج میں پروفیسر ہیں اور انھوں نے الف لیلہ کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے —

" اجمیر " کے دو نو اخبار " جگ لبھ چنتک " اور " خیر خواہ خلایق " ہیں ۔ پہلا اخبار ہندی کا ہے اور اس کے مدیر سوھن لال ہیں ۔ دوسرا اردو کا ہے اور اس کے مدیر کا نام " اجودھیا پرشاد ہے جو اسوقت اردو کے مشہور لکھنے والوں میں شمار ہو تے ہیں ۔ انھوں نے علم الحساب اور دوسرے موضوعوں پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں —

اٹاوہ سے پندرہ روزہ گزٹ شائع ہوتا ہے جس کا نام " پرجاہت " ہے ۔ یہ مطبع " مصدرالتعلیم میں طبع ہوتا ہے ۔ اس کے اردو ایڈیشن کا نام محب رعایا ہے اور انگریزی ترجمہ جو اس کے ساتھ شائع ہوتا ہے اس کا نام People's Friend ہے ۔ اس کے مدیر حکیم " جواہر لال ہیں ۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں اور انگریزی زبان سے ترجمہ بھی کئے ہیں ۔ اس

گزٹ کو آگرہ کے گزٹ " اخبار النواح " کا قایم مقام سمجھنا چاہئے - اخبار النواح بھی حکیم " جواھر لال " ھی کے زیرادارت نکلتا تھا - ان دونوں اخباروں کا مقصد یہ رھا ھے کہ اپنے مضامین کے ذریعہ سے اخلاقی اصول کی نشر و اشاعت کیجائے اور مختلف ملکوں کی ٹھیک ٹھیک خبریں درج کی جائیں اور یوں ھی سنی سنائی باتوں کو بطور سند نہ پیش کیا جائے —

" لدھیانہ " کا ھفتہ وار اخبار نور علی نور اب نہیں شائع ھوتا - اس کی جگہ اخبار مجمع البحر میں نکلنا شروع ھوا ھے - اس کے مدیر اصغر حسین ھیں

جونپور سے نسیم جونپور شائع ھوتا ھے - اس کے مدیر سید مظفرالدین ھیں - سہارنپور سے وکٹوریہ گزٹ نکلتا ھے - اس کے مدیر ایک انگریز ھیں اور اگرچہ اس کے نام سے یہ ظاھر ھوتا ھے کہ شاید انگریزی کا اخبار ھے ' لیکن نہیں ' یہ اخبار نہایت شستہ اردو زبان میں نکل رھا ھے - الہ آباد سے امین الاخبار عزیزالدین خاں کے زیر ادارت شائع ھوتا ھے - موصوف کا شمار مشہور و معروف مسلمانوں میں ھوتا ھے - " کانپور سے اخبار " شعلہ طور ، جہانگیر شاہ کے زیرادارت شائع ھوتا ھے - یہ اخبار روزانہ ھے —

بدقسمتی سے ان سب اخباروں کی اشاعت بہت تھوڑی ھے - اور شمال مغربی صوبوں کی تین کروڑ تیس لاکھ آبادی میں سے بہت کم لوگ ایسے ھیں جو انہیں پڑھتے ھیں —

ھندوستان کے اور دوسرے صوبوں کے اردو اخباروں کے متعلق میری معلومات محدود ھیں - میں صرف آپ صاحبوں کو اسقدر بتلا سکتا ھوں کہ سنہ ۱۷۹۰ ع میں سورت سے ایک اردو اخبار نکلتا تھا جسکا نام منظورالاخبار تھا - اب آج کل اس کا نام نجم الاخبار ھے - اتفاق سے کلکتہ کی Urdu Guide (و ھنمائے کلکتہ) کا ایک نسخہ مجھے مل گیا ھے جس سے معلوم ھوتا ھے کہ یہ

ہفتہ وار ہر جمعہ کے روز شائع ہوتا ہے —

سلہ ۱۸۶۰ ع کی ابتدا تک شمالی مغربی صوبوں میں ۴۶ مطبع کام کر رہے تھے - اس تعداد میں مرزا پور مشن اور Medical Press کے مطبع بھی شامل ہیں - مسٹر ایچ اسٹورٹ ریڈ نے جو میرے لئے معلومات فراہم کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سال گزشتہ ۳۸۶ مطبوعات ان صوبجات میں شائع ہوئیں - اور یہ مطبوعات کل ۶۵۳۵۴۳ نسخوں پر مشتمل تھیں - ان میں ۴۶ مطبوعات جو ۳۵۱۶۰۰ نسخوں پر مشتمل تھیں نظامت تعلیمات کی طرف سے طبع ہوئیں - باقی ۳۴۱ مطبوعات جو ۳۰۱۹۴۳ نسخوں پر مشتمل تھیں انہیں ہم حسب ذیل اقسام میں تقسم کر سکتے ہیں —

(۱) ابتدائی مدارس کی کتابیں جیسے قاعدے ، صرف و نحو ، فصاحت و بلاغت کی کتابیں - ۳۸ کتابیں اس قسم کے تحت میں آتی ہیں - ان کے کل مطبوعہ نسخوں کی تعداد ۴۸۷۰۰ تک پہنچتی ہے —

(۲) مذہب و اخلاق فلسفہ اور دیو مالا سے متعلق ۱۰۵ کتابیں طبع ہوئیں - کل نسخوں کی تعداد ۱۲۷۷۰۰ ہے —

(۳) فلکیات اور اختر شناس پر ۱۵ مطبوعات - نسخوں کی تعداد ۷۰۵۰

(۴) شعر و شاعری پر ۲۱ کتابیں - کل نسخوں کی تعداد ۱۸۰۴۴

(۵) تاریخ پر ۹ کتابیں کل نسخوں کی تعداد ۳۵۵۰

(۶) اصول قانون اور فقہ پر ۵۵ کتابیں - کل نسخوں کی تعداد ۲۶۲۲۹

(۷) طب پر ۷ کتابیں — کل نسخوں کی تعداد ۵۴۰۰ —

(۸) جغرافیہ پر ۷ کتابیں — کل نسخوں کی تعداد ۴۸۴۰ —

(۹) علم الحساب ، اقلیدس اور جبر و مقابلہ پر ۴۰ کتابیں کل نسخوں کی

تعداد ۱۸۵۰ —

(۱۰) جنتریاں - ۲۰ مطبوعات دل طبع شدہ نسخوں کی تعداد ۱۷۳۲۵ —

(۱۱) قواعد ڈاکخانہ - اس کے صرف ۴۰۲ نسخے طبع کئے گئے —

اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ پر مطبوعات کی تعداد بہت کم ہے - انسانی علم کی اس شاخ کو شاید ہندوستانی لوگ زیادہ اہمیت کی نظر سے نہیں دیکھتے - شاید ان کے نزدیک بھی تاریخ کی تعریف وہی ہے جو یہاں یورپ میں کسی نے جل کر کی ہے کہ تاریخ چند غیر معتبر روایات کا مجموعہ ہے جسے انفرادی تعصبات کے رنگ و روغن کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے —

حال کی اردو مطبوعات میں مجموعہ قوانین تعزیرات ہند کو بڑی اہمیت حاصل ہے - یہ بڑی تقطیع پر ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے - ہندوستانی فاضلوں کی جماعت نے اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے - مسٹر ایچ اسٹورٹ ریڈ نے بھی اس کی تکمیل میں بڑی مدد کی اور صوبجات شمال مغربی کے لفٹنٹ گورنر جی ایڈمنسٹن صاحب نے خود بہ نفس نفیس اس ترجمہ پر نظرثانی فرمائی ہے - اس سال کے ختم سے پہلے مجموعۂ قوانین تعزیرات ہند شائع ہوجائے گی اس واسطے کہ نئے تعزیری قوانین کا یکم جنوری سے نفاذ شروع ہوگا - ہندوستان سے میرے نام اس کا ایک نسخہ بھیجا گیا ہے جس کے متعلق مجھے اطلاع تو آ گئی ہے مگر ابھی تک وہ پہنچا نہیں - اس کے علاوہ جمع النفائس اور عجائبات صنعت شعاری کے نسخے بھی بھیجے گئے ہیں مگر ابھی تک مجھے نہیں پہنچے - آخرالذکر انگریزی کتاب The Phenomena of Industrial Life and conditions of Industrial success سے خوشہ چینی کرکے لکھی گئی ہے -

اس کتاب میں ہندوستان کے موجودہ معاشی حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے —

ناصر خاں نے ڈاکٹر W. Anderson کی مدد سے ڈاکٹر Abercrombia کی کتاب " Inquiries on the intellectual Powers " کو اردو کا جامہ پہنایا ہے - اسی ترجمہ کا نام رہنمائے حکمت رکھا ہے - اس کا پہلا حصہ اسی سال آگرہ سے شائع ہوگیا —

ہمیں یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ صرف صوبجات شمال مغرب ہی میں اردو زبان کی ترقی کی کوششیں ہو رہی ہیں بلکہ اردو کی ترقی میں سارا ہندوستان شریک ہے - چنانچہ حال ہی میں لاہور میں گلاب رام دیا نے مدرسے کے بچوں کے لئے ایک کتاب لکھی جس کا نام " ورنت وفادار سنگھہ اور غدار سنگھہ " رکھا ہے - سورج بھان نجر نے وقائع " بابا نانک " لکھی ہے - ایک اور ہندو اجودھیا پرشاد نے جغرافیہ پر ایک کتاب لکھی ہے - یہ اور دوسری کتابیں بھی تصنیف کر چکے ہیں - مولوی کریم الدین نے جن کی نسبت میں اپنے پچھلے خطبوں میں ذکر کرچکا ہوں پنجاب کا جغرافیہ لکھا ہے - ان مذکورہ بالا چاروں کتابوں میں پہلی دو سنہ ۱۸۶۰ ع میں طبع ہوئی ہیں اور آخری دو سنہ ۱۸۶۱ ع میں - یہ کتابیں مجھے امرتسر کے پرجوش مستشرق مسٹر روبرٹ کسٹ نے حال میں بھیجی ہیں - فرانسیسی سفیر مقیم کلکتہ موسیو لمبار (Lombard) نے ازرہ نوازش میرا تعارف مسٹر روبرٹ کسٹ سے کرادیا چنانچہ موصوف نے اردو کی تقریباً بیس کتابیں مجھے روانہ فرمائی ہیں - اس میں بیشتر خود موصوف کی کتابوں کے اردو ترجمے ہیں - ان میں پنجاب کا اردو نقشہ

بھی شامل ہے - یہ تقریباً ایک مربع گز ہے اور لاہور کے مطبع [illegible] نور میں سنہ ۱۸۶۰ ع میں طبع ہوا ہے —

اردو زبان کے ادبی اور علمی مشاغل کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں آپ صاحبان کے سامنے مسیحی مبلغین کی انجمنوں کی کارگزاری کی نسبت کچھ نہ کہوں - جیسا کہ میں اپنے پچھلے خطبے میں کہہ چکا ہوں کہ " برطانیہ اور ممالک غیر کی انجمن انجیل " نے انجیل کا جو دلپذیر ترجمہ گزشتہ سال شائع کیا اسے یقیناً اردو زبان کی چوٹی کی کتابوں میں سمجھنا چاہئے - یہ ترجمہ اس لئے اور بھی عمدہ اور معتبر ہے کہ ایک مشہور ہندوستانی فاضل نے اس کام میں ہاتھ بٹایا ہے - کہا جاتا ہے کہ اس ہندوستانی فاضل کو اپنی زبان اردو کے علاوہ انجیل مقدس پر پورا عبور حاصل تھا - اس ترجمے کی ترتیب میں سلیقے کو ملحوظ رکھا گیا ہے - اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ لوگ بھی اسے پسند کریں گے جو کہتے ہیں کہ مسیحی انجمنیں بالعموم انجیل مقدس کو غیر مسیحی لوگوں اور جاہل عیسائیوں کے سامنے نہایت بھونڈے طریقے سے پیش کرتی ہیں - اس ترجمے میں حواشی کا بھی التزام کیا گیا ہے - ان حواشی میں ہم مضمون عبارتیں اور استعاروں کی تشریح کی گئی ہے - اس کے ساتھ واقعات کی تاریخیں ' مختلف ترجموں کے فرق اور بعض جگہ عبرانی یا یونانی کے لفظ بہ لفظ عبارتیں درج ہیں ہر باب [illegible] ہر صفحے پر زیر بحث مضمون کے اشارے [illegible] موضوع شروع ہوتے ہیں وہاں خاص خاص نشان کردئے گئے ہیں جن کی حیثیت وہی سمجھنی چاہئے جو مختلف جملوں کو جدا کرنے کے نشانات کی ہے

یہ کام نہایت دیدہ ریزی سے پایۂ تکمیل کو پہونچا اور اس سے انجمن اور مسٹر ساتھر دونوں کی شہرت کو چار چاند لگیں گے جنھوں نے انتہائی جانفشانی سے اس کی چھپائی کا انتظام کیا —

ان مبلغین مسیحیت کی مختلف مطبوعات کے متعلق میں تفصیل سے ذکر نہیں کرونگا اس واسطے کہ پھر مضمون بہت طویل ہوجائیگا - یہ لوگ انجیل مقدس کی تعلیمات کی بڑے جوش سے نشر و اشاعت کر رہے ہیں ان لوگوں کے لئے مسلمان فقرا کی طرح "شاہ" کا لقب استعمال کرنا ٹھیک ہوگا کیونکہ واقعی یہ سب لوگ روحانی بادشاہ ہیں - انھوں نے یہ بادشاہی اپنے جذبات کو مغلوب کرکے حاصل کی ہے - ان کی بعض مطبوعات نہایت دلچسپ ہیں چنانچہ ایک مذہبی افسانہ نیا کاشی کھنڈ کے نام سے طبع ہوا ہے - یہ ہندی میں ہے - اس افسانے کی تمہید میں یہ بتایا گیا ہے کہ شہر بنارس کا ایک بوڑھا باشندہ اس فکر میں غلطاں پیچاں ہے کہ کسی تدبیر سے اس مقدس شہر کے سارے باشندے مسیحی مذہب قبول کرلیں اگر ایسا ہوجائے تو ان کے شہر کی قسمت جاگ جائے - اس عالم فکر میں وہ خواب دیکھتا ہے کہ اس کی دلی تمنا بر آئی - جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھتا ہے کہ ایک کتب خانہ ہے جہاں جاکر اس نے نیا کاشی کھنڈ کا ایک نسخہ خریدا - اس کتاب میں اسے اپنے خواب کی تعبیر ملگئی - اس میں ایک ہندو اور اس کے بیٹے کے درمیان جس نے مسیحی مذہب قبول کرلیا تھا فرضی گفتگو کا حال درج تھا - چنانچہ اس گفتگو کے دوران میں مسیحیت ' اسلام اور بت پرستی کا مقابلہ کیا گیا ہے - اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسیحی مذہب ہی انسان کی نجات کا ضامن ہے - ساتھ ہی ہندوں کے بعض نابکار رسوم اور ذات پات کے نقصانات واضح کئے گئے ہیں —

مذہبی قسم کی مطبوعات میں جو حال میں شائع ہوئی ہیں اور جن کا سچیے علم ہے ' حیات پال (پولس) قابل ذکر ہے - اصل میں یہ کتاب مسٹر آرکسٹ نے انگریزی میں لکھی تھی پھر اسکا * پنڈت سورج دھان نیھر اور اجودھیا پرشاد نے اردو میں ترجمہ کیا - اس میں ایک نقشہ بھی ہے جس میں اس نامور شخص کے سفر کے متعلق معلومات درج ہیں اسی قسم کی ایک کتاب سچے اوتار کے متعلق لکھی گئی ہے ' ایک حقیقی تثلیث اور ثری مورتی کے متعلق ہے ' ایک کتاب میں ایک مسیحی مبلغ اور ہندو جاتری کے درمیان مباحثہ ہے ' ایک میں قران اور انجیل کی تعلیمات کا مقابلہ کیا گیا ہے - ایک میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت مسیح کی تعلیمات کا فرق بیان کیا گیا ہے - ایک کتاب میں اسلام کی ابتدا - عروج اور زوال پر تبصرہ ہے - ان کتابوں کے علاوہ اور بہت ساری انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں جو فرانسیسی میں بھی موجود ہیں † حضرت " سلیمان کی کہاوتوں " اور " پہاڑی وعظ " کا اردو نظم میں ترجمہ کیا گیا ہے —

بمبئی کی مسیحی انجمن بھی اپنے کام میں مشغول ہے - اس انجمن نے اردو زبان میں ۲۲۰ چھوٹی بڑی کتابیں شائع کی ہیں - اردو کے

---

* یہ نام اسی خطبے میں پہلے بھی آیا ہے وہاں یہاں لکھا ہے - یہاں چھاپے کی غلطی معلوم ہوتی ہے - نیز نام کے آخری جز میں بھی کچھہ غلطی ہوگئی ہے پہلے نجر لکھا ہے یہاں نیھر ہے (مترجم)

مثلاً ; " The goldinakers village " ; " Life of Mahammap " Account From Umuasal History "

علاوہ اس صوبے کی دوسری زبانوں میں بھی ان کی مطبوعات ھیں - اس انجمن کا رسالہ " بامداد " برابر نکل رہا ہے جس کی نسبت میں اپنے سنہ ۱۸۵۹ والے خطبے میں ذکر کرچکا ھوں —

اس قسم کی تبلیغی کتب کو طبع کرنے کے علاوہ مبلغین مسیحیت ملک کے طول و عرض میں کلیساؤں کی بنائیں ڈال رہے ھیں اور مدرسے قائم کر رہے ھیں - یہ سب کچھہ ان انجمنوں اور ان افراد کی فیاضی کا طفیل ہے جن سے ہندوستان کی تبلیغی انجمنوں کا تعلق ہے - میں سمجھتا ھوں اس ضمن میں اس کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ھوگا کہ مسٹر " لیوپولٹ " کو جن کا تعلق چرچ مشن Church Mission سے ہے ۵ ہزار پونڈ کی رقم بطور عطیہ پیش کی گئی ہے تا کہ اس سے وہ شہر بنارس میں ایک مدرسہ قائم کریں جہاں اردو زبان کے ذریعہ سب تعلیم دی جاے —

جن ہندوستانیوں نے مسیحی مذہب قبول کیا ہے ان میں اچھی خاصی تعداد تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے اور ان میں بعض اردو زبان کے انشاء پرداز بھی ھیں - مسلمان لوگ حضرت مسیح کو عیسیٰ کہتے ھیں اور ہندو لوگ عیسیٰ کو سیوا (مہادیو) سے تعبیر کرتے ھیں - مسیحی دین کی اکثر یورپی اصطلاحوں کو اردو میں نہایت سلیقے سے سمو لیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان میں سامی اور یافسی دونوں قسموں کی زبانوں کے عناصر پاے جاتے ھیں - دونوں زبانوں کی ترکیبیں اس میں نہایت خوبی سے کھپ جاتی ھیں - اسلامی اور سنسکرتی عناصر سے مل کر اردو کی شاعری میں بڑی صلاحیت پیدا ھوگئی ہے - یہاں تک کہ انگریزی طرز کی نظمیں اس میں لکھی جا سکتی ھیں - اور انگریزی

مناجات کی لے تک اردو دیوں میں اچھی طرح کھپ سکتی ہے *—

۱۰ اگست گزشتہ لکھنو میں " یوسف خاں" بہادر کا انتقال ہوا -
یہ عیسائی ہونے کے ساتھہ ہی اردو زبان کے بڑے عمدہ انشاپرداز تھے -
ان کا لقب " کمبل پوش" مشہور تھا - مرحوم واجد علی شاہ بادشاہ
اودھ کے توپخانے میں تقریباً ۳۰ سال خدمت انجام دے چکے تھے - انہوں
نے اردو میں سیر و سفر کے نام سے اپنا سفرنامہ لکھا ہے - یہ سفرنامہ
دہلی میں سنہ ۱۸۴۷ ع میں شائع ہوا - استورٹ ریڈ نے اس سفرنامہ
کا مقابلہ Morier کی کتاب " Haji Baba in England " سے کیا ہے -
اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یوسف خاں بہادر
هندوستانی نہیں تھے بلکہ اطالوی تھے - یہ مسلمان بھی نہیں تھے -
بلکہ کیتھولک مسیحی تھے - اور مرتے دم تک کیتھولک عقاید پر قائم
رہے - اصل میں ان کا نام Delmerich تھا اور کہا جاتا ہے کہ ان کا فلورنس
کے مشہور Medicis خاندان سے تعلق تھا † - کوئی پندرہ سال ہوے کہ
یوسف خاں بہادر سیاحت کی غرض سے انگلستان ' فرانس ' اسپین ' پرتگال ' اور
جرمنی گئے تھے - واپسی پر " ترکی " اور عربستان کے راستے سے هندوستان

---

* ستمبر سنہ ۱۸۵۲ کے خیر خواہ هند میں ایک هندوستانی مبلغ شرمان
کی نظم نکلی ہے جو تین اور چار ارکان میں لکھی گئی —

هم سجدہ کرتے بے اداب
سر اهتے توری عطا

کہ تو خدا باپ تا ابد
پھر ثانی حاکم رهتا

† اودھ گزٹ - (Indian Mail September 1861)

واپس آئے -- میں نے ابھی جس سفر نامے کا ذکر کیا ہے وہ در اصل انھیں ملکوں کے حالات پر مشتمل ہے - انھوں نے یہ سفر نامہ خود اردو میں لکھا تھا —

میں نے ابھی جن مذہبی کتابوں کا ذکر کیا ان میں ایک اور کتاب کو شامل کرنا ضروری ہے - یہ ہندی سے اردو میں ترجمہ ہے - ساتھ ہی نہایت قابل قدر حواشی بھی ہیں - کتاب کا موضوع ہندؤں کے چھ فلسفیانہ مسلکوں کی تردید ہے - اس کتاب کا مصنف ایک برہمن ہے جس نے مسیحی مذہب اختیار کرلیا تھا - اسے اپنے مضمون پر پورا تبحر معلوم ہوتا ہے - یہ کتاب ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے - مشہور مستشرق Fitz Edward Hall نے اس کو چھپوانے کا انتظام کیا اور اس پر فلسفیانہ تنقید لکھی - یہ کتاب اور یہ تنقید در اصل اس کام کی تکمیل کرتے ہیں جسے Colebrooke اور دوسرے ماہرین ہندیات نے شروع کیا تھا —

وہ کتابیں جو دوبارہ طبع ہوئی ہیں ان میں "تحفتہ اخوان الصفا" کا ہندی اڈیشن قابل ذکر ہے - کلکتہ، ہگلی، بمبئی، اور دہلی میں متعدد مرتبہ یہ کتاب طبع ہوچکی ہے - مگر یورپ میں اب تک یہ مکمل نہیں چھاپی گئی - یہ کتاب "باغ و بہار" کی طرح سول امتحانوں کے نصاب میں داخل ہے - ڈاکٹر "ریو" نے بڑی محنت اور کاوش سے "باغ و بہار" کو پھر طبع کرایا ہے - موصوف آج کل یونیورسٹی کالج میں پروفیسری کے عہدہ پر ممتاز ہیں - مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ وہ بھی میرے خطبات سن چکے ہیں - میرے قدیم دوست اور مہربان Duncan Farbes نے اس کی طباعت کا انتظام کیا - موصوف نے اردو پر اور اردو میں متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں —

مسٹر E. H. Rogers نے ایک کتاب " How to speak Hindustani "
لکھی ہے - یہ کتاب نہ صرف فوجی لوگوں کے لئے بیحد مفید ہے جن کے
لئے خاص طور پر یہ تصنیف کی گئی ہے بلکہ ان انگریز بیرسٹروں کے
لئے بھی نہایت کار آمد ہے جن کا ارادہ ہندوستان میں وکالت کرنے کا
ہے - ہندوستان میں آج کل مقامی عدالتیں ہر جگہ قائم ہورہی ہیں -
ان نوجوان انگریزوں کے لئے جن کی اپنے وطن میں قدر نہیں ' یہ موقع
ہے کہ وہ اس وقت ہندوستان میں اپنی قسمت آزمائیں - لیکن اس سے
پیشتر کہ وہ ہندوستان جانے کا ارادہ کریں یہ از بس ضروری ہے کہ وہ
دیسی لوگوں کی زبان کو مطالعہ کے ذریعہ سیکھہ لیں - انہیں ہندوستانی
لوگوں کے ان محاوروں کو جاننا چاہئے جو ہر وقت گفتگو میں استعمال
ہوتے ہیں - مسٹر " روجر " کی کتاب میں ان کے متعلق پوری معلومات
مل سکتی ہے - موصوف پہلے Lawrence asylum کے ناظم تھے اور
اب کل chatham کے Indian Depots میں ہندوستانی کے استاد ہیں -

ہندوستانی صرف و نحو پر " انگریزی " " لاطینی " " فرانسیسی "
" پرتگالی " اور " جرمن " زبان میں جو کتابیں نکل چکی ہیں ان
میں دو کا اور اضافہ ہوا ہے - میری مراد Duncan Farbes کی کتاب سے
ہے - اس میں صرف و نحو کے ساتھہ چھوٹی سی لغت بھی ہے - یہ کتاب
اردو میں ہے مگر اس کا رسم خط رومن ہے - دوسری کتاب Monier Williams
کی " Hindustani Primer " ہے - یہ بھی رومن رسم خط میں لکھی
گئی ہے - اس میں بھی ابتدائی صرف و نحو کے ساتھہ کثیرالاستعمال الفاظ کے معنی
اور کہاوتیں درج ہیں - اگرچہ موصوف آج کل اکسفورڈ یونیورسٹی میں
سنسکرت زبان کے پروفیسر ہیں مگر انہیں ہندوستانی زبان سے جو ہمیشہ

سے شغف اور لگاؤ رہا ہے وہ بدستور قائم ہے —

مسٹر سی ماتھور کی ہندوستانی اور انگریزی کی لغت دوبارہ چھپ چکی ہے - اس میں انجیل مقدس کی ساری اصطلاحوں کے معنی دئے ہیں - جو صاحب اس کتاب کو خریدنا چاہیں خرید سکتے ہیں - خود انجیل مقدس کا جو اڈیشن موصوف نے تیار کیا تھا جس میں ایک طرف اردو ترجمہ ہے ' وہ ان کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہئے - اس ترجمہ کی قدر و قیمت میں اس لغت کی وجہ سے اور بھی اضافہ ہو جائے گا - ہندوستانی اور یوروپین دونوں اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے - بالخصوص وہ یوروپین جو ہندوستانی زبان کا مطالعہ کر رہے ہیں اس کا بڑی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کریں گے - انہیں ہندوستانی زبان سیکھنے میں اس سے بڑی سہولت ہوگی اگر وہ ذراسی بھی استعداد رکھتے ہیں تو اس کی مدد سے بآسانی آگے چل سکتے ہیں —

آپ صاحبان پر اب یہ روشن ہوگیا ہو گا کہ ہندوستان میں رومن رسم خط کا آہستہ آہستہ استعمال بڑھ رہا ہے - خود ہندوستانیوں میں ایسے اشخاص موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ عام طور پر انگریز لوگ جو رومن رسم خط استعمال کرتے ہیں اسے تھوڑی بہت تبدیلیوں کے بعد ہندوستان میں رائج کیا جا سکتا ہے - بابو شیو پرشاد نے جو بڑے فاضل آدمی ہیں اور شملہ اخبار کے مدیر بھی رہ چکے ہیں اور متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں ' حال ہی میں کلکتہ میں ایک رسالہ شائع کیا ہے جس میں اردو کے رسم خط سے بحث کی ہے - ان کا خیال ہے کہ زبان کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ رومن رسم خط اختیار کرلیا جائے اور ولسن نے جو طریقہ رائج کرنے کی کوشش کی تھی اس میں بعض ضروری تبدیلیاں

کردی جاتی ہیں —

آپ سبھوں کو غالباً معلوم ہوگا کہ ۱۲ مئی سنہ ۱۸۵۷ ع دہلی کالج کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی - اس کے کتب خانے کو مشعلوں کے نذر کردیا گیا تھا اور اس کالج کے نیک دل پرنسپل کو قتل کردیا گیا تھا - مگر خوش قسمتی سے اس کالج کی آمدنی وقف سے تھی جو اب تک موجود ہے - چنانچہ اس وقف کی آمدنی سے چاندنی چوک میں ایک دوسرا کالج قائم کیا گیا ہے جسے ہم پرانے کالج کا قائم مقام تصور کر سکتے ہیں - اس کا نام دہلی انسٹیٹیوٹ رکھا گیا ہے - ابھی اسے قائم ہوئے ایسا زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر اس میں ۴۰۰ طلبہ کے قریب تعلیم پا رہے ہیں - بعض مخیر اشخاص اور گورنمنٹ کی فیاضی کی بدولت اس کالج کے کتب خانہ میں آج تقریباً ۱۲ ہزار کتابیں موجود ہیں - اس کے ساتھ ایک عجائب گھر بھی قائم کیا جا رہا ہے - چنانچہ وائسرائے لارڈ کیننگ کی سفارش پر اس کی امداد کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی سے دگنی منظور ہوگئی - اس عجائب گھر میں ایک قدم شریف (پتھر جس پر رسول مقبول کے قدم کا نشان ہے) ہے - یہ پہلے ایک صندوق میں بند تھا اس صندوق کی نگرانی پر ایک آدمی مامور تھا جسے ۵۰ روپے ماہوار دئے جایا کرتے تھے - ایک قدم حضرۃ فاطمہ (رض) کا ہے - دہلی کے آخری بادشاہ کے حمام خانہ کی چوکی ہے - ہندوستان Materia Medica کی مختلف جڑی بوٹیاں یہاں موجود ہیں - ہندوستانی عطریات، صنعت و حرفت کے نمونے، سنگ مرمر اور سنگ موسی کی بنی ہوئی اشیا، مصوری کے نمونے، موسیقی کے آلات، صندل اور ہاتھی دانت کی صندوقچیاں، زمرد و جواہرات کے ڈبے، لکھنؤ کے مٹی کے کھلونے، بچوں کے کھلونے اور مثال اور مختلف انواع کے دیسی کپڑے اس عجائب گھر میں ہیں —

کلکتہ یونیورسٹی جس کا اثر پشاور اور کٹک تک ھے آج کل اچھی حالت میں ھے - بمبئی میں جو حال میں یونیورسٹی قائم ہوئی ھے اس کی حالت بھی قابل اطمینان ھے - اس یونیورسٹی کا آخری سندی امتحان گذشتہ ستمبر کے مہینہ میں ہوا تھا - امتحان میں ۱۵ طلبہ نے شرکت کی تھی جن میں سے ۷ کامیاب ہوے - اس امتحان کے نصاب میں Rev .M Mitchell کی اطلاع کے مطابق' باغ و بہار جس کا میں اپنے ہر خطبے میں عادتاً ذکر کرتا ہوں' اخلاق ھندی' جو Hitopades کا اردو ترجمہ ھے' میرحسن کی مشہور مثنوی سحرالبیان اور دیوان ناسخ شامل تھے - لطف‌الله سورتی جن کی " خود نوشت سوانح عمری " بڑی مقبول ہوئی کہتے ھیں کہ ناسخ اردو زبان کے بہترین شعرا میں سے ہوا ھے —

Haileybwy اور Addisoncombe کی درس گاہوں کے بند ہونے سے میری دانست میں ھندوستانی زبان کے شوق مطالعہ کو کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا - میں جس زمانہ میں اپنے درس پیرس میں شروع کرتا ہوں اسی زمانہ میں Woolwich کی فوجی اکاڈمی کے طلبہ بھی اپنا اردو کا درس شروع کرتے ھیں - اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجی مدرسہ کے طلبہ Woolwich کے مدرسہ میں داخل ہوتے ھیں - لیکن ان کی تعلیم اور دوسرے طلبہ سے مختلف ھے - چونکہ بعد میں ان کا ارادہ ھندوستان میں فوجی خدمات پر جانے کا ہوتا ھے اس لئے خاص طور پر ان کے لئے علحدہ استاد مقرر کئے جاتے ھیں جو انھیں اردو اور دوسری مشرقی زبانیں سکھاتے ھیں جن کی انھیں آئندہ زندگی میں ضرورت پڑے گی —

ایسٹ انڈیا ھاؤس کا کتب خانہ Board of Control (بورڈ آف کنٹرول) کی

عمارتوں میں منتقل ہو چکا ہے - اس کتب خانے میں مشرقی علوم و ادب پر چوبیس ہزار کتابیں موجود ہیں - ان میں ۸ ہزار قلمی نسخے ہیں - میرا خیال ہے کہ ان کتابوں میں اردو کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جس میں مطبوعہ اور قلمی نسخے دونوں شامل ہیں - ان قلمی نسخوں میں قرآن کا وہ مشہور قلمی نسخہ بھی ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے - یہ کوفی خط میں ہے - اس پر متعدد مشرقی بادشاہوں کے دستخط اور ان کی مہریں ثبت ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک بے بہا اور نادر چیز سمجھی جاتی ہے - قرآن کی چند سورتیں حضرت علی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس ذخیرۂ کتب میں ملتی ہیں - اس کے سرورق پر تیمور صاحبقراں کی مہر ثبت ہے اور شاہجہان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چند سطریں ہیں - ان چند سطروں میں یہ تحریر ہے کہ اس نے ڈیڑھ ہزار مہر میں اس نسخہ کو خریدا -

ایسٹ انڈیا ہاؤس کا عجائب گھر آج کل Fife House میں ہے جو Whitehall - Yard میں واقع ہے - اس میں جب داخل ہو جیے تو پہلے کمرہ میں ولنگٹن ' کلایو ' ھسیٹنگز اور ان انگریزوں کے مجسمے نصب نظر آتے ہیں جنھوں نے تاریخ ہند میں کار ہائے نمایاں کئے ہیں - یہاں ہر کمرے کی ایک خصوصیت ہے - ایک میں ہندوستان کی دھاتیں ہیں' ایک میں سونے چاندی کا کام ہے ' ایک میں ہوے جواھرات ہیں' ایک میں ریشمی کپڑے اور زیورات ' اور ایک میں آلات کشاورزی و جہاز رانی ہیں - ان سب میں سب سے زیادہ دلچسپی اور بصیرت وہاں حاصل ہوتی ہے جہاں ہندوستان کے مختلف نسلوں کے لوگوں کے مجسمے رکھے ہیں - انھیں دیکھ کر ہندوستانیوں کے رسم و رواج کی نسبت معلومات میں اضافہ ہوتا

ہے - اسی طرح ہندوستانی چڑیوں اور مختلف قسم کے جانوروں کی نہایت مجلسہ و احتیاط سے تقسیمیں کی گئی ہیں اور انہیں الگ الگ رکھا گیا ہے - مسٹر الیٹ کے پاس امراوتی کے سو سوہیں بتوں کے کچھہ ٹکڑے تھے وہ بھی یہاں موجود ہیں - یہ بت بدھ مت کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں —

میں سمجھتا ہوں اس جگہ موقع نہیں کہ میں اس عالیشان عمارت کے متعلق کچھہ کہوں جو وزیر ہند کے دفتر کے لئے بنائی گئی ہے - اس کا طرز تعمیر غیر گوتھکی اور خالص اطالوی ہے - آج کل ازمنۂ وسطیٰ کے طرز کو پروٹسٹنٹ ملکوں میں بھی پسند کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے —

پیرس میں بدستور ہندوستانی درسوں میں لوگ آتے ہیں - یہ سچ ہے کہ تعداد بہت زیادہ نہیں مگر جو آتے ہیں وہ عموماً اعلیٰ تعلیمیافتہ لوگ ہیں - میرے درسوں میں بیرونی ممالک کے مشہور لوگوں میں سے جو بھی کبھی تشریف لاکر مجھے سرفراز فرماتے ہیں ' میں مہیپترام روپرام کا خاص طور پر ذکر کرونگا - یہ برهمن ہیں اور ساتھہ ہی نہایت با مذاق آدمی ہیں - صوبہ بمبئی میں انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر ممتاز ہیں موصوف قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے دیسی تعصبات کی مطلق پروا نہیں کی اور انگلستان کے انتظام تعلیم کی تحقیق کے لئے اتنی دور آئے - ہندوستان جاتے ہوئے وہ پیرس میں کچھہ دن ٹھیرے تھے - میں نے سنا ہے کہ جب وہ احمد آباد واپس پہنچے تو تعلیمیافتہ ہندوستانیوں اور اس شہر کے اعلیٰ یوروپین طبقے نے ان کے خیر مقدم میں ایک جلسہ منعقد کیا - اس جلسہ میں سفر سے واپسی کی مبارک باد دی گئی ایک دیسی شاعر نے کہا کہ روپ رام کے سفر یوروپ نے یہ ثابت کردیا کہ ہندو لوگوں کو سفر کرنے میں جو تین بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا

یعنی اخراجات ، آب و ہوا کی سختی اور اپنے دھرم اور رسوم کی پابندی نہ کرسکنے کا ڈر ، یہ تینوں دشواریاں ایسی نہیں جن پر قابو پانا انسانی امکان سے باہر ہو —

حضرات ! اس خطبے کا خاتمہ میں اس مبارک باد پر کرتا ہوں کہ ہندوستانی واقعی خوش نصیب ہیں ملکہ نے ان کے لئے لارڈ کیننگ کا جانشین جن کا زمانہ حکومت آئندہ ماہ مارچ میں ختم ہورہا ہے ، لارڈ الجن کو وائسرائے منتخب کیا ہے - لارڈ الجن بڑے مشہور مدبر ہیں - موصوف نہایت ہر دل عزیز ہیں اور ہر کوئی ان کی عزت کرتا ہے - موصوف کینیڈا اور اور چین میں اپنی ذہانت اور اپنی بلند حوصلگی کا ثبوت دے چکے ہیں - ان کے والد فنون لطیفہ کے بڑے قدردان تھے اور انہوں نے برٹش میوزیم کو بعض نہایت قابل قدر تحفے عطا کئے - اگر موصوف نے انہیں سنبھال کر نہ رکھا ہوتا تو ممکن ہے ان میں سے بعض تباہ ہوجاتے - لارڈ الجن کی والدہ اپنے خلوص ، تقوے اور فیاضی میں مشہور ہیں - موصوفہ کی اعلی قابلیت اور علم دوستی کا بھی انگلستان بھر میں چرچا ہے - مجھے اس بات کا فخر ہے کہ موصوفہ میرے کرم فرماؤں میں سے تھیں اور اج تک ان کے الطاف کریمانہ میرے حافظے نے فراموش نہیں کئے - مجھے پوری توقع ہے کہ لارڈ الجن لارڈ بنٹنگ کی طرح ہندوستانیوں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کریں گے اور اپنے حسن انتظام اور عدل گستری سے ان کے دلوں کو تسخیر کر لیں گے - مجھے پوری توقع ہے کہ وہ اپنے زمانہ قیام میں ہندوستانی لوگوں اور حکومت برطانیہ کے درمیان نہایت خوش گوار تعلقات قایم کردیں گے جس کے سائہ عاطفت میں زندگی بسر کرنا ان کے لئے تقدیر الہی معلوم ہوتی ہے —

روسی ادب

پانچواں باب

روسی شاعری : پارناسی شاعر ، استعاریت اور انقلاب

اپولون نکو لائی یوچ مائی کوف (۱۸۲۱ تا ۱۸۹۷))

از

(جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب بی - اے آنرز (آکسن)

پارناسی شاعروں کی طرح مائی کوف قومی زندگی سے اس قدر بے تعلق رہا کہ اس کی اپنی زندگی میں کوئی خاص واقعات نہیں ہیں جو بیان کے لائق ہوں ، اور اس کے ذاتی معاملات معلوم بھی بہت کم ہیں اس کا ارادہ پہلے مصور بننے کا تھا لیکن شاعری کا ذوق اس ارادہ پر غالب آیا - اس نے چودہ سال کی عمر میں اپنی پہلی نظم شائع کی ، اور جس انداز سے اس کا ادبی دنیا میں استقبال کیا گیا وہ نوعمر شاعر کی ہمت افزائی کے لئے بہت کافی تھا - سنہ ۱۸۴۰ ع سے اس نے اپنی زندگی شعر و شاعری کے لئے وقف کردی —

مائی کوف کے کلام پر فرانسیسی شاعر اندر گئے شے نی ئے * اور

---

* فرانسیسی انقلاب کے زمانے کا ایک شاعر ، جس کی غزلیں اور مرثیے مشہور ہیں پہلی اور طرز بیان میں اس نے یونانیوں کی تقلید کی ہے (۱۷۶۲ - ۱۷۹۴) —

کلاسیکی یونانی شعرا کا گہرا اثر پایا جاتا ہے اور اس کے مضامین بھی عموما خالص روسی نہیں ہیں بلکہ یورپ کی تہذیبی اور مذہبی تاریخ سے لئے گئے ہیں - مگر آرٹ کی پرستش اسے اپنے ملک کے حالات سے بالکل بیگانہ نہ رکھہ سکی ' اور اس کے کلام کا رنگ قوم کے عام خیالات کے ساتھہ بدلتا رہا شروع میں وہ خالص " پارناسی " تھا جب سنہ ۱۸۵۵ کے بعد ملک میں آزادی کا شوقا ہوا تو اس کی نظموں میں اس کا عکس نظر آنے لگا اور پھر جب سنہ ۱۸۹۳ کے بعد لبرل تحریک کچھہ کمزور پڑ گئی تو وہ بھی اپنا داس جھاڑ کر آرٹ کے حرم میں رو پوش ہو گیا - اس آخری تغیر سے اس کی شہرت میں بہت فرق آگیا ' ورنہ اس زمانے میں بھی جب دوسرے " پارناسی " شاعر قوم کی بے توجہی دیکھہ کر بالکل خاموش ہو گئے تھے اس کا کلام شوق سے پڑھا جاتا تھا اب اس کے قدردان بہت کم ہیں —

" تین موتیں " اور " دو دنیا " جن میں مائی کوف نے یونانی اور عیسائی تہذیبوں کی جنگ دکھائی ہے ' اور یونانی تہذیب کو اس کے حریف سے بدرجہا بہتر ثابت کیا ہے مائی کوف کا شاہکار مانی جاتی ہیں - رومن کلیسا کی تاریخ پر بھی چند نظمیں ہیں جو روسی شاعری میں کچھہ حیثیت رکھنے کا دعوی کرسکتی ہیں - لیکن مائی کوف نے جب کبھی معاصر روسی زندگی کو اپنا موضوع بنایا تو اسے بہت ناکامیابی ہوئی - تاریخی نظموں کے علاوہ جو کچھہ ہوں وہ اس کی مختصر نظمیں ہیں - ان میں اس کے تصور کا زور اور اس کی طبیعت کی رنگینی کچھہ نظر آتی ہے اس کی زبان شیریں اور پر ترنم ہے اور اس کی فصاحت کا معیار بہت بلند ہے - ذیل کی نظم میں اس کے کلام کا خاص رنگ کسی قدر ظاہر ہو جائے گا —

ابابیل

میرا باغ روز مروز کمھلا رہا ہے
ویران ' ' اجڑا ہوا اور خالی خالی نظر آتا ہے
میرا دل غمگین ہے
خزاں کے سورج کی چمک
درختوں کی جھڑتی ہوئی پتیاں ' شام کے قدموں کی آواز
طبیعت میں الجھن پیدا کرتی ہے -
جب حسب عادت میری نظر چھت پر پڑتی ہے
تو کھڑکی کے اوپر ایک خالی گھونسلا دکھائی دیتا ہے
اس میں ابابیلوں کی سرگوشیاں نہیں سنائی دیتی ہیں
اس کی گھاس اور تنکے ہوا سے لٹک آئے ہیں...
مگر مجھے یاد ہے کہ اسے بنانے میں -
وہ ابابیلوں نے کیا کیا کوششیں صرف کیں '
تنکوں کو مٹی سے کس طرح جوڑ کر مضبوط کیا '
اِدھر اُدھر سے بال اور پر کیسے جمع کرکے لائیں -
اپنا کام وہ کس خوشی سے کرتی تھیں ' کس صفائی سے !
ان کے دل کیسے باغ باغ اتھے جب گھونسلے سے
پانچ ننھے چنچل بچوں نے
سر نکال کر ادھر ادھر دیکھا
تمام دن ان کی چوں چوں
جیسے ننھے بچوں کی بکواس
اور پھر ایک دن سب کی سب اڑگئیں !

اس دن سے پھر میں نے انہیں بہت کم دیکھا ‘
ان کا گھونسلا خالی پڑا ہے !
وہ اب کہیں اور اڑ گئی ہیں ‘
کہیں اور ‘ یہاں سے بہت دور ...
آہ ‘ کاش میرے بھی پر ہوتے !
افناسی ئی افناس یوچ فیت (۱۸۲۰ - ۱۸۷۲)

لس اصول کا کہ "آرٹ کی غرض آرٹ ہے" فیت سے زیادہ قائل پارناسیوں میں بھی کوی نہیں تھا ‘ اسے روس کے سیاسی اور اقتصادی مسائل سے بہت دلچسپی تھی اگرچہ وہ صرف قدامت پسند نہیں بلکہ جدتوں کا جانی دشمن تھا اور اس نے ان مسائل پر متعدد مضامین لکھے - لیکن اس نے اپنی شاعری میں آرٹ کی پرستش کے سوا اور کسی غرض کو شامل نہیں ہونے دیا - سنہ ۱۸۵۵ ع کے بعد نقادوں کی عداوت نے اس کے کلام کی اشاعت روک دی اورفیت نے اس زمانے کی نظموں کا مجموعہ ۱۸۸۵ م تک نہیں شایع کیا ‘ اس وقت ادب پر سے مبلغوں اور مصلحوں کا اثر جاتا رہا تھا —

فیت کے کلام کی خاص صفت اس کے احساسات کی نزاکت ہے اس میں تخیل کی کوئی خاص ندرت یا گہرائی نہیں ‘ صرف الفاظ اور ترنم کی پیدا کی ہوئی ایک کیفیت ہوتی ہے جو جذبات میں گدگدی سی پیدا کرتی ہے - مجموعی حیثیت سے فیت کے کلام میں یکرنگی محسوس ہوتی ہے ‘ اس لئے کہ نازک احساسات کے سوا اس نے انسانی جذبات کے کسی اور پہلو کو اپنی شاعرانہ توجہ کے لائق نہیں سمجھا ذیل کی نظم کا فیت کے مخالفوں نے بہت مذاق اڑایا تھا اس لئے کہ اس میں اول سے آخر تک کوئی فعل نہیں ہے —

زیر آواز - دبی سانسیں :
بلبل کے لہرے -
دریا کی چاندی جیسی چمک '
اس کی جھومتی چال -
رات کی دھیمی روشنی - دھندھلی تاریکی کا سمندر —
تاریکی کا بے پایاں سمندر -
ایک محبوب چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیتیں
مسحور کن ادائیں
دھوئیں جیسے بادلوں میں کہیں ارغوانی رنگ
کہیں کہربا کی جھلک '
پیار ' پیار اور آنسو —
اور آفتاب کا طلوع ! ...

اسی انداز کی ایک اور نظم ملاحظہ ہو

میں تجھے مبارکباد دینے آیا ہوں —
یہ کہنے کہ سورج نکل آیا ہے
اور اس کی گرم ' روشن کرنیں
پتیوں پر کانپ رہی ہیں ؛
یہ کہنے کہ جنگل جاگ اٹھا ہے
سارے کا سارا جاگ اٹھا ہے ' اس کی ہر شاخ
ہر چڑیا چونک پڑی ہے '
اور وہ بہار کی آرزوؤں سے بھرا ہے ...
یہ کہنے کہ کل کی سی امیدیں اور جوش لے کر

میں پھر تیرے پاس آیا ہوں
میرا دل اسی طرح مسرت کا '
اور تیری خدمت کرنے کا آرزو مند ھے
یہ کہنے کہ ھر طرف سے میرے پاس
شادمانی کا پیغام آرہا ھے '
یہ کہنے کہ میرا دل نغمہ سرائی پر تلا ھوا ھے
مگر معلوم نہیں میں گاؤں گا یا نہیں ...

یا کوت پتر ووچ پولون سکی (سنہ ۱۸۱۹ ع - سنہ ۱۸۹۸ ع)

فیت اور مائی کوف کے مقابلہ میں پولون سکی کے مضامین کا میدان بہت وسیع ھے اور وعام زندگی سے بہت زیادہ وابستہ ھے ' اس کے احساسات میں بھی اتنی نزاکت نہیں کہ وہ معمولی انسان کی عقل اور سمجھ کو عاجز کردیں - اس نے عوام کے طرز پر چند نظمیں لکھی ھیں جو ادبی نقطہ نظر سے قابل قدر تو نہیں ھیں مگر ان میں کچھ ایسی سادگی ھے اور ان کی زبان اتنی سہل کہ وہ ایک زمانہ میں بچے بچے کو یاد ھوا کرتی تھیں اس کے کلام میں ظرافت بھی پائی جاتی ھے اور ساتھ ھی ایک فسلفہ حیات جو بہت گہرا نہیں ھے مگر اوسط درج کے تعلیم یافتہ لوگ اس سے نہایت درجہ مرعوب ھوتے ھیں - پولون سکی روس کی سیاسی فرقہ بندیوں سے ھمیشہ الگ رھا اس لئے اسے نقادوں کی عداوت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس کے کلام کی اشاعت میں کوئی دشواری یا رکاوٹ نہیں ھوئی مگر اعلیٰ ادبی مذاق کے لوگوں میں اسے بہت کم قدرداں ملے ھیں - اُسے وھی لوگ پسند کرتے ھیں جن کی علمی بساط کم ھے ' اور جو شاعری کے ذریعہ سے اپنے جذبات اور خیالات

میں ذرا سا ہیجان یا ہلکا سا سرور پیدا کرنا چاہتے ہیں پولونسکی کی سب سے مشہور نظم " موسیقی کے شوقین تذے " کا قصہ ہے جو کسی بلبل کا گانا سن کر اس پر عاشق ہوگیا اور ملاقات کے شوق میں اُس کا دل تڑپنے لگا - بڑی تمناؤں کے بعد آخر کار اُسے دیدار کا شرف حاصل ہوا ' لیکن بلبل اُسے دیکھتے ہی کھا گیا - اس نظم کے علاوہ پولونسکی نے " پارناسی " طرز کے مطابق مختصر نظمیں بھی لکھی ہیں جن سے بعض ہر لحاظ سے بہت اچھی ہیں مگر یہ اعلیٰ نمونے اس کے کلام میں صرف کاہے کاہے نظر آتے ہیں۔ اس کی بہترین نظموں میں سے ایک کا ترجمہ دیا جاتا ہے --

گزرا ہوا زمانہ

مجھے یاد ہیں وہ بچپن کے دن ' جب ہمارے گالوں پر پھول کی سی سرخی تھی '
ہم تم بھر بھرے برف پر کھیلتے پھرتے تھے '
اور سردی ایک بوڑھی عورت کی طرح اپنے ہاتھوں سے '
ہمیں پیار کرتی اور پھر اپنی بیساکھی سے آگ کے پاس بھگا دیتی '
شام کے اندھیرے میں تمھاری آنکھیں چمکتی تھیں '
آتش دان کی چنگاری تمھاری صورت دیکھا کرتی تھی '
اور بوڑھی کھلائی ہمیں کہانیاں سناتی تھی '
ایک بے وقوف کی جو کسی زمانہ میں تھا '
لیکن وہ جاڑا بہار کی طرح مسکراتا ہوا چل دیا '
گرمیاں بھی گذر گئیں - اور اب خزاں کے طوفاں کا شور سن کر
ایک اور جاڑا آرہا ہے ' بالکل دوسری طرح کا '
ایک بے حس جاڑا ' اور وہ بھی اپنی بیساکھی سے ڈرا رہا ہے ...

ہماری کھلائی پیر پھیلائے سو رہی ہے '
قبر میں آرام کر رہی ہے ' اور یہ بھی نہیں دیکھتی
کہ تم تھک کر میرے سینے سے چھٹ گئی ہو '
گویا سن رہی ہو کہ میرا دل کیا کہتا ہے -
لیکن کھلائی کی طرح میرا دل بھی آج پیار سے
متاثر نہیں ہوتا ' وہ چنگاری بجھ گئی ہے
اور میرا دل تمہیں کہانیاں سنا رہا ہے
ایک ہے وقوف کی جو کسی زمانہ میں تھا -

سنہ ۱۸۵۵ ع سے سنہ ۱۸۶۳ ع کے سیاسی جوش کے رفتہ رفتہ ٹھنڈے ہونے کے ساتھہ ھی روسی شاعری کا معیار گرتا گیا ، اس میں نہ فن کی وہ خوبیاں رہیں نہ تخیل کی وہ بلند پروازیاں جو پشکن ' لیرمنتوت اور چیوچف کے کلام میں پائی جاتی ھیں - نکراسوت نے مضامین میں بہت جدت پیدا کی اور اگر اسے اچھے پیرو ملتے تو ممکن ھے روسی شاعری کا باغ پھر سرسبز اور شاداب ہو جاتا ' اور اس میں نئے نئے پھول کھلتے - لیکن افسوس ھے ایسا نہ ہوا ، اور جب تک کہ صدی کے آخری سالوں میں ' استعاریت ' نے نئے باغباں نہیں پیدا کئے روسی شاعری کا باغ ویران ہوتا گیا - سم یون یا کوت لے وچ فاد سون (۱۸۶۲ - سنہ ۱۸۸۷)' الک سے ئی نکولایے وچ اپوخ تن (سنہ ۱۸۴۱ ع - سنہ ۱۸۹۳ ع) کونس تان تن کونس تان تی نووچ سلوچیف سکی (سنہ ۱۸۴۴ ع - ۱۹۲۰ ع - اور ولا جیمر سرگے یوچ سولوت یوت (سنہ ۱۸۵۳ - سنہ ۱۹۰۰ ع) کی شاعری میں اس دور کے تمام ذہنی اور فنی نقائص

نظر آتے ہیں - ناسون نے بہت شہرت حاصل کی ، اور غالباً اس کے کلام
سے زیادہ اشاعت اور ہر دلعزیزی اس دور کے کسی شاعر کو نصیب نہیں
ہوئی ' لیکن نقاد اس کی مقبولیت کو محض عام مذاق کی پستی کی
ایک علامت مانتے ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ناسون کی
شاعری میں لفاظی کے سوا کچھہ نہیں ' اور اس کے خیالات بھی جو
کچھہ ہیں وہ ذہن اور تصور کی بیماری کی دلیل ہیں - اپوخ تن کے
کلام میں پھر بھی زیادہ جان ہے ' لیکن اس میں ایک دوسرے طریقے
پر ظاہر ہوتا ہے کہ روسی قوم میں انحطاط کی کیفیت تھی - اپوخ تن
کی نظمیں روس کے جپسی گوئیوں کی زبانی بہت سننے میں آتی ہیں
اور ان جپسی گوئیوں کا کام عموماً میخانوں میں لوگوں کو مست کرنا
اور عیاشی میں چٹپٹا پن پیدا کرنا تھا - سلوچیف سکی اور سونوت یوت
پر اس قسم کا کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا ' لیکن ان دونوں میں
فنی خامیاں بہت ہیں اور تخیل کی کوئی خاص خوبی نہیں پائی جاتی -
ان چاروں شاعروں کی یادگار بس اسی وجہ سے قائم ہے کہ ان کے دور
میں ان سے بہتر کوئی اور شاعر نہیں تھا ' یہ ,, کلاسیکی " اور
" استعاری " دوروں کی درمیانی کڑی ہیں —

استعاریت اس عام ذہنی ہیجان کا ایک پہلو اور اس کی ایک
پیداوار تھی جو انیسویں صدی کے آخر میں نظر آتا ہے اور جس کی سب
سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مہذب اور منظم ہونے کے باوجود روسی قوم اپنی
سیاسی اور سماجی زندگی میں جان نہیں پھونک سکی تھی - ہر طرف
خالی ساز خیالات کا غوغا تھا ' ہر روشن خیال آدمی اپنا فلسفہ حیات بناتا قومی

اصلاح اور نئی زندگی کی تعمیر کی تدبیریں سوچتا کلیسا' مذہب' حضرت عیسیٰ کی شخصیت' ریاست پرستی' زار پرستی' قوم پرستی' یورپ پرستی ان سب کے معتقد اور مبلغ تھے' مگر سب یکساں ناکامیاب رہے اور وہم و گمان کے جال میں گرفتار ہو گئے - نکراسوت کے بعد سے سنہ ۱۹۰۵ ع کے انقلاب تک شاعری کا عام سیاسی اور سماجی زندگی سے بس اتنا تعلق تھا کہ بعض ناسون جیسے شاعروں نے قومی خدمت کی امنگوں کو نظم کا جامہ پہنایا' لیکن یہ زمانہ ایسے انحطاط کا تھا کہ ان شاعروں کے کلام میں نہ سلامت دوستی کے اعلیٰ جذبے نظر آتے ہیں' نہ قومیت کے بلند و لولے - استعاریت کی تحریک روسی شاعری کو نئے اسالیب کے ذریعہ سے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش تھی اس کا سلسلہ نسب فرانسیسی شاعری کی ہم نام تحریک سے ملتا ہے' لیکن روسی استعاریت پسند شاعروں نے اپنے استادوں کی زیادہ پیروی نہیں کی' اور دراصل ان سے سیکھا بھی بہت کم - امریکن شاعر ایڈ گرا یلن پو (۱۸۴۹ ع - ۱۸۰۹ ع) اورجرمن فلسفی اور شاعر گوئٹے کا اُن پر فرانسیسی استعاریت پسند شاعروں سے بہت زیادہ اثر تھا —

فرانسیسی شاعر بودیلیر (۱۸۲۱ - ۱۸۶۷) کا ایک مصرعہ جس میں کائنات "استعاروں کا ایک جنگل" بتائی گئی ہے اور جرمن شاعر گوئٹے کا ایک شعر کہ "سب فانی چیزیں محض مجازی نقوش ہیں" استعاریت کے فلسفے کی بنیاد ہیں استعارے اور مجازی نقوش جس حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں اس کی جستجو اور اس کے دیدار کا اشتیاق روسی استعاریت پسند شاعروں کا محرک' ان کا "جنون" اور "سودا" تھا - انہوں نے اپنے فرانسیسی استادوں کی طرح اسے صرف ایک شاعرانہ انداز' اور نظم میں جدت اور انوکھاپن پیدا کرنے کا ایک بہانہ نہیں بنایا بلکہ اسے ایک

مکمل فلسفہ حیات کی صورت دیدی اور اس سے وہ روحانی غذا حاصل کرنے لگے جو ان کا مذہب اور کلیسا فراہم کرنے سے معذور تھا یوں گو استعاریت شروع میں ایک مغربی چیز تھی اور مغربی رنگ میں تربیت ہوئی روس میں اس نے بہت جلد روسی بھیس اختیار کرلیا ' اپنا نسب بھول گئی اور روس کے گذشتہ ذہنی رہبروں ' خصوصاً دستہ ئف سکی سے بہت گہرا رشتہ قائم کر لیا - اس رشتے کے قائم ہونے سے روسی ادب کو سراسر فائدہ ہوا ' انحطاط کے زمانہ میں روسی ادبی مشاہیر کی طرف سے جو غفلت برتی جاتی تھی اس کے بجائے انھیں سمجھنے کا ایک نیا شوق پیدا ہو گیا ' ان کے فلسفہ پر غور کرنے کی ضرورت ہونے لگی ' اور جیسے کوئی گہری نیند سے چونک کر سونے سے پہلے کے واقعات یاد کرتا ہے اور انھیں اپنی زندگی کا ایک ضروری حصہ سمجھنے لگتا ہے ' انحطاط کے بعد استعاریت پسندی کے ذریعہ سے روسی ذہن نے بیدار ہوکر اپنی ذہنی جدوجہد کے ٹوٹے ہوئے سلسلہ کو پھر جوڑ دیا ' اپنی ذہنی دولت کو یوں بہت بڑھا دیا - اس کی سب سے روشن دلیل یہ ہے کہ روس کے استعاریت پسند شاعر آزاد خیال ' بلند حوصلہ ' اپنے دیس اور اپنی قوم کے سچے اور گہرے دوست اور خیرخواہ تھے - سیاسی تحریکوں میں ان میں سے کوئی شریک نہیں ہوا ' لیکن ۱۹۰۵ کے انقلاب میں انھوں نے دکھا دیا کہ وہ جابرانہ حکومت کے دشمن اور ہر تحریک کے حامی ہیں جس کا مقصد روس کی آزادی اور بہبودی ہو —

استعاریت پسند شاعروں کے کلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جمالیات پر تصوف اور فلسفے کا رنگ چڑھانا چاہا ' اور اپنے جذبات کو نفسانیت اور مجاز پرستی سے بڑی حد تک پاک رکھا - عشق کو وہ ایک خالص روحانی

کیفیت کی صورت میں پیش کرتے ہیں' جس کی پاکی اور صفائی پر انسان کے سرکش' نفس پرست جذبات دھبے لگاتے رہتے ہیں' حسن ان کی نظروں میں ایک جلوہ ہے جس کے دیدار سے انسان محروم رہتا ہے' کیونکہ وہ ہوس اور شہوت کا بندہ ہے - لیکن یہ شاعر مذہبیت کے یا تو قائل نہیں یا اس سے نا آشنا ہیں' اور ان کی روحانیت کو تصوف کا ہم معنی نہ سمجھنا چاہئے کائنات' دنیا اور دنیاوی زندگی استعارے ہیں' حقیقت نہیں' "استعاروں کے جنگل میں" بھٹکتے پھرنا انسان کے شایاں شان نہیں' بس اسی کو جتا کر استعاریت کا فلسفہ ختم ہو جاتا ہے - باقی جو کچھہ ہے وہ انسان کی گمراہی پر افسوس' تمناؤں کی بیکسی کا گلہ ہے اور سرد آہیں اور آنسو - ناڈسون اور اپوخ تن کے بعد شعر و شاعری کا ایسا موضوع اختیار کرنا بہت قابل قدر جدت تھی' اور اس کے ساتھہ ہی استعاریت پسند شاعروں نے اپنے کلام کو فنی حیثیت سے بھی اس درجۂ کمال تک پہنچایا جو پشکن کے عہد کے سوا روسی شاعری کو کبھی نہیں نصیب ہوا تھا - یہ خاص طور سے تعریف کی بات ہے' کیونکہ ان شاعروں نے نئے مضامین نئے طرز پر ادا کئے' اور ایسے ادبی انقلابوں کے ہراولوں میں عموماً فنی خامیاں اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ اہل ذوق کو ان کی جدتیں تسلیم کرنے میں بہت تامل ہوتا ہے —

استعاریت پسند شاعروں کی تیسری خصوصیت ان کی زبان اور الفاظ کا انوکھا استعمال ہے - وہ زبان کو محض خیالات ادا کرنے کا آلہ نہیں سمجھتے' بلکہ کیفیات اور فضا پیدا کرنے کا ذریعہ بھی' اور یوں وہ الفاظ کے معنی سے زیادہ ان کی آواز کی تاثیر کو توجہ کے لائق فرض کرتے' بحر اور قافیہ اور الفاظ کے ارکان کی اونچ نیچ سے وہی کام نکالنا چاہتے ہیں جو

گوئیے سروں سے جو زبان اور الفاظ بھی ان کے نزدیک استعارے ھیں جن کے توسط سے جذبات کی حقیقت ظاھر ھوتی ھے ' اور چونکہ جذبات کا تعلق صرف انسان کے ذھن سے نہیں بلکہ اس کی ھستی سے ھے ' اس لئے وہ جذبات کے ادا کرنے میں شاعر کے لئے ایسا طرز اختیار کرنا لازم قرار دیتے ھیں جس میں تصویروں کے رنگ ھوں اور موسیقی کے سر اور ناچ کے بھاؤ - ظاھر ھے یہ معیار کس قدر بلند اور مشکل ھے اور کوئی تعجب نہیں استعاریت پسند شاعروں کے کلام کا اکثر حصہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا ' کبھی آواز کی تاثیر پیدا کرنے کی کوشش میں معنی خبط ھو جاتے ھیں ' کبھی کیفیت اور فضا کے چکر میں شاعر اپنے مطلب اور مقصد بھول جاتا ھے - پڑھنے والے کو بھی اپنا فرض ادا کرنے میں بہت دشواریاں ھوتی ھیں ' اور اگر استعاریت کے قدردانوں میں ھلکے سرور اور ذرا ذرا سی گدگدی کا خاص شوق نہ ھوتا ' اگر وہ نظم میں معنی اور مطلب اور فلسفے کی جگہ آوازوں کی خوش گوار گونج اور اس کیفیت کے جو موسیقی کے سروں سے چھا جاتی ھے خواھش مند نہ ھوتے ' تو ممکن ھے استعاریت ھر دلعزیزی اور شہرت سے محروم رھتی - لیکن استعاریت پسند شاعروں کے ھنر ان کے عیبوں کو نظر سے چھپا دیتے ھیں - ان کے کلام کے اعلیٰ نمونوں سے ظاھر ھوتا ھے کہ ان کا تخیل صرف بلند اور پاک نہیں ' وہ اپنی زبان کے سب جوھر پہچانتے ھیں ' اس کے ھر رنگ سے واقف ھیں ' اور اس پر اتنی قدرت رکھتے ھیں کہ نازک سے نازک احساس اور نادر سے نادر کیفیت انتہائی سہولیت اور صفائی سے بیان کرسکیں ' الفاظ کی جانچ پرتال اور انتخاب میں وہ ویسے ھی ماھر ھیں جیسے مئے فروش شرابوں کا مزہ پہچاننے ' یا جوھری نگینوں کے

پر کھنے ' یا سچا گویا اپنے راگ کو اور گیت کو خارجی فضا سے موزوں کرنے میں ' اپنے علم و ھنر کا کمال دکھانا بھی خوب آتا ھے —

استعاریت کا بھش خیمہ دلاجیمر سولوفیوف اور دمیتری مرژ کوف سکی کا کلام تھا ' لیکن اپنی اصل صورت میں وہ اس مجموعے میں نظر آئی جو سنہ ۱۸۹۴ ع میں بال مونت (پیدایش سنہ ۱۸۶۷ ع) اور بر یوسوف (سنہ ۱۹۲۴ - سنہ ۱۸۷۳ ع) نے " روسی استعاریت پسند " کے عنوان سے شائع کیا - اُسی کے ساتھ ھی بال مونت نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ بھی ناظرین کے سامنے پیش کیا - روسی نقاد ان جدتوں کو تسلیم کرنے پر نہیں تیار تھے جو ان نظموں میں اختیار کی گئی تھیں ' اور استعاریت پسندوں پر اعتراضوں اور تضحیک کی بوچھار ھونے لگی - مگر وہ ھمت نہیں ھارے اور بیسویں صدی کے شروع تک وہ روسی مذاق پر حاوی ھوچکے تھے سنہ ۱۹۰۵ ع کے انقلاب نے انھیں ھر طبقے میں ھر دلعزیز بنا دیا اور اس کے بعد سے دس سال تک میدان سخن میں انھیں کا راج رھا ان میں سے اکثر کو سنہ ۱۹۱۷ ع کے انقلاب کا منظر دیکھنا بھی نصیب ھوا ' اور جس صدق دل اور خلوص اور جوش سے انھوں نے اُس نئی زندگی کا استقبال کیا جس کی امید انھیں انقلاب کے بھونچال اور زلزلے دلا رھے تھے ' وہ ان کی بیدار دلی ' قوم پرستی اور قوم کے مستقبل میں شاعرانہ عقیدے کو بہت سبق آموز بنا دیتی ھے ' اور ان کے کلام کی وقعت ھماری نظروں میں اور بھی بڑھا دیتی ھے —

بال مونت اور بر یوسوف کے کلام پر مغربی ' یعنی فرانسیسی اور انگریزی اثرات غالب ھیں ' اور ان کی زبان میں نہ وہ فصاحت ھے اور نہ وہ ترنم جو استعاریت پسند شاعروں کا معمول تھا - بال مونت فطرتاً شاعر تھا ' مگر اس نے

زبان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی' بریوسوف نے محنت اور مشق سے زبان میں پختگی اور لوچ پیدا کر لیا لیکن اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ذہن اور تخیل ایک سچے اور اعلیٰ شاعر کا نہیں تھا۔
بال مونت کے عروج کا زمانہ انیسویں صدی کے آخری سال تھے' اور گو اس کے بعد بھی وہ ہر سال اپنی نظموں کے مجموعہ شایع کرتا رہا ہے' اس کا بعد کا کلام بالکل بے رس ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ ع میں اس نے بولشوک انقلاب کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور فرانس میں جا بسا۔ بریوسوف کو شہرت سنہ ۱۹۰۵ کے انقلاب میں حاصل ہوئی' جب اس نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ جس کا عنوان "ستے فانوس" تھا شائع کیا۔ اسے سیاسی معاملات سے کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی' صرف اس کا شاعرانہ خیال تھا کہ

"مرکز حسن ہے مشرقی بادشاہ اسارھدؤن کی قوت اور شان کا جلوہ رعب دار ہے وہ منظر جب ایک بپھری قوم کا غصہ بادشاہ کے لڑکھڑاتے تخت پر طوفانی موجوں کی طرح تھپیڑیں مارتا ہے' مگر قابل نفرت ہیں درمیانی کیفیتیں۔"

طوفان کے شوق نے بریوسوف کو سنہ ۱۹۱۷ ع کے انقلاب کا بھی ہمدرد بنادیا۔ لیکن اس کے کلام سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ اسے روس یا اشتمالیت سے واقعی کوئی روحانی تعلق تھا۔ آخر عمر میں اس کی سب سے قابل قدر خدمت تھی "مزدور" شاعروں کو اپنے فن میں تعلیم دینا۔ جس کا وہ شعر کہنے سے زیادہ اہل تھا۔

بال مونت کی ایک نظم جس کا موضوع ڈاکٹر اقبال کی "تنہائی" سے بہت ملتا جلتا ہے ترجمہ کی جاتی ہے:

"میں نے آزاد ہوا سے پوچھا

کہ جوانی کا راز کیا ہے ؟
ہوا نے کھیلتے کھیلتے جواب دیا :
.. تیرہ صورت سے نجات حاصل کرنا ' جیسے ہوا اور دھواں ! "
میں نے صاحب حشمت سمندر سے پوچھا
کہ زندگی کا سب سے اعلیٰ مقصد کیا ہے ؟
سمندر نے اپنے راگوں میں جواب دیا :
" ہمیشہ میری طرح محو فریاد رہنا ! "
میں نے آسمان کے بادشاہ ' آفتاب سے پوچھا
کہ وہ چمک کیسے حاصل ہوگی جو صبح کو شرمندہ کرے ؟
آفتاب نے کوئی جواب نہیں دیا '
مگر میرے دل میں کہیں سے آواز آئی : " جلنے سے ! "

بال مونت اور بریوسوف ہراول تھے ' جو استعاریت پسند شاعری کے بعد میدان میں آئے انہوں نے استعاری شاعری سے بڑی حد تک وہ فنی خامیاں دور کردیں جوان دونوں کے کلام میں پائی جاتی ہیں' استعاریت کو مغرب کی رہنمائی سے بے نیاز کرکے اسے ایک خالص روسی ذہنی تحریک بنا دیا ' الفاظ اور طرز بیان خود ایک معیار ہونے کے بجائے شاعر کے فلسفۂ حیات اور نظم کے موضوع کے ماتحت کردئے گئے ؛ گو ان کی استعاری اہمیت صرف قائم نہیں رہی بلکہ اور بڑھ گئی ۔ ۱۵۱ں کونسٹ سکوئی (سنہ ۱۸۷۷ ع - سنہ ۱۹۰۱ ع) ایک بہت ہونہار شاعر جو عین جوانی میں ڈوب کر مرگیا ، الک ساندر میخا ئلووچ دؤبرو لیوبوف ' (پیدائش سنہ ۱۸۷۶ ع) ایک بہت ہی سنکی اور مراقی آدمی جو لاپتہ پھرا کرتا ہے اور اب معلوم نہیں زندہ ہے یا نہیں اور ہے تو

کہاں ہے ' سرژ کوت سکی کی بیوی ' زنئیدا نکو لا ئفنا ہپی ؤس (پیدائش سنه ۱۸۶۷ ع) یہ تینوں استعاریت پسندوں میں فلسفیانہ طرز کے شاعر مانے جاتے ہیں اور ان کے کلام میں کائنات اور انسانی زندگی کے معمے حل کرنے کی ایک بہت گرم آرزو پائی جاتی ہے - اِنو کنتی فیوتوروروچ آنن سکی (سنه ۱۸۵۶ ع سنه ۱۹۰۹ ع) کے کلام میں استعاریت کا انداز خالص شاعرانہ ہے ' لیکن پس منظر میں وہی مسائل ہیں جن پر فلسفیانہ رجحان کے استعاریت پسند محو رہتے ہیں - فاول فویس فیوتوروو لوگب (پیدائش سنه ۱۸۶۳ ع) نے اپنا ایک جمالیات اور اخلاق کا انوکھا فلسفہ اُبھارا ہے ' لیکن ذیل کی نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فلسفہ میں بھی وہ گہرے خیالات رکھتا ہے اور انہیں ادا بھی خوب کرتا ہے :

اس سے محبت کیوں کر ' دنیا تری محبت کی
سزاوار نہیں -
اس کے اوپر سے گذرجا ' شہاب ثاقب کی طرح
تیزی سے —
اس کی سرد فضا میں ایک لمحہ کے لئے
چمک اُٹھ ' —
ایک دم بھر ایمان و عقیدت کی مشعل بن '
اور گل ہوجا - —

ویاچلات اِوانوت (پیدائش سنه ۱۸۶۶ ع) اور الک سانڈرباوک (۱۸۸۰ ع ۱۹۲۱ ع) استعاریت پسند شاعروں کے سر تاج مانے جاتے ہیں اور انہیں کے کلام میں استعاریت اپنی پوری شان میں نظر آتی ہے - اوانوت پیٹر برگ کے حلقے بلوک ماسکو کے گروہ کا سردار تھا ' اور دونوں اپنے طرز میں یکتا ہیں —

اوانوت نے سنه ۱۹۰۳ ع میں اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع

لیا - گو اس کا کلام استعاریت پسندوں کے عام طرز سے بہت مختلف تھا ' لیکن ان لوگوں نے اس کی شاعری کی عظمت اور اس میں استعاریت کا خاص رنگ محسوس کیا ' اور اوانوف کو اپنے حلقے میں شامل کرلیا ' اوانوف کی شخصیت ایسی قوی تھی ' اس کے علم کا سرمایا ایسا زبردست کہ وہ بہت جلد سب پر حاوی ہوگیا ' اور سنہ ۱۹۰۵ع سے سنہ ۱۹۱۱ع تک پیٹربرگ کے شاعروں کا بے تاج کا بادشاہ رہا - اس کا مکان شاعروں کا مرجع تھا ' اور ہر بدھ کی رات کو وہاں مجلسیں ہوا کرتی تھیں جن میں لوگ دوسرے دن صبح تک نظمیں سنتے اور سناتے ' یا مذہب اور تصوف کے مسائل پر بحث مباحثہ کیا کرتے تھے - سنہ ۱۹۱۲ع میں کسی وجہ سے ان دوستوں میں جو یہاں جمع ہوا کرتے تھے ' پھوٹ پڑگئی ' اوانوف روس چھوڑ کر یورپ چلا گیا ' اور جب واپس ہوا تو پیٹر برگ کے بجائے ماسکو میں سکونت اختیار کی - بولشویک انقلاب کے وقت اس نے وہ جوش نہیں دکھایا جو سنہ ۱۹۰۵ع کے انقلاب میں ' مگر پھر بھی وہ بولشویکوں کا حامی تھا اور اس نے خانہ جنگی کے زمانہ کی (سنہ ۱۹۱۸ع تا سنہ ۱۹۲۱ع) ساری مصیبتیں خاموشی سے برداشت کیں - سنہ ۱۹۲۱ع میں وہ آزربائجان کے نئے قائم کردہ دارالعلوم میں قدیم یونانی زبان اور ادب کا پروفیسر مقرر ہوا اور وہاں تین سال کام کیا ' ماسکو واپس ہونے پر بھی اس کے تعلقات بولشویک حکام سے بہت اچھے رہے —

اوانوف نے " دل سوزاں " کے عنوان سے اپنی نظموں کا دوسرا مجموعہ سنہ ۱۹۱۱ع میں شائع کیا اور یہ اس کے کلام کا عروج تھا - " جاڑے کے گیت " جو اس نے سنہ ۱۹۲۰ع میں شائع کئے ' صرف اس کے ادبی ذوق کی شدت نہیں دکھاتے ' بلکہ اس کے کلام کا ایک دوسرا رنگ بھی '

جو چند لحاظ سے "دل سوزاں" کے جواہر ریزوں سے بھی بہتر ہے -
اسی سال کا ایک اور کارنامہ "گوشوں کے درمیان خط و کتابت" ہے جس
میں اوانوت اور اس کے دوست گرشن زون کی اس زمانہ کی گفتگو ہے -
جب دونوں ہسپتال میں بیمار پڑے تھے ' یہ کمرے کے ایک گوشے میں ' وہ
دوسرے میں گرشن زون کی آرزو ہے کہ دنیا سے گذشتہ زندگی کے تمام آثار
مٹ جائیں ' اور ایک نیا انسان "ننگا" آزاد ' زندگی کی تعمیر نئے سرے
سے شروع کرے - اوانوت انسان کی حاصل کردہ تہذیبی اور اخلاقی دولت کو
محفوظ رکھنے کا قائل ہے ' اور انسان کی گذشتہ ذہنی جد و جہد کی بہت
محبت ' عقیدت اور جوش سے حمایت کرتا ہے ایسی صورت میں جب دن کو
بھوک ستاتی ہو اور رات کو جاڑا ' نظمیں لکھنا اور تمدن اور تہذیب کے گن
گانا انتہائی شوق اور محویت کی دلیل ہے ' اور اوانوت کے لئے یہ اسی وجہ سے
ممکن ہوا کہ وہ ساری عمر علم اور ادب میں ڈوبا رہے - اسے قدیم یونانی
ادب سے بہت گہرا روحانی تعلق تھا ' اور اس نے جدید روسی ذہنیت پر
قدیم یونانی فلسفے اور احساسات کی قلم جس صفائی اور کامیابی سے
لگائی وہ واقعی حیرت انگیز ہے -- اپنی نظموں میں اس نے اکثر یونانی
محاورے استعمال کرکے ایک عجیب شوکت پیدا کردی ' اپنی مذہبیت کے
مایوس چہرے میں قدیم یونانی رند مشربی کے پریشان بال اس طرح
کھپانے کہ ایک ہی صورت معلوم ہوتی ہے ' اور وہ بھی حسن اور ادا کا
کرشمہ - اس کی نظمیں بہت مشکل ہیں ' اس کے خیالات کی باریکیاں
پورے طور سے سمجھنے کے لئے یونانی اور روسی ادب اور مذہب اور
فلسفۂ حیات سے گہری واقفیت درکار ہے ' لیکن جو یہ استعداد نہیں رکھتے
وہ اس کی زبان کے ترنم اور شیرینی کی لذت اٹھا سکتے ہیں ' اور اس کی

ان کیفیتوں سے جن میں عامی اور تہذیبی نکتہ سنجی نہیں ؟ اور جو
دراصل اس کے کلام کا بہترین حصہ ہیں ' اس شراب کا مزہ چکھ
سکتے ہیں جس کے نشے میں شاعر خود چور رہتا تھا - اوانوت کا کلام
کچھ اس وجہ سے بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں معاصر روسی
ذہنیت کا تقاضا کہ ہر شاعر اور ادیب کا اپنا فلسفہ بھی ہونا چاہئے
پورا کیا گیا ہے ' اور چونکہ شاعر کی طبیعت وہ پابندیاں نہیں
منظور کرسکتی جو کسی خاص نظام فلسفہ یا مذہبی عقیدے کے مبلغوں
پر لازم ہے ' اس لئے کوشش سے ان کے کلام میں خواہ مخواہ الجھاؤ
اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے —

اوانوت نے سنہ ۱۹۰۵ ع کے انقلاب میں دستہ ئف سکی کے مشہور
کیرکٹر اوان کرمازوت کے طرز پر انکار اور بغاوت کا فلسفہ اختیار کیا
اور اس کی تعلیم دی کہ انسان کو تمام خارجی پابندیوں اور رکاوٹوں
سے آزاد کرنا چاہئے - اس تخیل کا نام اس نے ,, صوفیانہ نراج " رکھا
تھا ؟ انقلاب کی تحریک دب جانے کے بعد ,, صوفیانہ نراج " سے اوانوت
کو زیادہ عقیدت نہیں رہی ' اور پیٹر برگ کے استعاریت پسندوں کی
رہبری کے زمانے میں اس نے ایک نیا فلسفہ اس بنا پر تعمیر کیا کہ
آرٹ بھی ایک قسم کا مذہب اور تصوف ہے ' اور اس کا معیار مذہبی
اور صوفیانہ ہونا چاہئے - لیکن اس حالت میں جب کہ مذہب اور
تصوف خود تعریف اور تعین کے محتاج ہوں اس قسم کے عقیدے بالکل
بے معنی ہیں اور یہ نہ اوانوت کے ذہن میں کوئی مستقل صورت اختیار
کرسکے نہ اس کے چیلوں کے ذہن میں - اوانوت کے کلام میں جو شخصیت
ظاہر ہوتی ہے وہ آزاد ہے ' نکتہ چین ہے ' کبھی کبھی ہاکی بھی

ہوجاتی ہے ، اپنے احساسات اس متانت اور شوکت سے ادا کرتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اسے مذہب اور تصوف کی سرپرستی بالکل درکار نہیں ، اور اس کے نغموں میں ایک سرور ہے جس کی تاثیر میں عقیدے کی موافقت اور مخالفت سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا —

اوانرت کی نظموں کا ترجمہ کرنا دراصل ان کی توہین کرنا ہے کیونکہ زبان کا ترنم اور الفاظ کے انتخاب کی باریکیاں جو اس کی نظموں کا خاص زیور ہیں ترجمے میں کسی طرح ظاہر نہیں ہوسکتیں ، اور اس کے خیالات اگر ان خاص الفاظ سے کر دئے جائیں جن سے آراستہ کرکے اوانوت نے انہیں پیش کیا ہے تو ان کی صورت بہت بگڑ جاتی ہے - تاہم ایک دو نظموں کا ترجمہ دیا جاتا ہے —

یونانی عشق کے دیوتا ایروس کی شان میں ایک گیت ہے جس کے آخر میں شاعر کہتا ہے —

تیرے تیر کا زخم کھاتے ہی
میں تیری تیر اندازی کا محرم راز بن گیا -
تیرا شاگرد بننے سے معلوم ہوا
کہ جدائی ایک بیش بہا دولت ہے -
موت عشق کی ضمانت ہے ،
موت عشق کا ہم زاد ہے ،
اُس روح کے لئے جو دنیا میں پھنسی ہو ،
موت اور عشق ایک ہی انجام کے
دو نام ہیں ، پکارنے کے دو طریقے -

جاڑے کے گیتوں کی ایک شکایت سنئے -

میرے ویران راستوں کے غیبی رہبر !
تو مدتوں سے میری آزمائش کر رہا ہے
اعراف کے ان گہرے قعروں میں ' جہاں داخل ہونے کو
ہم اس دنیا میں پیدائش کہتے ہیں -
میری عزت چھن گئی ' اور مجھے ملا کیا :
اوروں کے ساتھ ایک کال کوٹھری میں بند رہنا '
جب تک کہ میں ان چیزوں سے جو میرے دل کو نہیں بھاتیں
راضی نہ ہوجاؤں ' ایک بوسہ دے کر دل کا غبار دور نہ کردوں -
میں نے سنگ دل ' بے لطف جاڑوں کی صحبت سے گریز کیا '
اور عیاشوں کی طرح ان دیسوں میں جا کر جہاں جاڑے کی پہونچ نہیں
مناظر فطرت کو محبوب بنایا اور رنگ رلیاں مناتا رہا
لیکن میرے آقا اور استاد نے خفا ہوکر حکم دے دیا
کہ تاریکی کے بادل میری دنیا ہوں ' برف کے ڈھیر میری قبر
اور برف کے طوفان میری نجات کے لئے گیت گائیں ' دعائیں مانگیں -

استعاریت کے خاص طرز اور روسی کلاسیکی ' رومانی اور حقیقت نگار شاعری کے اسالیب کی بہترین آمیزش الکسانڈر بلوک کے کلام میں پائی جاتی ہے - شروع میں اس پر سولوڈیوف کے فلسفے اور زنئی داہپی نس کے طرز کا اثر تھا ' اور اس کے پہلے مجموعۂ کلام (سنہ ۱۹۰۴ ع) میں یہ ظاہر بھی ہوتا ہے - یہ نظمیں ایک " خوبصورت خاتون " کی شان میں تھیں ' اور یہ معلوم کرنا دشوار نہیں کہ یہ " خوبصورت خاتون " کوئی انسان نہیں ہے بلکہ عقل کامل کا وہ مجسمہ جسے بعض یونانی فلسفی " صوفیا " کہتے تھے اور جس کا ذکر سولوفیوف کی نظموں میں آتا ہے - لیکن " خوبصورت خاتون "

کی ذات و صفات اور نظم کی ساخت اگرچہ بلوک کی اپنی ایجاد نہیں ' پھر بھی اس پر سرقے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا اور اس کی ان نظموں میں بہت سی خوبیاں ہیں جو اس کی اپنی طبیعت کی پیدا کی ہوئی ہیں - اس مجموعہ نے شاعری کے عام قدردانوں میں تو بلوک کو مشہور نہیں کیا' کیونکہ اس کے کلام کا استعارات کے خاص تخیل سے بہت تعلق تھا اور جو بلوک کے خیالات سے واقف نہ تھے انہیں ان نظموں کے سریلے الفاظ سوا اور کسی چیز سے لطف نہیں حاصل ہوسکتا تھا - لیکن خود شاعروں کے حلقوں میں بلوک اور اس کا کلام ہاتھوں ہاتھ لیا گیا - سنہ ۱۹۰۵ کے انقلاب میں بلوک کا خون بھی ابل اٹھا ' وہ نظموں میں " صوفیانہ نراج " کی تعلیم دینے لگا ' اور ایک موقع پر اس نے سرخ جھنڈا لےکر سڑکوں کا گشت بھی لگایا یہ جوش چند روزہ تھا - انقلابیوں کی ناکامی نے بلوک کو بہت مایوس کردیا ' اور وہ صرف " صوفیانہ نراج " کے عقیدے نہیں بھول گیا بلکہ اپنی " خوبصورت خاتون کو بھی ' اور سنہ ۱۹۰۶ میں اس کے کلام کا جو مجموعہ شائع ہوا اس میں ان دونوں کا پتہ نہیں ملتا - بلوک نے فلک پیمائی کے حوصلے چھوڑکر دنیا کی طرف رخ کیا ' شاعرانہ طبیعت کے نازک احساسات ترک کرکے دنیا اور زندگی کی حالتوں اور کیفیتوں کو اپنا موضوع بنایا - " خوبصورت خاتون " کی بجاے اب ایک " اجنبی عورت " کا تصور اس کے ذہن پر حاوی ہوگیا ' ایک انجان ہستی جو " خوبصورت خاتون " کی طرح آسمان کی رہنے والی اور ستاروں کی سہیلی نہیں ہے بلکہ ایک لڑکی جو طرح طرح کے بھیس بناکر دنیا کا تماشا دیکھتی پھرتی ہے' اور اکثر ایسے مقامات پر نظر آتی ہے جہاں شرابی اور عیاش جمع ہوتے ہیں - کبھی شاعر اسے دور سے دیکھتا ہے اور " تیز شراب دل کے گوشہ گوشہ میں سرایت

کرجاتی ہے " کبھی مت بھیڑ ہوجاتی ہے اور شاعر کو اس کے چہرے پر اس کے مزاج کی عجیب عجیب کیفیتیں اس کے دل کے راز ' اس کی آرزوئیں اور تمنائیں نظر آتی ہیں - لیکن گو " اجنبی عورت " کی کیفیتیں روشن ہیں ' شاعر اپنی امنگیں اور خواہشیں نہیں سمجھتا کہ کیا ہیں —

" میں ' اپنے نصیب کے ستارے کے چمکنے سے مست اور مسرور ہوں'
شراب نے اور صبح کی رونق اور دیدار نے
مجھے بے زبان کردیا ہے ' تڑپا دیا ہے '
مجھے امید اب کس بات کی ہے ' انتظار کا ہے کا ؟

" خوبصورت خاتون " اور " اجنبی عورت " دونوں کے عشق سے بلوک اپنے دل کو تسکین نہیں پہنچا سکا اس کا جذبہ نہایت پاک تھا - اور شوق بے انتہا لیکن یہ استعارے اصلیت کی شکل نہیں اختیار کرسکے ' اور بلوک ان میں جان ڈالنے کی کوشش سے اکتا گیا - آخر میں روس ' اس کا دیس ' وہ سر زمین جس کی گود میں اس کی شخصیت پلی تھی ' جس کی مصیبتوں نے اس کا دل دکھا یا تھا ' جس کی فضا نے اسے فراست بخشی سکھائی تھی ' اس کی معشوقہ بن گئی • نظموں کا تیسرا مجموعہ جس میں بلوک کے فلسفے کا یہ رخ نظر آتا ہے ' ہر صورت سے اس کے کلام کا بہترین حصہ ہے - وہ مایوسی جو اس سے پہلے کی نظموں میں محسوس ہوتی ہے ' اب حد سے گذر جاتی ہے' مگر اس کے ساتھ ہی بلوک کو روس کے مستقبل کا خیال کرکے کچھ روحانی سہارا بھی مل جاتا ہے ' اور اس کی مایوسی محض ایک ذاتی کیفیت ہوجاتی ہے ' کل کائنات پر چھائی ہوئی نہیں رہتی - اس مجموعے کی اشاعت کے ایک سال بعد ہی بولشوک انقلاب نے روسی زندگی کی کایا پلٹ دی ' اورگو بلوک کو

• روسی زبان میں روس مونث ہے

سیاسی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ' وہ بولشویکوں کے ساتھ شریک ہوگیا ' اور اپنی شاعرانہ امیدوں کو ان کی کوششوں سے وابستہ کردیا اس کی دو لمبی اور بہت سی مختصر نظمیں جو انقلاب کے دوران میں لکھی گئیں ان امیدوں کا رنگ دکھاتی ہیں لیکن اپنی نسبت اس کا وہی خیال رہا ' اپنی ذات کی طرف سے وہی مایوسی جو سنہ ۱۹۱۴ء کی ایک نظم سے ظاہر ہوتی ہے —

اور اگر ہمارے بستر مرگ پر
چیل کو چلائیں اور منڈلائیں تو پروا نہیں -
تو ان کو جو ہم سے زیادہ سزاوار ہیں
اے خدا اپنے جلوے کی دیدار سے سر فراز کر !

بلوک کے پہلے طرز کی دو نظمیں ملاحظہ ہوں .

مجھے مت بلا میں بن بلائے
تیرے حرم میں پہنچ جاوں گا -
خاموشی سے تیرے پیروں پر
سر کو جھکادوں گا -
تیرے احکام سنوں گا '
چپ چاپ انتظار کروں گا -
دیدار کے لمحے کے مزے لیکر
پھر اسی آرزو میں محو ہو جاؤں گا ؛
تیرے جذبات کی شدت
میرے گلے کا طوق ہوگی -
کبھی خادم بنوں گا کبھی محبوب

اور ہمیشہ غلام رہوں گا :

شاعر کے دل کی ایک خاص کیفیت کا بیان سنئیے -

شام کو جب زمین کہرے کی نقاب ڈال لیتی ہے
تو بھونچال اور شعلوں سے گھرا ہوا
ایک فرشتہ قرآن کے صفحوں سے نکل کر
میری مردہ روح میں داخل ہو جاتا ہے -
دماغ کمزور اور تھکا ماندہ ہوتا ہے '
روح اڑتی چلی جاتی ہے ...
ہر طرف بے شمار پروں کی پھر پھرا ہٹ ہوتی ہے '
کانوں میں ایک پر اسرار گیت کی صدا گونجتی ہے -

تیسرے دور میں بلوک کی ذہنیت پر مایوسی کا غلبہ تھا - ایک مختصر نظم میں وہ اسے اپنے خاص طرز میں ظاہر کرتا ہے :

عیش و طرب کی مجلس کا لطف اٹھا کر
میں رات کو بہت دیر سے گھر واپس آیا -
رات کا اندھیرا میرے کمروں میں منڈلا رہا تھا '
میرے گوشۂ عافیت کی حفاظت کرنے کو ...
صرف میرا شیطان دم بھر بھی چین نہیں لیتا -
وہ مجھ سے کہتا ہے : دیکھ یہ تیرا جھونپڑا ہے -
اب اس وقت کی کیفیت ' اس وقت کی بیہودگیاں بھول جا
اور پارساؤں کا سا منہ بنا کر اپنے گیتوں میں گذشتہ زمانے کی جھوٹی تعریف کر -

اس دور کی بہترین نظمیں وہ ہیں جن میں بلوک نے اپنے کو مخاطب کیا ہے ' مگر افسوس ہے طوالت کے اندیشہ سے یہاں ان کے ترجمے دینا ممکن

نہیں - بلوک کی استعاریت پر آخری دور میں حقیقت نگاری کا جو رنگ چڑھ گیا : اس کی بہت اچھی مثال ایک نظم میں ملتی ھے جس میں ایک فوج کا ریل پر سوار ھوکر پیٹر برگ سے میدان جنگ کے لئے روانہ ھونا بیان کیا گیا ھے —

اس ریل گاڑی کے مسافروں میں جدائی کے درد' محبت کی بے چینیوں '
قوت ' جوانی ' امید کے ہزاروں پھول کھلے ھوئے تھے ...
اور دور مغرب کی طرف
دھویں جیسے بادل خون میں ڈوبے ھوئے تھے -

موت کا یہ شگون اور بھی واضح کردیا جاتا ھے -

گاڑی اسٹیشن سے نکل گئی
اندھیرے میں آخری ڈبے چھپ گئے ؛
اور خاموشی نے صبح تک کے لئے ڈیرے ڈال دئے ؛
لیکن بارش سے ' گیلے میدانوں سے " ھورا " کی آواز آتی رھی تھی '
جس کی ھولناک صدائے باز گشت تھی : آگیا ' وقت آگیا "

سنہ ۱۹۱۸ کے بعد استعاریت کا زور کم پڑگیا - اگر چہ بلوک اور ویا چلاتاوانوف ؛ اس کے دو عظیم الشان نمائندے زندہ تھے اور ان کا کلام بہت مرغوب بھی تھا ؛ اس سال سے ایک نئی تحریک شروع ھوئی جو " شاعری پیشہ برادری " کے نام سے مشہور ھے اور جس کا بانی نکولائی ستیپا نووچ گومی لیوف تھا - شاعری کے اس نئے معیار کے مطابق دنیا اور زندگی کو استعارہ سمجھنا غلط تھا ؛ اور شاعر کا فلسفہ حیات ایک حقیقت نگاری قرار دی گئی جو پھول کو پھول کہے ؛ اور خوبصورت سمجھے : مگر

اپنے احساسات کے بیان میں وہ تازگی پیدا کرے ' ابدی نظر میں وہ سادگی جو اس نسل کی خصوصیات تھیں جس نے پہلے پہل دنیا میں وارد ہوکر دنیا کو دیکھا اور اس پر تعجب کیا - اس نئے معیار نے تصوف کو بھی شاعری سے خارج کردیا ' اور شاعر کو بجائے استعاریت پسندوں کی طرح عارف سمجھنے کے محض صناع قرار دیا - خرد گومی لیوت کا کلام اس معیار پر پورا اترتا ہے ' کیونکہ وہ آدمی بہت من چلا تھا ' سیر و سیاحت اور درندوں کے شکار کا شوقین ' بالکل ویسا ہی دنیا میں دوبارہ انسان جیسا " شاعری پیشہ برادری " والوں نے شاعر کے لئے ہونا لازم کیا تھا - اس کی نظموں کے موضوع بھی جنگل اور شکار اور شکار کے حادثے ' سمندر کے سیاح اور بہادر سپاہی تھے - ایک نظم میں جہاں گومی لیوت نے جسم اور روح کا ایک مکالمہ بیان کیا ہے ' جسم کہتا ہے : مگر اس سب کے بدلے جو میں نے دیا ہے اور اب بھی دینا چاہتا ہوں ' اپنی خوشی اور حماقتوں اور رنج کے بدلے ' میں ' جیسا کہ ہر مرد آدمی کو چاہئے ' مرنے اور مٹ جانے پر بھی راضی ہوں - مردانگی کو اس درجے تک پہنچانا کہ وہ شعر بن کر بھی ظاہر ہوا کرے آسان کام نہیں - اور " شاعری پیشہ برادری " کا گومی لیوت کے علاوہ ایک ہی اور رکن ہے جس نے میدان سخن میں نام پیدا کیا : آننا آخماتووا ' جو چند سال تک گومی لیوت کی بیوی بھی رہ چکی ہیں —

آننا آخماتووا (پیدائش سنہ ۱۸۸۹ ع) کی نظمیں پہلی بار سنہ ۱۹۱۱ ع میں ' گومی لیوت سے شادی ہونے کے ایک سال بعد شایع ہوئیں - یہ نظمیں خاص شاعروں کے حلقوں میں بہت پسند کی گئیں ' عام شہرت آننا آخماتووا کو ان کے کلام کے دوسرے مجموعے کی اشاعت پر حاصل ہوگی

(سنہ ۱۹۱۴) - اس کے بعد دو اور مجموعے شائع ہوئے ' ایک سنہ ۱۹۱۷ ع میں دوسرا سنہ ۱۹۲۲ ع میں - بلوک کے انتقال پر پیٹر برگ کے شاعروں کی سرداری ان کا حصہ ہوئی —

آننا آخما تووا کی نظمیں زیادہ تر ڈراما کے سے مناظر ہیں ' مگر بہت مختصر - ان کے جذبات میں کسی قسم کا شاعرانہ بلند آہنگار نہیں ' لیکن شدت ہے اور خلوص ' طرز بیان کے اختصار سے ان کی نظموں میں ایک عجیب لطف پیدا ہوتا ہے ' اور گو وہ زیادہ تر آپ بیتی سناتی ہیں ' ان کی کیفیت ایک خواب کی سی رہتی ہے - دو نمونے ملاحظہ ہوں —

جیسا کہ سیدھی سادی خوش اخلاقی کا تقاضا ہے '
تم میرے پاس آئے مسکرائے '
کچھ پیار سے ' کچھ بے پروائی سے
میرے ہاتھ پر بوسہ دیا '
اور مجھ پر ایک نظر ڈالی ' معلوم ہوا
کہ پرانی انجان صورتیں مجھے دیکھ رہی ہیں —
میں نے ایک لفظ کہا جس میں
دس برس کی آہیں ' اس مردنی کی جو مجھ پر طاری تھی '
ان راتوں کی جو میں نے جاگ جاگ کاٹی تھیں
ساری تاثیر جمع تھی - مگر اس کا کہنا بے سود ہوا
تم چلے گئے اور پھر میرا دل
سپاٹ اور ویران اور خالی ہوگیا

جدائی کی ایک صورت یوں بیان ہوتی ہے :

میں تیرا سفید مکان ' تیرا خاموش باغ چھوڑدوں گی '

اس کی پروانه کروں گی که میری زندگی ویران ہوگئی ' جیسے بے بادل آسمان ،
تیرا ' صرف تیرا اپنے گیتوں میں چرچا کروں گی ،
تجھے مشہور کروں گی ، جیسا کوئی عورت اپنے دوست کو نہیں کر سکی ہے -
تو اپنی عزیز دوست کو یاد کرے گا ، اس جنت کو
جو تو نے اس کی آنکھوں کو فرحت پہنچانے کے لئے بنائی تھی '
اور میں سوداگری کروں گی ایک بیش بہا مال کی —
تیری الفت اور محبت کو شعر بنا کر بیچوں گی —

آننا آخماتووا کی ایک اور نظم کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس میں صرف روس کی نہیں بلکہ ہر اس قوم کی ذہنیت جو تنزل کی حالت میں ہوتی ہے بہت سچے اور دل کش طریقے پر بیان کی گئی ہے :

ہم نے سمجھ لیا کہ ہم مفلس ہیں ' ہمارے پاس کچھ بھی نہیں -
اور جب ایک کے بعد ایک نعمت ہمارے ہاتھ سے جانے لگی ،
اور ہر دن ایک نئے نقصان کا ماتم ہونے لگا
تو ہم نے گیت بنانا شروع کئے
خدا کے عظیم الشان فیض و کرم پر '
اور اس دولت پر جسے کبھی ہم اپنی کہتے تھے "

استعاریت کے زوال پر روسی شاعروں کے اصولوں اور اسالیب میں انتشار پیدا ہوگیا اور ابھی تک یہی صورت قائم ہے - اوسپ یمیل یوچ ماندل ستام نے شروع میں ,, شاعری پیشہ برادری " کے اصول نظم اور گومی لیوف کی تقلید کی ' لیکن پھر اپنا نیا طرز ایجاد کیا ہے جس میں خیالات اور زبان کے اعتبار سے کوئی خوبی نہیں ' صرف الفاظ کے انتخاب اور ترتیب سے موسیقی کی خاص کیفیتیں شعر میں پیدا کر دی گئی ہیں - سنه ۱۹۱۷ ء کے بعد دو اور

نئے حلقے وجود میں آئے ہیں ' " دیہاتی شاعری " یا " تصوری " اور " مستقبلی "
دونوں پر اشتمالیت کی تعلیم اور انقلاب کی فضا کا بہت اثر ہے ' یعنی
انھوں نے فنی شاعری کے وہ بنیادی اصول اور وہ مقاصد جو شروع سے
اس وقت تک ہر شاعر نے تسلیم کئے ہیں اور جو شاعری کا خاص میدان
سمجھے جاتے ہیں ' بالکل رد کر دئے ہیں - ان کی شاعری کو جمالیات سے کوئی
واسطہ نہیں ' وہ خود نہ لطیف جذبات رکھتے ہیں نہ دوسروں کی طبیعتوں
میں اس کا وجود تسلیم کرتے ہیں ' جن سے انہیں کوئی سروکار نہیں ' خواہ
وہ منظر فطرت کا ہو یا انسان کا یا تخیل کا - اس صورت میں ان کے کلام
کا ذکر کرنا فضول ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنا بیکار - ان جدتوں
سے کہیں بہتر ان پرانے شاعروں کی نظمیں ہیں جو انقلاب کے زمانے میں
انقلاب کی اخلاقی اور روحانی کیفیات پر لکھی گئی ہیں ' جن میں سچی
باتیں اچھے طریقے سے کہی گئی ہیں اور جن کے مصنف روسی قوم اور روسی
فطرت سے انقلابیوں سے بہت زیادہ گہری واقفیت رکھتے ہیں -

انقلابی دور کی پرانے طرز کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے سب سے
پہلے بلوک کا نام زبان پر آتا ہے - جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ' بلوک
نے " خوبصورت خاتون " اور " اجنبی عورت " کی طرف سے سرد مہر ہو کر
اپنی سرزمین روس کو معشوقہ بنایا تھا - پہلے انقلاب کی ناکامی اور
اصل حقیقت کے انکشاف نے اسے بہت مایوس کر دیا تھا ' مگر اس مایوسی کے
باوجود اس کی محبت کا جذبہ بہت قوی رہا - ایک نظم میں وہ روس کو
ایک دنیا دار عورت کی شکل میں پیش کرتا ہے - اور اس کی طرف ہر قسم
کی اخلاقی پستی اور دل کا کمینہ پن منسوب کرکے آخر میں کہتا ہے ؛

مگر اس صورت میں بھی ' اے سرزمین روس

تو مجھے دنیا کے ہر ملک سے زیادہ عزیز ہے :

جہاں روسی فطرت کی خامیاں نہیں بیان کی جاتی ہیں وہاں اور باتوں پر افسوس ظاہر کیا جاتا ہے مگر شاعر کی محبت ہر دوسرے جذبے پر غالب رہتی ہے :—

روس ' مفلس روس ' میرے نزدیک
تیرے متیالے جھونپڑے '
تیرے کھیتوں کے سبک نغمے ـ
گراں بہا ہیں جیسے محبت کے بہائے ہوے پہلے آنسو ـ

کبھی کبھی اُمید نے بلوک کی دست گیری کی ' اور اس نے اپنے ملک کی عظمت کے بیحد دل ربا خواب دیکھے ' جن میں سے ایک اس کی نظم " نئے امریکہ " میں بیان کیا گیا ہے ـ لیکن ترقی اور رونق کے یہ خواب اس کے دل سے بے چینی اور اندیشہ دور نہ کر سکے سنہ۱۹۰۸ع میں اس نے ایک نظم " میدان کولی کوو " لکھی جس میں جنگ عظیم اور انقلاب کے زلزلے کی پیشین گوئی ہے ' اور انقلاب تک بلوک اپنے دل کو اسی امید سے تسکین دلاتا رہا کہ روسی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا بنیادی تغیر ضرور ہوگا جو حالات کو بالکل بدل دے گا ' پرانے فلسفۂ حیات کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے گا اور یوں روس کی فلاح کا ذریعہ ہوگا لیکن حزن اور مایوسی بلوک کی طبیعت پر اس طرح حاوی ہوگئی تھی کہ جب مستقبل کے وجدانی علم نے اسے انقلاب کے آمد کی خوش خبری سنائی تب بھی وہ اپنے آپ پر ' یا ان روسیوں پر جو اس کے ہم دہر تھے مطلق اعتبار نہ کرسکا ' روس میں جان پھونکنے کی خدمت دوسروں کو سونپی ، اور اپنے لئے روحانی تباہی کے سوا اور کوئی انجام تصور نہ کرسکا ـ مایوسی اور امید کی یہ

عجیب آمیزش ان تمام نظموں میں پائی جاتی ہے جو اس نے انقلاب کے زمانے میں لکھیں ، اور جو در اصل اس دور کی سب سے قابل قدر ادبی یادگاریں ہیں - اپنی کیفیت وہ ذیل کی نظم میں بہت پر درد مگر صمیم طریقے سے ظاہر کرتا ہے :

مجھ پر بیچارے جاہل ہنستے تھے ،
کہتے تھے نوجوان شاعر شعبدہ بازی کر رہا ہے ،
جہاں امید کی صورت نہ تھی ، امید پیدا کر دی ،
جن کی کوئی انتہا نہ تھی ، اس کی حد باندھ دی -
مجھے خود بھی وہ شعلہ جو میں نے روشن کیا ہے
عجیب نظر آتا ہے ، میرے دل کو اس سے وحشت ہوتی ہے ،
میں خود اپنے تیر کا زخمی ہوں ،
خود اِس نئی زندگی کا بوجھ اٹھانے سے ہمت ہار بیٹھا ہوں ،
گزر نے والو - میرے پاس سے گزرتے جاؤ
میرے درد کا مذاق اڑاتے جاؤ -
میں تو مر رہا ہوں ، مگر مجھے معلوم ہے میری بنائی ہوئی دنیا ،
میری موت کو برداشت کرلے جائے گی ، اور تمہاری ہیبت ناک تضحیک کو بھی

ایک اور نظم ملاحظہ ہو ، اس میں مایوسی کی وہ شدت نہیں اور ناکامی کا کچھ اندیشہ جو ظاہر ہوتا ہے انقلاب کے عظمت کے احساس میں محو ہو جاتا ہے :

دنیا کی اس تاریکی پر جو صدیوں سے چھائی ہوئی تھی ،
اس تاریکی پر جو نفرت اور شہوانیت سے بھری ہوئی تھی ،
اس تاریکی ، پر جنگی نعروں کے جواب میں آسمان پر

ایک نئی قوت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔
وہ شعاعیں جو اس آفتاب کے تاج کے گوشے ہیں
بہت جلد کالے بادلوں کی گھٹا کو پار کر جائیں گی،
اور لوگ میدان جنگ سے دریا کے دھارے کی طرح
اس کے چمکتے ہوے تخت کے سامنے پہنچیں گے۔
ہم جو صرف رات کے اندھیرے اور طوفان سے آشنا ہیں،
اس شاہانہ جلوے کے دیدار کی تاب نہ لا سکیں گے،
اور ہماری دنیا آسمان کا وحشت ناک منظر دیکھ کر،
راکھ کا ایک ڈھیر بن جائے گی۔

انقلاب کے زمانے کا ادبی کار نامہ بلوک کی نظم " بارہ سوار " ہے، جس کا اکیس مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اور بعض زبانوں میں متعدد بار۔ اس میں بارہ سواروں کا قصہ ہے جو رات کو شہر میں پہرہ دے رہے ہیں، اور گشت کرتے گاتے اور ادھر اُدھر گولیاں چلاتے سڑکوں کی گشت لگا رہے ہیں۔ انقلاب کا زمانہ ہے، زیادہ رات گزرنے کے بعد لوگوں کو سڑکوں پر گھومنے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے یہ بارہ سوار جب اپنے آگے ایک شخص کو سر جھکائے جاتے ہوے دیکھتے ہیں تو اسے فوراً للکارتے ہیں وہ شخص کوئی جواب نہیں دیتا، سوار فوراً گولی مارتے ہیں، مگر اس کا بھی راہ روا پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تب وہ ڈرتے ڈرتے ایڑ لگا کر اس کے پاس پہنچتے ہیں راہ رو منھ پھیر کر ان کی طرف دیکھتا ہے، اور سوار اس کی صورت دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں، کیونکہ وہ کوئی معمولی راہ رو نہیں، خود حضرت عیسیٰ ہیں، جو اپنی محبوب قوم میں روحانی بیداری کے آثار دیکھ کر آئے ہیں کہ شاید ان کی بھی امیدیں پوری ہوں۔ اس نظم میں بلوک نے صرف انقلاب کی

روحانی اہمیت نہیں جتاتی ہے بلکہ شاعری کا ایک کرشمہ دکھایا ہے - اس کی زبان وہی ہے جو عوام، خصوصاً شہری مزدوروں کے گیتوں کی، مگر اس کی بحریں موسیقی اور ترنم کے جواہر ریزے ہیں، اور اس میں ایک شان ہے جو بہت کم نظموں میں پائی جاتی ہے -

بلوک کے علاوہ ان تمام شاعروں نے جن میں وطن پرستی کی ذرا بھی گدگدی تھی اپنے اپنے طرز پر انقلاب سے ہمدردی اور ان مصیبتوں پر افسوس ظاہر کیا جو انقلابیوں اور روس کی عام آبادی کو اس تحریک کے کامیاب بنانے کے لئے اُٹھانی پڑیں، لیکن بلوک کے پایہ کو کوئی نہیں پہنچا آننا آخما توو‌ا کو بھی اپنے وطن سے بہت محبت ہے، اور لڑائی کے زمانے میں انہوں نے اپنے جذبے کا یوں اظہار کیا تھا —

برسوں بیمار رکھ کر میری زندگی تلخ کردے -
مجھے سانس کے روگ میں مبتلا کردے، میری نیند چھین لے، مجھے گرمی میں جلا
اولاد اور دوست سے محروم کردے —
نغمہ سرائی کی پر اسرار نعمت واپس لے لے،
لیکن اے خدا، میری یہ دعا بھی قبول کرلے
کہ اتنے دنوں تکلیف دینے اور تڑپانے کے بعد
وہ بادل جو تاریک روس پر چھایا ہوا ہے
آخر کار آفتاب کی شعاعوں سے چمک اُٹھے

لیکن یہ وطن پرستی ایسی شدید اور دل افروز نہیں کہ شاعرہ کو مستقبل کے راز بتادے، یا انقلاب کے روحانی اسرار ان پر واضح کرسکے انقلاب کی نسبت آننا آخما توو‌ا صرف یہ کہہ سکیں:

کہ گذشتہ صدیوں سے ہمارا زمانہ کس صورت سے بدتر ہے؟

کیا اس لحاظ سے کہ درد اور پریشانی کی انتہائی حالت میں
اس نے وہ روگ دور کرنا چاہا جو سب سے زیادہ زہریلا تھا '
اور نا کامیاب رہا ؟

ان شاعروں نے جو انقلاب اور انقلابیوں کے خاص حامی اور مبلغ مانےجاتے ہیں '
اور جن کا سردار مایا کوفسکی (پیدائش سنہ ۱۸۹۳ م) ہے ' تخیل کی بلند
پروازی اور ادبی کمال سے بالکل بیگانہ ہیں اور ان کی شاعری کو دراصل ادب
میں شامل ہی نہ کرنا چاہئے- البتہ انقلاب نے نئی زندگی کی تعمیر کا سچا جوش
اور حوصلہ پیدا کردیا ہے ' اور یہ حوصلہ ممکن ہے رفتہ رفتہ نئے پھول کھلائے ۔
ودلیرئی بریو سوف کی نظم "تیسری خزاں" کے آخر میں جو دعوی ہے اس میں
مبالغہ بہت ہے مگر روسی قوم کی عام بیدار دلی دیکھتے ہوئے اس کا بھی
امکان ہے کہ وہ ایک حد تک صحیح نکلے :

اے ہوا ' اے ہوا ' یہ یاد رکھ
کہ جھگڑوں ' اور بیکسی اور مفلسی کے باوجود
سارا روس تعمیر کی خوابوں سے مست
خدا کے حکم پر چلے گا اور فتحیاب ہوگا !
اے ہوا , یاد رکھ کہ پرانی قوت پھر روس میں آگئی ہے '
فتحیابی کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے '
اور اس کی روز افزوں طاقت اور اقتدار
اسے دنیا کی ساری قوموں کا رہبر بنادے گا !

مغربی اسماء معرفہ اُردو قالب میں

از

(جناب احمد الدین صاحب مارہروی)

[یہ مضمون ایک مختصر تمہید و تشریح کا طالب ہے]

تقریباً پانچ سال کا عرصہ ہوا کہ الہ آباد میں چند علم دوست نوجوانوں نے نالج آفس کے نام سے ایک دارالشاعت قائم کیا جس کا مقصد اردو زبان میں چند نایاب چیزوں کا اضافہ کرنا تھا - لیکن اس وقت خود ان لوگوں کو بھی ' جو اس دارالاشاعت کے بانی تھے ' معلوم نہ تھا کہ یہ " بیش بہا اضافہ " کیا ہوگا ' اور انجمن کا نصب العین مرتب کرتے وقت اس قدر متضاد تجاویز پیش کی گئیں کہ اگر ایک غیبی امداد نہ مل جاتی تو نالج آفس کام کرنے سے قبل ہی کالعدم ہو جاتا ' قصہ مختصر انجمن نے اپنی تگ و دو تین امور تک محدود رکھا (۱) ' ایک ماہوار رسالے کا اجراء جس کے ذریعہ سے پبلک کو سلیس زبان اور سادہ عبارت میں تمام علوم اور خصوصاً سائنس کے مسائل سے روشناس کیا جائے ' چنانچہ یہ رسالہ (معلومات) جنوری سنہ ۱۹۳۰ ع سے جاری کر دیا گیا (۲) پچاس جلدوں میں ایک فرہنگ اسمیہ شائع کرنا ' جس میں دنیا کے تمام مشہور مرد اور عورتوں کے خواہ وہ کسی ملک کسی زمانے کسی طبقے اور کسی فن سے تعلق رکھتے ہوں ' سوانح حیات بحساب حروف تہجی درج ہوں اور (۳) مصنفین انگلستان (English Man OF Letters) کی روش پر مصنفین اُردو کی سوانح عمریاں معہ تبصرہ کلام شائع کرنا —

دارالاشاعت کی تاریخ بیان کرنا چونکہ میرے موضوع سے باہر ہے اس لئے میں صرف دوسری شق کو لیتا ہوں اس فرہنگ کی تدوین کا کام میرے سپرد ہے اور چار سال کی مسلسل محنت کے بعد میں نے اپنے معاونوں کی مدد سے ایک جلد مرتب

کرلی ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے * - جس وقت اس کام کو شروع کیا گیا تو ہمکو ان دقتوں کا مطلق اندازہ نہ تھا جو اس سلسلے میں پیش آئیں ، اسماء کی جستجو اور حالات کی تلاش جوئے شیر کے لانے سے کم نہ تھی اور بعض اوقات تمام تگ و دو کوہ کندن و کاہ بر آوردن یا سعی لاحاصل ثابت ہوتی اور ہم لوگ کام کی نوعیت سے گھبرا اُٹھتے - تدوین کا کام بھی آسان نہ تھا اور اُس وقت سب سے بڑی دقت جو پیش آئی وہ مغربی اسماء معرفہ کو اُردو قالب میں ڈھالنا اور اسکے واسطے کوئی مستقل اور یکساں اصول مقرر کرنا تھا - بہترین صورت تو یہ ہوسکتی تھی کہ تمام ناموں کو انگریزی تلفظ کے مطابق اختیار کرلیا جاتا ، لیکن اس زبان میں تلفظ کے اصول اول تو مقرر نہیں اور اگر معدودے چند ہیں بھی تو اُن میں مستثنیات اس قدر ہیں کہ " المشاہیر " جیسی کتاب میں اس سے استفادہ کرنا تمام محنت کو ضائع کرنے کے برابر ہے —

اس گتھی کو سلجھانے کی صرف دو صورتیں تھیں ، ایک تو یہ کہ ہر لاطینی حرف کے واسطے ایک حرف مقرر کرلیا جائے اور جملہ یوروپین اور امریکن ناموں کو یکساں طور پر اُردو میں ترجمہ کرلیا جائے لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ بعض نام اس طرح مسخ ہو جاتے کہ اُن کا سمجھنا دشوار ہوتا ، مثلاً (George) جو انگریزی میں " ج ے آر ج (ے) " اور فرانسیسی میں ژ ے آ ر ژ (ے) ہے اس اصول کی رو سے گیارگی بن جاتا اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ در اصل کیا نام ہے - اسی طرح (Churchll) جس کو انگریز چرچل کہتے ہیں تہار تھیل ہوجاتا - مگر سہولت یہ تھی اس میں ایک آسانی بھی تھی وہ یہ کہ تمام ناموں کے واسطے یکساں اصول مقرر ہوجاتا - اور انگریزی داں طبقہ کو اس میں کچھہ زیادہ دشواری نہ ہوتی —

---

* پبلک اور خصوصاً پروفیسروں کے بیحد اصرار سے انجمن نے اس کا ایک انگریزی ایڈیشن شائع کرنا بھی منظور کرلیا ہے اور ہندی میں ترجمہ کی تجویز بھی پیش نظر ہے المشاہیر کے متعلق جملہ حالات نالج آفس الہ آباد سے معلوم ہوسکتے ہیں —

برخلاف اس کے دوسری تجویز یہ تھی کہ تمام اسماء معرفہ کو اسی طرح لکھا جائے جس طرح وہ اُس زبان کے قواعد کی رو سے متلفظ ہوتے ہیں - جہاں تک صحت تلفظ کا تعلق ہے یہ تجویز بہت مستحسن تھی مگر اس میں ایک دقت یہ پیش آنے والی تھی کہ اُردو داں طبقہ ' جو ہر چیز کو انگریزی عینک سے دیکھتا ہے بعض ناموں کو غلط پڑھتا اور جب فرہنگ میں ان کو اس جگہ نہ پاتا تو سخت مایوس اور ناراض ہوتا - مثلاً (Jean) انگریزی میں تو جین ہے لیکن فرانسیسی میں ژے ونْ پڑھا جاتا ہے - اور بجائے ج کے ژ کے تحت میں لکھا جائیگا - یا (خ Vische) وسچر ' وسکر ' یا وشر نہیں لکھ " ف ی ش (ے) ر " ہے اور بجائے و کے ف کے تحت میں ملے گا

یہ ایک اصولی فرق تھا اور چونکہ مجھے کو پبلک کے سامنے ایک نئی مگر مستقل چیز پیش کرنا تھی اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ملک کے مشہور اہل الرائے حضرات سے اس کے متعلق مشورہ کر لیا جائے - چنانچہ میں نے دونوں تجاویز کو ایک گشتی خط کے ذریعہ سے ڈاکٹر سر محمد اقبال (لاہور) مولوی عبدالحق صاحب (انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد) نیاز فتحپوری (لکھنؤ) ڈاکٹر ذاکر حسین (جامعہ ملیہ دہلی) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد یونیورسٹی) سید سلیمان ندوی (دارالمصنفین ' اعظم گڑھ) مولوی نعیم الرحمان (ھندوستانی اکیڈیمی اور دیگر حضرات کے سامنے پیش کرکے ان کی رائے سے استصواب حاصل کیا , ان میں سے بعض نے تو (غالباً مصروفیت کی وجہ سے باوجود دو بارہ سہ بارہ یاد دھانی کے جواب نہ دیا ' لیکن جو جوابات موصول ہوئے ان کی تقسیم اس طرح کی جا سکتی ہے :-

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ' اور نیاز فتحپوری نے اصول ثانی سے اتفاق کیا ' مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اسی کو ترجیح دی اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی اگر جواب دیتے تو اس سے اتفاق کرتے

ڈاکٹر زبید احمد (الہ آباد یونیورسٹی) نے پہلی تجویز کو پسند فرمایا
سید سلیمان ندوی نے مجموعہ کو ڈاکٹر صدیقی کے مشورے پر کار بند
ہونے کی صلاح دی —
مولوی نعیم الرحمن صاحب نے پہلی تجویز کو نا ممکن العمل کہا ۔
یعنی دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے اصول ثانی
کو ترجیح دی —

اس طرح گویا ملک کے زیادہ تر اهل الرائے اصحاب نے مغربی
ناموں کو اردو قالب میں ڈھالنے کے لئے اس اصول کو پسند کیا کہ
جہاں تک ممکن ہو سکے ان کو اہل زبان کی طرح متلفظ کیا جائے
یہ بھی بذات خود ایک دقت طلب امر تھا اور اگر ڈاکٹر عبدالستار
صدیقی جو علاوہ السنہ شرقیہ کے انگریزی ، جرمن اور فرانسیسی
زبانوں میں ید طولیٰ رکھتے اور لسانیات (فلالوجی) کے ماہر ھیں اپنے
قیمتی مشوروں سے میری مدد نہ فرماتے تو معلوم نہیں اس
اسکیم کا کیا حشر ہوتا]

اهل هند نے چونکہ ایسے ماحول میں تعلیم پائی ھے ، جہاں علاوہ
انگریزی کے اور کوئی مغربی زبان بولنے یا سننے میں نہیں آتی ، اس لئے
وہ تمام چیزوں کو انگریزی کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ھیں ،
اس وقت بھی جب کہ سیاسات عام ہو گئی ھے اور اهل هند کا ایک بڑا
طبقہ پولٹکل مسائل سمجھنے اور بولنے لگا ھے ، آپ کو ایسے لوگوں سے ملنے کا
اتفاق ہوا ہو گا جو " یوروپین " کو انگریز اور " برٹش گورنمنٹ " کو گورنمنٹ
کا مترادف سمجھتے ھیں ، اور یہی وجہ ھے کہ هم تمام مغربی ناموں کو

اسی طریقہ پر ادیتے ہیں جس طرح ایک انگریز ان کا تلفظ کرتا ہے' لیکن قباحت یہ ہے کہ انگریزی ایک بے اصول زبان ہے اور پھر تمام انگریز بھی ایک نام کا یکساں طور پر تلفظ نہیں کرتے --

مثلاً (Vienna) کو کوئی انگریز ویانا کہتا ہے اور کوئی وائنا ' حالانکہ اس کا اصل تلفظ و ی ء ن ہے —

یا بولونیا کو بعض انگریز بولونا کہتے ہیں' بعض بلونا اور اکثر بولگنا بھی کہتے ہیں (Bologna) خود اپنے ہی ناموں میں ان کو اختلاف ہے ' مثلاً (Chelmsford) کو کوئی چیمسفرڈ کہتا ہے کوئی چیلمسفرڈ کوئی شیمسفرڈ ' اور آپ کو غالباً خیال ہو گا کہ یہ نام اُردو صحافت میں ایک عرصے تک زیر بحث رہا ہے —

یورپ کو جہاں تک السنہ کا تعلق ہے' دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے' (۱) وہ ممالک جنھوں نے لاطینی حروف تہجی کو اختیار کر لیا ہے' اس زمرے میں یورپ اور امریکہ کے تمام بڑے بڑے ممالک جاتے ہیں - (۲) وہ ممالک جنھوں نے ابھی تک اس طرف توجہ نہیں کی اور وہ اپنی پرانی روش پر قائم ہیں - مثلاً روس و یونان وغیرہ —

جن ممالک نے لاطینی حروف کو اختیار کر لیا ہے ان کے تلفظ میں چنداں قباحت نہیں ہوتی ' کیونکہ ان سب میں حروف کی آوازیں قریب قریب یکساں ہیں اور ہر زبان کے قواعد نہایت جامع طور پر مرتب کر لئے گئے ہیں - لیکن یونانی اور روسی الفاظ کے تلفظ میں غلطی ہو جانے کا احتمال ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان زبانوں کے حروف تہجی سے محض نا آشنا ہیں - علاوہ ازیں ان میں چند کی آوازیں ایسی ہیں کہ ہماری زبان ان کا ٹھیک طور پر اعادہ نہیں کر سکتی اور ہمارے واسطے

بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ان کو اس طرح اختیار کریں جس طرح وہ انگریزی قالب میں ڈھلے ہوئے ہم تک پہنچتے ہیں - اس کا البتہ خیال رکھنا چاہئیے کہ ان کا تلفظ انگریزی کے بے اصول قواعد کے مطابق نہ کیا جائے بلکہ یورپین اصول کو پیش نظر رکھ کر اس کے واسطے جداگانہ طریقہ بنایا جائے مثال کے طور پر (Ivan) کا تلفظ انگریزی میں آئیون ہوگا لیکن جامع اصول کے مطابق اس کو "ایوآن" پڑھا جائے گا اور یہی صحیح ہے —

اسی طرح (Cerigo) کو ہم ایک "سیریگو" کہیں گے لیکن یہ دراصل " چری گو " ہے اب میں ان اصولوں سے اعتنا کرتا ہوں جن کو میں نے اپنے مقصد کے واسطے اختیار کیا ہے - قبل اس کے کہ میں اصل موضوع کی طرف راجع ہوں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حروف ھجا کی اھل قواعد نے تین قسمیں کی ہیں - (۱) حروف صحیح جس کو انگریزی میں (Consonant) کہتے ہیں (۲) حروف علت یا (Vowel) اور لفیف مقرون یا (Diphthong) حروف صحیح وہ ہیں جو بلا حروف علت کے تحریک میں نہ آسکیں ' جس طرح لاطینی (b, d, f, g, h, j, k,) اور اُردو ب ' پ ' ج ' د ' وغیرہ - حروف علت وہ حروف ہیں جو دو یا دو سے زیادہ حروف صحیح کو ساتھ ملا کر پڑھنے میں مدد دیتے ہیں - لاطینی میں یہ حروف (a, e, i, o, u, w, y,) ہیں اور اُردو میں آ ' و ' ی ' کے علاوہ اعراب بھی یہی کام کرتے ہیں - لفیف مقرون بھی چونکہ دو حروف علت کے اتصال سے بنتا ہے اس لئے اس کو بھی حروف علت سمجھنا چاہئیے —

کسی زبان کے اسماء معرفہ کو اُردو قالب میں ڈھالنے وقت

سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہوگی کہ اس کے حروف علت اور لطیف مقروں کے مقابلہ میں مترادف الصوت اردو حروف کا تعین کرلیا جاے - اور پھر اسی طرح تمام حروف صحیح کو یکے بعد دیگرے لکھہ لیا جاے —

جگہہ کی قلت مانع ہے کہ ہم تمام زبانوں کے قواعد کو فرداً فرداً سپرد قلم کریں اسلئے اس مختصر مقالہ میں صرف فرانسیسی حروف ہجا سے اعتنا کیا جاتا ہے - فرانسیسی چونکہ یورپ کی مشترکہ زبان متصور ہوتی ہے اس لئے اہل یورپ عام طور پر ان اصولوں سے واقف ہیں اور اسی کے مطابق الفاظ کا تلفظ کرتے ہیں - البتہ انگریز اپنی قدیم اینٹھ الگ مسجد الگ بناتا ہے - مثلاً (george) بجز انگلستان کے کہ وہاں تو اس کو ج ... آرج کہیں گے ہر جگہہ ژ ے آ ر ژ (ے) بولا جائیگا —

سہولت اور صحت دونوں اس کے مقتضی ہیں کہ جو الفاظ اردو قالب میں ڈھالے جائیں ان کو ملا کر نہ لکھا جائے بلکہ تمام حروف کو الگ الگ لکھیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کونسا حرف ما قبل ہے اور کونسا بعد میں آتا ہے اور تلفظ میں دشواری نہ ہو - ساکن حروف لکھکر قلمزد کر دئے جائیں کیونکہ اس قسم کے الفاظ مثلاً (Dnieper) یا (ptolemy) کو عموماً د اور پ کے تحت میں تلاش کیا جائیگا اس لئے ان کو " (د) ن ی پ (ے) ر " اور " (پ) ت آ ل ے م ی " لکھنا زیادہ موزوں ہوگا —

اسکی بھی ضرورت ہے کہ اردو حروف علت کی مختلف آوازوں کا تعین کرلیا جائے - مثلاً جس طرح لاطینی کا (a) چار مختلف آوازیں دیتا ہے (آ - آ - اے - آے) اسی طرح اردو حروف علت کی بھی مختلف آوازیں ہوتی

هیں - مثال کے طور پر " واؤ " کو لیجئے - سودا ' سود - صوڑ دیوار '
میں هر واؤ ایک جدا گانہ آواز دیتی هے —

چنانچہ پہلے حروف علت کی آوازوں کا تعین اس طرح کیا هے —

الف - اَ هندی (अ) مثلاً اَسیر - توَام

آ - هندی (आ) مثلاً آم - کام - جاتا

اِ - هندی (इ) مثلاً اِتاوہ - اِنعام

اُ - هندی (उ) مثلاً اُس - اُن - بعض لوگ اوس اور اون لکھتے
هیں مگر یہ صحیح نہیں -

ا - هندی (ऊ) اس کو اُردو میں او کے لئیف نقروں سے ظاهر
کیا جاتا هے مثلاً اونت ' حالانکہ هم اس لفظ کو بلا واؤ کے بھی درست لکھہ
اور پڑھ سکتے تھے - اُنٹ

اسیطرح اِ - هندی (ई) هے - اسکو اُردو میں ای کی متعدد اواز سے
ظاهر کیا جاتا هے - مثلاً اِیران حالانکہ هم " اِرآن " بھی لکھہ کر
درست پڑھ سکتے تھے

واؤ - ساکن و جو دراصل پیش (ُ) کی مترادف هوتی هے ' مثلاً خود -
خورد ' جو پڑھنے میں خد اور خرد هو جاتا هے

و - جو اوٓ - آ کی اواز دیتی هے مثلاً موٓد - بہبود - هوٓد وغیرہ

و - جو او کی آواز دیتی هے - مثلاً موتی - کرمتی وغیرہ

ؤ - مثلاً کون - جونپور وغیرہ

و - یہ دراصل وٓ هے اور عموماً حروف کے آخر میں آتی هے -
مثلاً دیو - دیوار -

وِ - مثلاً - وِقار - وِلایت

یاء - ای - یِ ہندی (ई) مثلاً سیر -

ای - ی ہندی (ई) مثلاً میزان - کھیرے -

آے - ےَ - مثلاً گیند - بیرا --

اِے - ےِ مثلاً کیلا - جیب - سیب - وغیرہ

لفیف مقرون دو حروف علت کی ملی ہوئی آواز ہے - جس طرح لاطینی میں ان کی مختلف اجتماع سے مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں اسی طرح اردو میں بھی ان کے مرکب بنائے جا سکتے ہیں - لیکن چونکہ ہمارے ہاں اعراب موجود ہیں اس لئے حروف کو ملانے کی زیادہ ضرورت نہ ہوگی --

فرانسیسی زبان کے قواعد تلفظ مندرجہ ذیل طریقہ پر منضبط ہو سکتے ہیں --

حروف علت و لفیف مقرون

(a) خواہ لفظ کے شروع میں ہو یا درمیان میں آ کی آواز دیتا ہے - مثلاً (Bonaparte) ب و ن آ پ آ ر (ت) (ی) اور (Agost) آ گ و س (ت) لکھا جائے گا --

(a) کے بعد اگر m یا n ہو تو اس کی آواز اؤ ہو جاتی ہے مثلاً (Ambois) اؤنْ ب وا ے (ز) یا (Andre) اؤنْ د رے

(ae) بھی آ کی آواز دیتا ہے مثلاً (Stael) س ت آ ل

(ai) اِے کی آواز دیتا ہے مثلاً (Calais) ک ا ل ےِ (س)

(ao) = آؤ مثلاً (Paoli) پ آ ؤ ل یِ -

(au) = او مثلاً (Auch) ا و ش

(Ay) اے ـ مثلاً (D' Arablay) د ا ر ب ل ے

(e) = اے مثلاً (Bezier) ب ے ز ی ے (ر) مگر جب کسی حرف کے آخر میں ہو تو ساکن ہوتا ہے ' مثلاً (Gironde) ژ ی ر و ں د (ے)

(ê, é, è) اے - ے کی آواز دیتا ہے اور کسی حالت میں ساکن نہیں ہوتا -- مثلاً (Fécomp) ف ے ک و ں پ یا (André) اوں د رے

(eau) = او مثلاً - (Rousseau) ر و س

(ea) — اے آ -- مثلاً (Orlean) ا و ر ل ے ا و ں یا ( )

(i) — ای -- مثلاً (Diderot) د ی د (ے) ر و (ت)

(ie) ای مثلاً (Amiens) آ م ی آ ن (س)

(o) = آو مثلاً (Condorcet) ک و ں د و ر س ے (ت)

(oi) و آ مثلاً (Soissons) س و آ س و ں (س)

(oy) — و آی مثلاً (Royer) ر و آ ی ے (ر)

(ou) — اُ مثلاً (Rousseau) ر و س و

(u) = یوٗ مثلاً (Ushant) ا ی ش و ں (ت) یا (Dumas) د یوٗ م ا (س)

حروف صحیح کی آوازوں کا بھی اسی طریقہ سے تعین کرنا چاہئیے

(b) بَ کی آواز دیتا ہے لیکن جب اس سے پہلے (m) ہو تو ساکن ہوجاتا ہے ـ مثلاً (Coulomb) ک و ل و ں (ب)

(c) کے بعد اگر a, o, u یا کوئی حرف صحیح ہو تو اس کی آواز سخت یعنی ک کی ہوگی مثلاً (Fecamp) ف ے ک و ں پ

لیکن اگر وہ e, i, y سے قبل ہو تو س کی آواز دے گا مثلاً (Annecy) آ ں (ے) س ی

جب لفظ کے آخر میں آے تو ساکن رہتا ہے ' مثلاً (Blanc) ب ل و ں (ک)

(cc) کے بعد جب e یا i ہو تو پہلا c 'ک' اور دوسرا 'س' کی آواز دیتا ہے مثلاً (Acce) آ ک س ے پڑھا جاے گا —

(ch) ش مثلاً (Auch) ارش

(d) د کی آواز دیتا ہے مگر لفظ کے آخر میں ساکن ہوتا ہے - مثلاً (Ronald) رو ن آ ل (د)

(g) a, o, u, سے قبل سخت یعنی 'گ' کی آواز دیتا ہے اور e, i, y, سے قبل 'ژ' کی مثلاً (Orange) ا و ر و نٛ ژ (ے)

لفظ کے آخر میں ساکن ہوجاتا ہے مثلاً (Long) ل و (گ)

(gn) یہ مرکب بہت دلچسپ ہے' کیوں کہ اس میں n کی آواز ما قبل نکلتی ہے اور ی میں تبدیل ہو جاتا ہے مثلاً (Bologna) بو ل نٛ ی آ اور (Digne) د ی نٛ ی ے متلفظ ہوتا ہے —

(h) عموماً ساکن ہو تا ہے مثلاً (Rouher) رُ وُ (ہ) ے ر یا (Havre) (ھ) ا و ر (ے) لکھا جاے گا —

(j) ژ مثلاً (Janin) ژ آ ن ی ن - (Majorca) م آ ژ و ر ک آ —

(l) = ل

(ill) یہ دوسرا دلچسپ مرکب ہے' کیوں کہ اس میں (ll) ی کی آواز دیتا ہے - مثلاً (Fille) ف ی ی ے یا (Marseille) م آ ر س ی ی ے -
اس مرکب کے بعد (e) ضرور آتا ہے اور خواہ وہ حرف کے آخر میں ہو یا درمیان میں کبھی ساکن نہیں ہوتا —

m = م
n = ن
لیکن حروف یا کسی ٹکڑے Syllable کے آخر میں ہوں تو غنہ ہو جاتے ہیں' جن کو علی الترتیب 'مٛ' 'نٛ' لکھا جاے گا —

(P) = پ لیکن جب (t) سے قبل ہو تو ساکن ہوگا، مثلاً (Prompt)
پ ر و مْ (پ) (ت)

(q) ⎫
(qu) ⎭ = ک

(r) = ر

(s) = س لیکن جب دو حروف علت کے درمیان ہو تو ز کی آواز دیتا
ہے۔ مثلاً (Casale) ک آ ز آ ل (ے)

حروف کے آخر میں ساکت ہوتا ہے، مثلاً (Orleans) او ر ل ے ا و نْ (س)

(ss) = س۔ (Rousseau) روس و

(sc) = ک، لیکن اگر اس کے بعد e, i, y, ہو تو 'س' کی آواز دیتا
ہے۔ مثلاً (Scioto) س ی و ت و

(t) = ت، لیکن حروف یا ٹکڑے کے آخر میں ساکن ہوتا ہے، مثلاً
(Rochefort) ر و ش (ے) ف و ر (ت)

(th) = ت، کیوں کہ h عموماً ساکن ہوتا ہے، مثلاً (Thiers) ت ی ے ر (س)

V ⎫
W ⎭ = و۔ مثلاً (Weber) و ے ب ے ر

(x) = کس، لیکن جب a سے ماقبل ہو تو گز کی آواز دیتا۔ مثلاً
(Alexander) آ ل ی گز ونْ د ے ر

(y) = ی

(z) = ز

اسی طرح دوسری زبانوں کے قواعد مرتب کئے جا سکتے ہیں، البتہ اُن زبانوں کے واسطے، کوئی معلوی اصول قائم کرنا مشکل ہے، جو یا تو مردہ

ہوچکی ہیں یا انہوں نے ابھی تک لاطینی زبان کے حروف تہجی کو اختیار نہیں کیا - اس کے متعلق میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ ہمارے واسطے سہل ترین نسخہ یہی ہے کہ ہم بجائے اصل کی طرف دوڑنے کے ان کی لاطینی شکل سے اعتنا کریں اور اِن کے قواعد جہاں تک ممکن ہوسکے اصل کے مطابق مرتب کر لیں ' تاکہ تلفظ میں خامی نہ رہ جائے —

آئندہ اشاعت میں کوشش کی جائے گی کہ فرانسیسی کی طرح دوسری السنہ کے قواعد تلفظ کو بھی مشرح طور پر بتا دیا جائے اور اگر ملک اس اسکیم کو منظور کر لے تو گویا ہماری زبان میں ایک بیش بہا اضافہ ہوجائے گا۔ جہاں تک مجھہ کو علم ہے کسی مشرقی زبان نے اس قسم کا اصول ایجاد نہیں کیا ' حتی کہ مصر بھی با وجود اس قدر ترقی یافتہ ہونے کے ' اس بارے میں دوسرے ممالک کے دوش بدوش ہے ' اور ان کے ہاں بھی مغربی ناموں کو معرب کرنے کا کوئی ایک اصول مقرر نہیں—

اب میں چند فرانسیسی نام بطور مثال کے پیش کرکے بتانا چاہتا ہوں کہ ان کو اُردو سانچے میں کس طرح ڈھالا جائے —

۱ Louis le Blanc یوں لکھا جائے گا - " ل وُ ی (س) - لُ - ب ل و نْ (ک)

کیوں کہ l = ل ou = وُ i = ی s = ساکن ' Le = لُ * b = ب

l = ل an = و نْ c = ساکن

۲ Count de Maurepas = ک وُ نْ (ت) دُ م و ر (ے) پ آ (س)

c چونکہ o سے قبل ہے اس لئے ک کی آواز دے گا - ou = وُ

n = نْ t = ساکن ہے - t چونکہ آخری ساکن ہے - de = دُ m = م

* le de کو غلطی سے بعض لوگ لے اور دے اور بعض ل و اور د و لکھتے ہیں لیکن یہ زیادہ صحیح نہیں —

au = و r = ر e = ے p = پ a = ا s = ساکن

۳ (Chateauroux) = ش آ ت و رو (کس) ch = ش a = آ t = ت

eau = و r = ر ou = وُ x = کس ، لیکن چونکہ آخر میں ہے

اس لئے ساکن ہوگا ــ

۴ Queret Demery = کیرے (ت) ڈیمےری ۔ qu = ک

e = ے r = ر e = ے t = (ت) (ساکن) d = ڈ e = ے

m = م e = ے r = ر y = ی ــ

[باقی آئندہ]

*

مرزا غالب کا ایک غیر مطبوعہ رقعہ

(یہ رقعہ ہمیں جناب سید فرخ حیدر صاحب بی - اے ' ایل ایل - بی (علیگ) شمس آباد ضلع فرخ آباد نے عنایت فرمایا ہے جس کے لئے ہم صاحب موصوف کے بہت شکر گزار ہیں - اس میں حروف تہجی وغیرہ کی تذکیر و تانیث اور بعض اور ادبی نکات سے بحث ہے - خط میں تاریخ درج نہیں ہے - اڈیٹر)

سعادت و اقبال نشان مرزا یوسف علی خاں کو بعد دعا کے دل نشین ہو کہ تانیث و تذکیر ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں - اے لو "لفظ" اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے' اہل پورب اس کو مونث بولتے ہیں - خیر جو میری زبان پر ہے وہ میں لکھہ دیتا ہوں' اس باب میں کسی کا کلام حجت و برہان نہیں ہے - ایک گروہ نے کچھہ مان لیا ایک جماعت نے کچھہ جان لیا' اس کا قاعدہ منضبط نہیں - الف مذکر' ب ت ث مونث - ج مذکر' ح خ مونث - دال ذال مونث' رے زے مونث - سین شین مذکر' ص ض ط ظ مونث - عین غین مذکر' ف مونث - قاف کاف لام میم نون مذکر - واو ہے ی مونث' ہمزہ مذکر - لام الف حروف مفردہ میں نہیں مگر بولنے میں مذکر بولا جاے گا' لام الف کیا خوب لکھا ہے کہیں گے' کیا خوب لکھی ہے نہ کہیں گے —

خزادہ خداوند زادہ کا مخفف ہے' لیکن فارسی نہیں عربی نہیں' اردو کا روزمرہ تھا؛ خزادہ خزادی مرادف صاحبزادہ صاحبزادی ہے' مگر فی زماننا متروک ہے - "فق" فارسی لغت نہیں ہوسکتا عربی بھی نہیں' روزمرہ اردو ہے جیسا کہ میر حسن کہتا ہے —

که رستم جسے دیکھ رہ جاے فق

شعرائے حال کے کلام میں نظر آتا - "تکیہ" لفظ عربی الاصل' فارسی اردو میں مستعمل' دونوں زبانوں میں ہم بمعنی بالش اور ہم بمعنی مکان فقیر آتا ہے' ایران میں تکیہ صائب مشہور ہے - "گل تکیہ" لفظ مرکب ہے ہندی اور فارسی سے - گل مخفف گال کا اور تکیہ بمعنی بالش - وہ چھوٹا گول تکیہ جو رخسار کے تلے رکھیں' گل تکیہ کہلاتا ہے - گل بمعنی پھانسی انگریزی لغت ہے انگریزی زبان سے بنگالہ میں سو برس سے اور دلی اکبر آباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے - گل تکیہ وضع کیا ہوا نورجہان بیگم کا ہے - جہانگیر کے عہد میں اہل ہند کیا جانتے تھے کہ گل کیا چیز ہے —

"معنی مفرد بہ تلفظ جمع" اس جملے کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا - معنی مفرد معانی جمع - اور یہ جو اردو کے محاورے میں تقریر کرتے ہیں کہ اس شعر کے معنے کیا ہیں یا اس شعر کے معنے کیا خوب ہیں' اس میں دخل نہیں کیا جاتا' خاص و عام کی زبان پر یوں ہی ہے' معانی کی جگہہ معنے بولتے ہیں - "رت" لفظ ہندی الاصل رتھہ ہے بہ ہائے مضمرہ' بعض مذکر بولتے ہیں بعض مونث ۱۲ شعر بہت اچھا ہے صاف و ہموار —

راقم غالب

جنگ نامۂ سید عالم علی خاں

از

اڈیٹر

فرخ سیر کے عہد سے لیکر محمد شاہ بادشاہ کے کچھہ زمانے تک سید عبداللہ خاں (قطب الملک) اور سید حسین علی خاں (امیر الامرا) سادات بارہ سلطنت کے مالک و مختار تھے - یہ بادشاہ گر تھے اور بادشاہ ان کے ہاتھہ میں کٹ پتلی تھے - نواب نظام الملک (آصف جاہ) سے ان کی ان بن ہوگئی تھی - اس لئے دربار شاہی سے دور رکھنے کے لئے رفیع الدرجات کے عہد میں ان کو صوبہ داریء مالوہ پر مامور کیا گیا - نظام الملک بہادر نے انکار میں مصلحت نہ دیکھی اور بادل نا خواستہ تعمیل حکم کی اور وہاں کے نظم و نسق میں مصروف رہ کر اس خطے کو مفسدوں سے پاک کیا - چونکہ سادات کو نظام الملک بہادر کے بڑھتے ہوے اقتدار اور کثرت فوج کی وجہ سے اندیشہ ہوگیا تھا، حسین علی خاں نے نظام الملک کو لکھا کہ دکن کے صوبوں کے انتظام کے لئے ہمارا ارادہ ہے کہ ہم صوبۂ مالوہ میں رہیں آپ اپنے لئے اکبر آباد، الہ آباد، ملتان، برہانپور کے صوبوں میں سے کوئی ایک صوبہ انتخاب کر لیں - نظام الملک اس سے بہت مکدر ہوے اور اس کا جواب کسی قدر درشتی کے ساتھہ دیا - امیر الامرا اور قطب الملک نے نظام الملک کے وکیل کو خلوت میں بلاکر سخت سست کہا - جب اس کی خبر نظام الملک کو پہنچی تو وہ آمادۂ پیکار ہوگئے - کہتے ہیں کہ اس میں محمد امین خاں کے توسط سے شاہی اشارہ بھی تھا - غرض انہوں نے اپنے رفقا کو ساتھہ لیکر دکن کی جانب کوچ کیا اور نربدا کو عبور کیا - (وسط جمادی الآخر سنہ ۱۱۳۲ ھ مطابق مئی سنہ ۱۷۲۰ ع) - جب امیر الامرا کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے

دلاور علی خاں بخشی ' راجہ بھیم سنگھ اور راجہ گجک سنگھ (قلعدار) کو نظام الملک کے تعاقب کے لئے بھیجا - نظام الملک کا ستارہ عروج پر تھا قلعۂ اسیر اور قلعۂ برھانپور بغیر جنگ و جدال کے ھاتھ آے اور انور خاں صوبہدار برھانپور اور عوض خاں صوبہدار برار اور رنبھا سردار مرھٹہ اور بہت سے زمیندار اور پٹھان اُن کے شریک حال ھوگئے - جب دلاور علی خاں کا لشکر کوچ کرتا ھوا برھانپور سے جانب مشرق چودہ کوس پر پہنچا تو نظام الملک نے اپنا لشکر اس کے مقابلے کے لئے غیاث خاں کی سرکردگی میں روانہ کیا - لڑائی میں دلاور علی خاں اور اس کے دونوں راجہ رفیق مارے گئے (۱۹ جون سنہ ۱۷۲۰ ع) —

سید عالم خاں بارہ جس کی عمر بیس سال کی تھی (دیکھو شعر ۳۶) فرخ سیر کے وزیر سید عبداللہ قطب الملک کا بھتیجا اور متبنیٰ تھا - وہ اپنے دوسرے چچا سید حسین علی خاں کے دھلی چلے جانے پر (دسمبر سنہ ۱۷۱۸ ع) دکن کے چھ صوبوں کا صوبہدار یا نائب صوبہدار مقرر کیا گیا تھا (شعر ۳۶) - اسے نظام الملک کے مقابلے کے لئے احکام پہنچے تو وہ فوج لے کر فردا پور میں جو اورنگ آباد سے ۲۰ میل کے فاصلے پر برھانپور اور اورنگ آباد کے درمیان واقع ہے ' خیمہ زن ھوا - نظام الملک برھانپور سے مقابلے کے لئے روانہ ھوے - جب نظام الملک کے لشکر نے دریاے پورنا سے عبور کیا (۲۰ جولائی سنہ ۱۷۲۰ ع) تو عالم علی خاں ۵ شوال سنہ ۱۱۳۲ ھ کو مع اپنے رفقا منور خاں (دیکھو شعر ۳۱۶) ' غالب خاں (شعر ۲۵۳ ' ۳۰۵) عمر خاں (شعر ۱۶۸ ' ۲۹۳ ' ۳۷۴) میتھی خاں (شعر ۱۶۸ ' ۲۵۳ ' ۴۰۷) محمدی بیگ (شعر ۱۶۸ ' ۲۵۴) ' امین خاں (۱۲۵ ' ۲۵۶ ' ۲۵۹) غیاث الدین خاں ' خواجہ رحمت اللہ ' قدوی خاں وغیرہ اور سرداران دکن و مرھٹہ مقابلے کے لئے آگے بڑھا - نظام الملک نے محمد رحمت خاں کو اپنے فرزند غازی الدین خاں کی معیت میں ھراول کیا اور عبدالرحیم خاں ' وعایت خاں ' غیاث خاں ' اختصاص خاں وغیرہ کو میمنہ و میسرہ پر

مقرر کرکے خود مع عوض خاں قول لشکر میں متمکن ہوے —

عالم علی خاں بڑی مردانگی اور شجاعت سے لڑا اور اگرچہ اس کا سارا بدن زخموں سے چور تھا مگر اُس کا ہر قدم آگے ہی بڑھتا تھا۔ آخر اسی طرح لڑتے لڑتے یہ بہادر نوجوان اس دنیا سے کوچ کر گیا —

اس کے بعد سیدوں کے خاندان نے دولت آباد میں پناہ لی (دیکھو شعر ۴۰۱) خافی خاں کی تاریخ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

مجھے اس جنگ نامے کے تین نسخے دستیاب ہوے۔ ایک نسخہ میرا ذاتی ہے اسے (ا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرا نسخہ مجھے مولوی عبدالحمید صاحب وکیل گدگ نے عنایت فرمایا جو (ب) سے موسوم ہے۔ اور تیسرا وہ نسخہ ہے جو مسٹر ولیم اَروِن (William Irvine) نے مہاراجہ بنارس کے کتب خانہ سے حاصل کیا اور رسالہ انڈین اینٹیکوری (Indian Antiquary) بابت ماہ جنوری و مارچ سنہ ۱۹۰۴ ع میں مع انگریزی ترجمے کے شایع کیا۔ یہ نسخہ (ج) ہے —

مسٹر اَروِن کا نسخہ اول و آخر سے ناقص ہے۔ عبدالحمید صاحب کے نسخے میں شروع کے کچھہ اشعار غائب ہیں۔ میرا نسخہ مکمل ہے اور اس کی ترتیب اور تحریر دوسرے نسخوں سے بہتر ہے۔ اس لئے میں نے اس نسخے کو بنیاد قرار دیا ہے۔ البتہ دو ایک جگہہ ایک ایک مصرع غائب ہے اور بعض مقامات پر کوئی کوئی لفظ رہ گیا ہے۔ کہیں کہیں مصرع پورا کرنے کے لئے قیاس سے جو لفظ بڑھا دئے ہیں انہیں قوسین میں لکھہ دیا ہے۔ دوسرے نسخوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ بھی ظاہر کردیا ہے۔ تینوں نسخوں میں اشعار کی کمی بیشی بھی پائی جاتی ہے — جو اشعار نسخہ (ا) میں نہیں اور دوسرے نسخوں سے اضافہ کئے گئے ہیں ان پر علامت + لگا دی گئی ہے اور جن اشعار پر × نشان ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دوسرے نسخوں میں نہیں ہیں —

مسٹر ولیم اَروِن نے اس کا مصنف "سودشت" بتایا ہے — انہیں اپنے نسخے کے ایک شعر سے دھوکا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو شعر ۴۱۴ ان کے

نسخے میں اس شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے —

سود شتا یہ کیا کیا ستم ہاے ہاے

" سود شتا " الف نداٸیہ اور " سوداشت " تخلص قرار دیا ہے — یہ صحیح نہیں ہے یہ لفظ " دستا " ہو گا کاتب نے غلط لکھہ دیا - دوسرے نسخوں میں یہ مصرع اس طرح ہے —

سو ایسا ستم پو ستم ہاے ہاے

یا یہ ممکن ہے کہ ایسا کو کاتب دھتا لکھہ گیا - کاتبوں سے یہ بعید نہیں - اب انھیں یہ فکر ہوی کہ اس نظم میں فارسی عربی کے لفظ بکثرت ہیں یہ ضرور کسی مسلمان کی لکھی ہوی ہے اور " سودشت " ہندی لفظ ہے تو انھوں نے یہ تاویل کی کہ اکثر مسلمان مصنف جب کوی چیز ہندی میں لکھتے تھے تو اس میں تخلص بھی ہندی رکھتے تھے —

آرون صاحب کے منشی نے مصنف کو پنجابی بتایا ہے مگر خود وہ اسے بالای دواب کا خیال کرتے ہیں جہاں کے سادات بارہ رہنے والے تھے - لیکن اندرونی شہادت پر غور کرنے کے بعد انھوں نے یہ قیاس قائم کیا کہ مصنف دکنی ہے اور چونکہ ولی اس زمانے میں زندہ تھا اور ۱۱۳۲ ھ میں دہلی میں تھا اور یہ واقعات بھی اسی سنہ میں واقع ہوے اس لئے غالباً اس کا مصنف ولی ہے —

مسٹر آرون کا یہ قیاس بالکل صحیح ہے کہ مصنف دکنی ہے ' زبان صاف بتاتی ہے - لیکن مصنف کے متعلق ان کا قیاس غلط ہے - اس میں وہ مجبور تھے وہ اپنے نسخے کو کامل سمجھے ہوے تھے ' حالانکہ آخر سے کئی شعر غائب تھے — مصنف نے خود آخر میں اپنا نام بتادیا ہے - اگر یہ شعر ان کے نسخے میں ہوتا تو انھیں یہ الجھن نہ ہوتی —

یہ نظم تاریخی حیثیت رکھتی ہے — اس میں جو نام اور سنین آئے ہیں وہ تاریخ کے رو سے بالکل صحیح ہیں — مصنف کو عالم علی خاں سے ہمدردی معلوم ہوتی ہے— اور وہ حق بجانب ہے۔ اس سن میں جس دلیری اور جیوٹ سے لڑ کر اس نے جان دی ہے وہ بے شبہ

قابل تعریف ہے - یہاں تک کہ نظام الملک کے طرف دار مورخوں نے بھی اس کی بہادری کی تعریف کی ہے - نظم سادہ ہے اور کہیں تصنع اور تکلف سے کام نہیں لیا - بعضے اشعار موثر بھی ہیں خصوصاً جب عالم علی خاں ماں سے میدان جنگ میں جانے کی اجازت مانگتے ہیں اور رخصت ہوتے ہیں یا جب عالم علی خاں کے مرنے کی خبر آتی ہے اور ماں اس کا ماتم کرتی ہے —

یافتاح بخشندہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع کے بیس شعر نسخہ (ب) سے لئے گئے ہیں نسخہ (ا) میں یہ موجود نہیں نسخہ (ج) میں بھی ابتدائی حصہ غائب ہے اور ۲۴ ویں شعر سے شروع ہوتا ہے —

(۱) اول حمد واجب ہے کرتار کا
دو عالم کے وارث خریدار کا

(۲) قضا اور قدر جس کے ہے ہاتھ میں
نہیں شک شبہ کچھ کسی بات میں

(۳) حکم ذات اوس کے ہے حاکم ہے وہ
سگل عیش و عشرت کا عالم ہے وہ

(۴) نرنجن نرا دھار سبحان ہے
خداوند برحق مہربان ہے

(۵) ہے خداوند قدرت کا قادر ہے وہ
نہیں دور ہر حال حاضر ہے وہ

(۶) کہ دیدے سرو پائے جلوہ سپہر
دیوے راج سر پر رکھے تاج سر

(۷) اچھے کس کوں حافظ رکھے بر قرار
خطا بخش مہرباں پروردگار

(۸) خرابی میں جس کے اشارہ کرے
اوسے ایک پل میں آوارہ کرے

(۹) کرے لطف کی جس کے اوپر نظر
دیوے راج سر پر پھراوے چھتر

(۱۰) کرے ملک سب اس کی تسخیر میں
کھماوے حکومت کی زنجیر میں

(۱۱) رکھے عمر دولت کا روشن چراغ
کرے دل کوں ہر غم سوں اوس کے فراغ

(۱۲) رکھے رنگ قدرت کا انسان میں
مکرم کیا اس کوں جس شان میں

(۱۳) جو کچھہ کھیل کھیلے سزاوار ہے
مزاحم نکوں اس کا اظہار ہے

(۱۴) کیا کن کے کہنے میں سارا ظہور
کفر ہور اسلام ظلمات نور

(۱۵) جوواقف ہے وحدت کے میدان کا
ہے غالب ہو عالم کے میدان کا

(۱۶) لبھانے لگے جس کے ایمان کوں
مسلط کرے نفس شیطان کوں

(۱۷) رکھے تا ابد اوس کوں گمراہ کر
سعادت کے راہاں سوں بیراہ کر

(۱۸) اچھے بے خبر حق سوں بہ حال میں
گرفتار ہ نیا میں جنجال میں
(۱۹) نجانے خدا کوں نجانے رسول
کرے عاقبت اپنی سب خاک دھول
(۲۰) اوسے ہے خبر جس کوں محرم کیا
د نیا کی محبت سوں بے غم کیا
(۲۱) یوہ دکھ (ن) شیران (ن) کوں سرکھاے هیں — (ن) - هے (ن) - ڈھوں کے
انک اس کے پہالے میں پھتاے هیں
(۲۲) غنیمت سمجھہ عمر کیا شور هے
انکھیاں کھول کر دیکھہ انگے گور هے
(۲۳) یوہ دھن مال آخر کوں رہ جائیگا
جو کچھہ یہاں کیا هے سو واں پائیگا

در نعت محمد مصطفیٰ علیہ السلام

(۲۴) محمد نبی پر درود (ن) اور سلام $\frac{\text{ن}}{\text{ب}}$ و
(ن) جتنے اهل اصحاب سب پر مدام — $\frac{\text{ن}}{\text{ب}}$ جتنے آل اصحاب پر نت مدام
(۲۵) شفیع هے خلائق کے کردار کا
مقرب خدا کے سو دربار کا
+ (۲۶) اول هیں ابا بکر روشن هلال
صدق اور بزرگی میں هیں بے مثال
+ (۲۷) دوجے هیں عمر یار صاحب وقار
که دائم نبی سوں رهے یار غار

(۲۸) + تیجے یا رُعثماں اہل جناں
جنو کیا جمع سا را قرآن
(۲۹) + کہ چوتہے علی شاہ داہل سوار
جنو کی کمر میں رہی ذوالفقار
(۳۰) + سبھی چار یاراں میں اہل قدر
حشر کے ہیں مسندکےصاحب صدر
(۳۱) زہے پنجتن ہیں خدا کے ولی
ہراں سو ہوا دین روشن جلی
(۳۲) کہا یوں حکایت غنیمت بیاں (ن)
سنو جان دل سے تمہیں بے گماں

(ن/ب) سنو اس حکایت کا کیا ہے بیاں

(۳۳) عزیزاں! یو قصہ ہے طوفان کا
اس عالم علی، صاحب شان کا
(۳۴) قضا نے سو ہر حال .آخر زماں
کہے ہیں نبی سوچ دستا عیاں
(۳۵) عزیزان یو سب ہیچ در ہیچ ہے
یو قصہ عجب پیچ در پیچ ہے
(۳۶) سنو دوستاں ! ابتدا جنگ کا
زمانے کی گردش و نیرنگ کا
(۳۷) ہے عالم علی سید نام دار
دکھن کے چھہ صوبوں میں صاحب مدار
(۳۸) X نہ دشمن کسی کانہ کس سوں فساد
و سید جوان مرد عالی نژاد

(۳۹) رہے شہر میں صوبہ‌داری کرے
تماشے کوں سواری شکاری کرے
(۴۰) X رہے رات دن سب سے اخلاص سوں
نہ دھوکا دھک کس کے وسواس سوں
(۴۱) نپٹ خوب صورت و صاحب جمال
کہ دنیاں میں کوئی نہیں اوس کے مثال (ن) ن/ب کہ ثانی نہیں کوئی اسکے مثال ۔
(۴۲) عجب قد و قامت بڑی بہار کا
نہ راضی اتھا کس کے آزار کا
(۴۳) لٹکتا چلے جب نکل ناز سوں
امیری کے پوشاک اور (ن) ساز سوں ن/ن ب هور شان ۔
(۴۴) دسے دل پیاراں میں پیارا لگے (ن) ن ب/ب شکل جس کی تہا روں سہں نہارا لگے
چلن چال اوس کا سو نیارا لگے چلن چال سگلہاں بہی نہارا لگے
(۴۵) جوانی میں (وہ) ریش آغاز تھا
نہنی عمر میں صاحب راز تھا
(۴۶) بڑا قد دسے جوں برس تیس کا
ولے عمر تھا بیس اکیس کا
(۴۷) رہے سب سوں هل مل کے آرام سوں
نہیں کام کچھ صبح اور شام سوں
(۴۸) یکا یک خبر آشکارا هوا
گھر سے گھر یو غل اور پکارا هوا
(۴۹) کہ لے کر نظام الملک فوج سات
چلا آتا هے سیدھا دکھن کیھ بات

(۵۰) سو ایتے میں آ کوئی خبر یوں دیا
که اوترا نظام الملک نربدا

(۵۱) تمن سات ہے جنگ ہشیاری کرو
لڑای کی بیگی تیاری کرو

(۵۲) X سنا ہور رہا دل میں اپنے عجب
لڑای ہمن سات کیا ہے سبب

(۵۳) ہوی بات سید پہ تحقیق جب
بلا بھیج ارکان دولت کوں سب

(۵۴) (ن) دعایاں اسم سب پڑھانے لگے — ن/ب نذر جا بجا جب چڑھانے لگے
که نذراں بزرگاں چڑھانے لگے — دوعایاں اسم تب پڑھانے لگے

(۵۵) X پکانے لگے ہر جنس کے طعام
کھلانے لگے دم بدم صبح شام

(۵۶) (ن)ہتی ہور گھوڑے تصدق دیے — ن/ب ہتی اونتھ گھوڑے تصدق کئے
جو کچھ لازماں تھا یو سب کچھ دئے — جو کچھ جگ میں کرنا سوان سب کئے

(۵۷) تصدق دعایاں اتارن لگے
روپے اشرفیاں اتارن لگے (ن) — ن/ج روپے خوان بھر بھر کے وارن لگے

(۵۸) جہاں (لگ) قطب غوث اور پیر تھے
جہاں لگ ولی خاص گنبھیر (ن) تھے — ن/م خمیر

(۵۹) جہاں لگ جو کوئی صاحب ہوش تھے
زمانے کی گردش (ن) کے سرپوش تھے — ن/ب ج آفت

(۶۰) X ب جہاں لگ مقرب تھے درگاہ کے
جہاں لگ ولی خاص اس راہ کے (ن) — ن/م جہاں تک جو تھے خاص اس راہ کے

(۶۱) سدد سانگ سب (ن) سوں کیتا سوال
جہاں اگ قلندر تھے اہل کمال

ن/ب ج — سکلہاں

(۶۲) مہیں فرزند علی کا ہوں آل رسول
کرو عرض میری تم اپنی قبول (ن)

ن/ب ج — کرو عرض میرا تم اتنا قبول

(۶۳) پڑی ہے مجھے آ کے مشکل محال
تمہیں مل کے سب لیو مجکوں سنبھال (ن)

(۶۴) رکھو لاج مردوں کے میدان میں
اچھے جان جب لگ میری جان میں (ن)

ن اچھے جھو...... الخ
ب — ن/ج اچھے جان جب تگیں الخ

(۶۵) خدا باج نا کوئی مجھے یار ہے
اسی کے کرم کا مجھہ آدھار ہے

(۶۶) بلا پھر نجومی گھلایا نجوم
کہو قلعہ کیا ہے کیا دھام دھوم (ن)

ن/ب ج — کہو کیا ہے یہ قلعہ کیا ہجوم

(۶۷) کہو دن یو کہا ہے ستارہ ہے کون (ن)
فتم کس کی ہے اور آوارہ ہے کون

ن/ج — کہو دن ہے کیسے ستارہ ہے کون

(۶۸) X و و آیا ہے کیوں ُکس طرف چال ہے
کہو عاقبت کوں سو کیا حال ہے
(۶۹) X ہے غالب ہمنا پر یا مغلوب ہے
سنا دو شتابی جو کچھہ خوب ہے

(۷۰) اچھے کا رمل میں سو سب بول دیو
بھلا اور برا ایک بیک کھول دیو

(۷۱) X ب نوازونگا تم کوں کرونگا نہال
اڑھاؤنگا تمنا دوشالے و شال

(۷۲) کہے تب نجومیاں نے (ن) سب خیر ہے — ن/ج کہے سب نجو میاں نپٹ خیر ہے
ستاروں کی گردش تک پھیر ہے

(۷۳) یقیں ہے ہمن کوں فتح پاؤگے
فتح پاکے بیگی سوں پھر آؤگے (ن) — ن/ب فتح پا کے بیگی سوں کور آؤگے

(۷۴) پوچھا بات بعضے فقیراں بلا
تمہاری اس بات میں کیا صلا (ن) — ن/ب سلا

(۷۵) کہے سب فقیراں سن اے نواب (ن) — ن/ب کہیں تب فقیروں نے سن اے نواب
شہر چھوڑ جانا نہیں ہے ثواب — شہر چھوڑ جانے میں نہیں کچھ صواب

(۷۶) نجومی کہے ہیں خوش آمد کی بات
کہاں علم کامل ہے ان (ن) بیچ ہات — ن/ب کہواں کے

(۷۷) نہ امرا ؤ کوئی صاحب فوج ہے
سپاہی نہ کوئی صاحب اوج ہے (ن) — ن/ج شتابی کے کرنے میں کیا بوجھ ہے

(۷۸) نوی فوج ' لشکر نوا ہے (ن) سپاہ — ن/ب ج کل
دغا ہے دغا ہے دغا خواہ مخواہ

(۷۹) اٹھے بول یاراں سبھی اور شاہ
یو کیا باب ہے تمنا بوجھو صلاح

(۸۰) X اچھیں خیر خواہی میں مستقیم
او سے بس کفایت کریگا علیم

(۸۱) سپاہی نجانوں (ن) کہ کل باگ ہیں — ن/ب نہ ہو جو
صف جنگ میں ایک سوں (ن) ایک آگ ہیں — ن/ب سے ' ن تیں

(۸۲) سکت کیا جو کوئی روبرو ہوسکے (ن) — ن/ج سکت کیا جو کوئی روبرو ہو کھڑا
زمیں چھاند کے کوئی نہ ہرگز ٹلے — ج کھڑا ہو تو چھڑیوں سیں دیکھا اُڑا

(۸۳) شجاعت سیں (ن) ایک زور (ن) بازو کریں $\frac{ن}{ب}$ سوں، $\frac{ن}{}$ تیں
پہاڑاں اچھیں تو (ن) تراز و کریں $\frac{ن}{ب}$ کر ج

(۸۴) کہ یو فوج ہے آج دشمن شکن
اگر ہوے جمع ہند سارا دکھن (ن) $\frac{ن}{}$ اگر ہو جمع ہند، اگر سبھہ دکھن

(۸۵) کریں تل اوپر مار تلوار سوں ج
سگل فوج لشکر کے سردار کوں (ن) $\frac{ن}{ب}$ سگل فوج اور ان کے سردار کوں

(۸۶) لڑیگا وہی مرد میدان میں
شجاعت ہے جس مرد کی شان میں

(۸۷) قدیموں کی اپنے کرو دلبری
یو ہے بات بھاری نہیں سر سری

(۸۸) قدیماں کا اس واسطے مان ہے
سمجھیا ہے وو جس میں کچھہ گیان ہے

(۸۹) رہے ہو کے تم شاہ اندیشہ ناک (ن) $\frac{ن}{}$ رہے شاہ تب ہو کے الم
تمہارا ہے حافظ وو اب ذات پاک تمہارا ج ہے حافظ وہی ذات پاک

(۹۰) یوں ڈر (ن) دل میں مت لاؤ (ن) اس بات کا $\frac{ن\ ا}{}$ برا $\frac{۲\ ن}{}$ لینا
بھروسہ دشمن کوں ہے اس سات کا (ن) $\frac{ن}{ب}$ بھروسہ نہیں ج ہم کوں اس سات کا

(۹۱) فتح ہے نتح پر فتح کار ہے (ن) $\frac{ن}{}$ فتح دو فتح ان اڑا مار ہے
عزیزاں تمہارا خدا یار ہے (ن) $\frac{ن}{ج}$ فتح ج هی فتح ہے سہری یار ہے

(۹۲) کہے سن کے نواب نے اپنی (ن) بات ج $\frac{ن}{ب\ ج}$ اتنی
کہ مرنا و جیونا ہے سب رب کے ہات

(۹۳) جو یاری دے ہمنا نکل جاے گا (ن) $\frac{ن}{}$ جو بازی دی ہمنا کو مل جاے گا
جئے لگ وو دنیاں میں پچتاے گا ج جئے تک وہ دنیا سوں اچ آے گا

(۹۴) مجھے عار ہے عار انکار ہے
کہ تحقیق مرنا سزا وار (ن) ہے

ن / ج — سو یک بار

(۹۵) کروں گا جو کچھہ مجھہ سوں ہوآوے گا
یہی نام مردوں کا رہ جائے (ن) گا

ن / ب — یہی نام دنیاں میں رہ جائے گا

(۹۶) نگاہ داشت کی خوب کرنی کئے (ن)
نکلنے کی بیگی اوتاولی کئے

ن — اندیشہ سوں کل دل کو خالی کیا
ب — کہ چلنے کی بیگی شتابی کیا

(۹۷) X کسب چھوڑ بہوتوں نے گھوڑے لئے
سپر بانک بہوتوں نے توڑے لئے

(۹۸) X یونہی دیکھنے کے لڑن ہار نہیں
یو ہے مارکا* سخت بیوپار نہیں

* معرکہ

(۹۹) کرو گے جو کچھہ سو سمجھہ کر کرو
ہماری نصیحت یو دل میں دھرو

(۱۰۰) اٹھے بیگ بیگی سوں گور میں گئے
ادب سوں کھڑے پاس ماں کوں کہے

(۱۰۱) کہ تم ماں میں فرزند بڑے مان کا (ن)
بڑے پیار (کا) ہور بڑے (ما) ن کا

ن / ب — تمن ماں میں فرزند ہوں لاڑ کا
بڑے مان کا ہور بڑے پیار کا

(۱۰۲) سنو تم کہ دلی بہت دور ہے
ہمارا اسم جگ میں مشہور ہے

(۱۰۳) نظام الملک کی خبر ہے گرم
نہیں اب تو رہتی نہ دستی شرم

(۱۰۴) حکم ہو وے تو بہار ڈیرا کروں
برہانپور لگ ایک پھیرا کروں

(۱۰۵) میں پوتا ہوں اس شیر مردان کا
ہوں فرزند نورالدین علی خان کا

(۱۰۶) مجھے بیٹھنا شہر (ن) میں ننگ ہے　　ب ن/ رہنا بڑا - ج ن/ بیٹھہ رہنا بڑا
اگر آج رستم ستی جنگ ہے

(۱۰۷) یو سن کے کہیں گے سو قطب الملک (ن)　　ب ن/ ہنسیں گے مجھہ اُپر آں قطب الملک
دکن میں گیا تھا نظام الملک

(۱۰۸) یو سن کے تعجب کریں گے نواب
کہ فرزند عالم علی کا میاب

(۱۰۹) ترا جیو کوں اور نکل نا سکا
شجاعت کا ناموس کچھہ نا رکھا (ن)　　ب ن/ نا کیا

(۱۱۰) دنیاں میں دوبارا کچھہ آنا نہیں
یو دنیا جلم لگ تھانا (ن) نہیں　　ج ن/ تھکانا

(۱۱۱) اگر ہے حیاتی تو پھر آویں گے
فتح پاکے پھر موہ کوں دکھلائیں گے (ن)　　ج ن/ فتح ہو تو مکھہ آکے دکھلاویں گے

(۱۱۲) اپس دل میں ہملا بسارو (ن) نکو　　ج ن/ اتارو
دعا میں اچھو' نت بسارو نکو

(۱۱۳) پکڑ ہات سونپو خداوند کوں
رہو عیش آرام (ن) آنند سوں　　ج ن/ و

(۱۱۴) کہی ماں نے کیوں کر رضا دیوں تجھے
دکھن میں تیرے باج نہیں کوئی (ن) مجھے　　ن/ ہے کون

(۱۱۵) خدا باج ہم کوئی سنگاتی نہیں (ن)　　ج ن/ خدا باج کو تجھہ کوں ساتھی نہیں
مجھے مصلحت یو کچھہ بھاتی نہیں

(۱۱۶) نہنا بڑا کوئی نہیں سات ہے
تو لڑنے کوں جانایو (کیا) کہات ہے (ن) — ن/ج توں جاتا ہے لڑنے یہ کیا بات ہے

(۱۱۷) X قسم ہے تجھے سیر نواب کا
ہے سوگند تجھے میرے ماں باپ کا

(۱۱۸) X میرے دل ملے وہم و سو اس ہے
میرے پاس ... ... *

* نسخہ ا میں یہ شعر ناتمام ہے بقیہ دونوں نسخوں بھی موجود نہیں —

(۱۱۹) X مجھے چھوڑ توں جا اکیلا لکو
یو جانے کا دل میں فکر نا کرو

(۱۲۰) پھد (۲ن) ہو بجد ماں کوں راضی کئے (ان)
پھر حال چلنے کی رخصت لئے (ن ا)

ان/ج بہ جد و جہد — ن/ج کیا - لیا

(۱۲۱) X میری ننگ و ناموس اور لاج کا
کہا ہے قسم تجھ کوں معراج کا

(۱۲۲) X تیرا ملک تجھ کوں مبارک اچھو
مدد تجھ کوں ... ... + مبارک اچھو

+ نسخہ ا میں یہ شعر ناتمام ہے بقیہ دونوں نسخوں میں بھی موجود نہیں —

(۱۲۳) چھ سوار اُس وقت سید کے پاس ن
سپاہی قدیم تھے و گھر کے خواص

ن/ج چھ سوار اس وقت سید کے پاس
سپاہی و چیلا و کل عام و خاص
(پہلے مصرع میں کچھ غلطی ہوگئی ہے)

(۱۲۴) توکل کیا اور کیا دل کوں تھیت
میں سید ہوں اب کیا دکھاؤنگا پیٹ

(۱۲۵) بلاے شتابی سوں دیوان کوں
کہا تم لکھو خط علی خان کوں (ن)

ن — کہا اب لکھو خط امین خاں کوں

(۱۲۶) دکھن میں تمیں مرد ہونگے مشہور (ن)
شتابی سے ہم پاس آنا ضرور

ج/ن دکھن میں تمہیں مرد ہوکے مشہور
ج شتابی ہمیں پاس آنا ضرور

(۱۲۷) جلد آؤ اور مہربانی کرو
رفاقت سوں مل جانفشانی کرو

(۱۲۸) کہ یو وقت ہے وقت اب کام کا
تمہاری شجاعت کے ننگ نام کا (ن) ن/ب تمہاری شجاعت و ننگ نام کا

(۱۲۹) جو کچھہ تم کہوگے یہ سب ہے قبول
ہے شاہد ہمارا خدا کا (ن) رسول ن/ب و

(۱۳۰) چلا نے لگے جا بجا تہار تہار
روانہ کئے قاصداں ایک بار

(۱۳۱) نگہ داشت (ن) کا خوب گرمی کئے ن/ب نگہہ داش
جنے جو منگیا سوئیچ اس کوں دیے

(۱۳۲) اتہا ہارواں ن ماہ رجب کا چاند ن/ب اتھی ہارویں
چلیا گھر سے شمشیر بکتر کوں باندھ

(۱۳۳) X زرہ بکتر اس پاک کرنے لگے
جہاں کے تہای خوب مرنے لگے

(۱۳۴) X کماناو ترکش منگا بے شمار
لگے بانٹنے فوج میں ایک بار

(۱۳۵) X شہر میں ڈھنڈورا پھرایا تمام
جہاں لگ سپاہی اچھے نیک نام

(۱۳۶) X پنجارے قصای و سبزی فروش
اٹھے دیکھہ دل میں ہوا سب کوں جوش

(۱۳۷) X کہ کلجڑے بھٹارے و دھوبی حجام
بھرای بہشتی لہار کئے آ سلام

(۱۳۸) X کمر باندھہ تتو پر ھو سوار ھو
لے نعل بند ... ... ھات دھو * — * نسخہ ا میں یہ شعر ناتمام ھے '

(۱۳۹) کہا جا کے ڈیرا دیو میدان میں
محمدی باغ (ن۱) کے خوب اوچان (ن۲) میں — ن/ج ا نزک محمدی باغ ن۲/ب ج انچان

(۱۴۰) نقارے دمامے بجاتے چلے
روپے اشرفیاں (ن) لٹاتے چلے — ن/ج لٹی

(۱۴۱) X ب دھےیوں سردار ساراں ملے (ن) — ن/ج دسے ھوں اوہ سردار ساریاں ملے
دسے چاند سا را ستا راں ملے — ج که جیوں چاند ھے کل ستاریاں ملے

(۱۴۲) کیا جاکے ڈیرے میں وو دو (ن) مقام — ن/ب ج بارہ ' ن/ج چار ایک
کرے ملک (ن) تدبیر ھر صبح شام — ن/ب فکر

(۱۴۳) جہاں لگ تھے نوکر سپاھی امیر (ن) — ن/ج جہاں لگ تھے سردار ' جودھاں' بلی
بلا کر کہے خان روشن ضمیر — بلا کر کہا سید عالم علی

(۱۴۴) شہر چھوڑ ڈیرا میں باھر دیا (ن) — ن/ب دیا
توکل خدا مصطفے پر کہا

(۱۴۵) که تم ھو سپاھی میں سردار ھوں
بھلے اور برے کامیں غم خوار ھوں (ن) — ن/ج بھلا ' یا برا سب کا غم خوار ھوں

(۱۴۶) کہاں ھند یاراں کہاں ھے دکھن — ن/ج بارھا
کہاں خویش قربت کہاں ھے وطن (ن) — ن/ب ج کہاں خویش قریب (اور) کہاں ھیں ھمن

(۱۴۷) X ب کہاں سوں کہاں (ن) اور کدھر سوں کہاں — ن/ج سوں
کدبارے (ن ۱) سوں قسمت نے لائی (ن ۲) یہاں — ن۲/ج لے اس ن۱/ج ۂ رھے

(۱۴۸) عزیزاں ! میں عالم علی خان ھو ں
جوانی میں سگلیاں میں باجان ھوں

(۱۴۹) جوانی کا کچھہ دل میں غم نہیں مجھے
مرن اور جیون کا وھم نہیں مجھے

(۱۵۰ X) ب میرے دل کوں رحمت سوں شاباش ھے
جوانی میں جیو کا (ن) بڑی آس ھے — جیونا (ن)

(۱۵۱) جیوں وو بھلا جو انگے لاج ھے (ج)
وگر نہیں تو کیا تخت اور تاج ھے

(۱۵۲) جئے لگ ھو یاراں میرے سات میں (ن) — جو لگ ھیں یاراں میرے ھات میں (ب)
رھو وقت جن (جنگ) کے میرے ھات میں — اچھو وقت جنگ کے میرے سات میں

(۱۵۳) جدھر مار کا آ پڑ یگا وھاں (ن) — جدھر معر کہ آ پڑ یگا ندان (ن ب)
(ن) جدھر کے تدھر بار کرنا وھاں — ادھر ایک دل ھو کے کرنا ندان
وو ھر ایک ھو کر سوکرنا اوڑان (ن ب)

(۱۵۴) کرو مرد سی دل کوں مردا نگی — مردو ھو (ن ج)
ھے مشھور مردوں کی مردا نگی (ج)

(۱۵۵) * ھے یاراں (ن) کا کل جگ منے ننگ نام — ھے ہارے کا ال ھند میں نیک نام (ن ب)
میں منگتا خدا سوں یہی صبح شام — میں منگتا ھوں نت آبرو صبح شام

(۱۵۶) جو آیا ھے وو پھر کے مر جائیگا (ن) — جو آیا ھے سو پھر وہ مر جائیگا (ن ب ج)
نہ کچھہ سات لایا نہ لے جائیگا

(۱۵۷ X) ب خبر سن مقاماں کی ماں مہربان
تڑپنے لگے دیکھنے جیو پران (ن) — (ن) تڑپنا لگا جیو اور سب پران

(۱۵۸) (ب) ج) گئی شہر کے باھر جاکر ملی (ن) — گئی شہر کے باھرے جا ملی (ن ج)
نپٹ آرزو سوں الاے لگی — نپٹ آرزو سوں الایا گلی

(۱۵۹) کبھے ماں سوں میں پھر تم کوں کہاں پاؤنگا
اگر جنگ میں سوں میں پھر آؤنگا — اگر جگ میں سو باز پھر آوں گا (ن ج)

---

* ھے کی بجائے غالباً رھے زیادہ موزوں ھو گا

(۱۶۰) عبث پھر کے تصدیع کیسے تمن
پھر آتے تھے بیگی شتابی ھمن

(۱۶۱) نکو دل کوں تم بیقراری کرو
شہر کی طرف اب سواری کرو

(۱۶۲) کہی ماں نے نہیں چین دل کوں مجھے
میں دیکھوںگی پھر کر سو کس دن تجھے

(۱۶۳) کروں کیا مجھے صبر آتا نہیں
تیرے باج مجھ کچھ سو بھاتا نہیں

(۱۶۴) یک یک دن مجھے ھے اک اک سال کا
خدا کوں خبر ھے میرے حال کا

(۱۶۵) نصیباں میں کیا ھے نہیں کچھ خبر
کہ جیوناں ھوا ھے مجھے جیوں زھر

(۱۶۶) سلکا و سر و پا و دستار دیو
میرے روبرو جواب دھر سب کوں دیو

(۱۶۷) لے (ن) آئے سرو پا و برے مول کی
زر زر کشی و صاف لئی مول کی

(ن) بلا کر

(۱۶۸) مولاے لطیف خان (ن) عمر خان کوں
محمد و بیگ کوں او متھے خاں کوں

ن — لطف خان
ج

(۱۶۹) زاھد خان جہاں لگ آتھے اس پاس (ن)
پھر اے ... ...

ن — جہاں لگ تھے سردار تے روشناس
ج بلا بھیج کر سب کے آئیں پاس

(۱۷۰) سروپا و ھر یک کوں سو دینے لگے
سلام اور تسلیم لینے لگے (ن)

ن — بجالاے تسلیم، لینے لگے
ج

(۱۷۱) کہی بعد ازاں سب کوں سوگند ہے
کہ عالم علی سبکوں دلبند ہے

(۱۷۲) نمک کی شرط سب بجا لاو گے
سووہیں پھرکےسب مرتبا پاوگے (ن)

ن — تو دل سا چھہ پھر ... ...
ج

(۱۷۳) خدا تم سبھوں کا نگہبان ہے
بڑی بست دنیا میں ایمان ہے

(۱۷۴) کئے عہد ساریاں نے سوگند کہا
کہ مالک ہمارا دلوں کا خدا

(۱۷۵) جب لگ * تن منے جیوھے دمبدم (ن) ن * جلگ ہونا چاھئے
ن — جب لگ جیوتن سوں ہے اودم مھں دم
اچھیں گے حضوری میں ثابت قدم ج

۱۷۶ قد سوں قدم ہات سوں ہات جور ن کریں گے جب اک ہوگی دشمن کی موڑ
ن — (اڑیں گے کی جگھہ لڑیں گے اور جب
رھیں گےکہ جب ہووے دشمن کازور (ن) ج لک جگھہ جلگ ہونا چاھئے

(۱۷۷) ہمن دل سوں قربان ہیں جاں نثار
رکھو دل کوں صاحب تمہیں برقرار

(۱۷۸) کہی آفریں تم نمک خوار ہو
وفادار بےشک و غم خوار (ن) ہو

ن — دلدار
ج

(۱۷۹) کیے ماں کوں تسلیم دیئی سلام (ن)
کیے کوچ بیگی سوں بس والسلام

ن — وداع ہو پراں ماں کو کہنا سلام
ع (پراں کی جگھہ بڑاں ہونا چاھئے

(۱۸۰) چلے ہو کہ بیگی اوتر گھات کوں
لے کر لاو لشکر بڑے ٹھاٹ سوں

(۱۸۱) کیے ایدلا باد دیرا کیے
نس دیکھہ کر پور سستی کئے

(۱۸۲) کہے فوج اپنی کا کیا ہے شمار
جو دیکھے تو موجود چالیس ہزار

(۱۸۳) تھے اتنے شتر نال گنج ڈال بان
سنے کوئی شلک تو جاوے پران

(۱۸۴) تھے توپاں ایتے رھکلے بے شمار (ن)
....

ن — رھکلے و توپاں تھے اتنے سنگات
ج — کہے کیا نہیں کوئی کہنے کی بات

(۱۸۵) نظام الملک پر ہوا جب یقین
کہ اب جنگ ثابت ہے بے کاٹ وشین

(۱۸۶) کہلا کر جو بھیجا سلام اور دعا (ن)
لڑائی میرے سات کیا ہے نفا

ن — کہا یا سلام اور کہایا دعا
ج — کہ لڑنا مرے ساتھہ کچھہ نہیں نفا

(۱۸۷) کہے نہیں دکھن میں مجے صوبہ دار
لڑائی کا ست دیو دل سوں بچا

(۱۸۸) چلے جا و سیدھے ہندوستان کوں
چچا پاس اپنے تم آسان سوں

(۱۸۹) میں لڑکے سوں کیا تیغ بازی کروں
بھلا ہے جو کچھہ کارسازی کروں

(۱۹۰) سنا جب خبر سید عالی جناب
کہا دیو بیگی سو اس کا جواب

(۱۹۱) ننھی عمر ہے پن میں لڑکا نہیں
کسی بات کا دل میں دھڑکا نہیں

(۱۹۲) میں سید ہوں تم دل میں کیا لائے ہو
میرے ملک پر چلکے کیوں آئے ہو

(۱۹۳) مجھے عار ہے عار انکار ننگ (ن) — ن/ج　مجھے عاری عار ہے عار ننگ
چلے آو بیگی نہ لاؤ درنگ

(۱۹۴) اگر لاکھہ دو لاکھہ فوجاں ملیں
کہ (جس سے) طبق اسب زمیں کے ھلیں

(۱۹۵) میں وہ شخص ہوں جو تلن ہار نہیں
شجاعت میری کس پر اظہار نہیں

(۱۹۶) اگر ھے حیاتی تو غم نہیں مجھے
اگر موت ھے تو وھم نہیں مجھے

(۱۹۷) جو مارا ھے قسمت میں میرے قلم
نہووے زیادہ و ناں هووے کم (ن) — ن　نہو کا زیادہ نہووے کا کم

(۱۹۸) رضا پر میں راضی ہوں جوھے رضا (ن) — ج ن/ج　میں راضی رضا پر ھوں جو کچھہ رضا
وھی ھوئیگا جو کریگا خدا　　وھی خوب ھے جو کرے گا خدا

(۱۹۹) میں راضی رضا پر ھو باندھا کمر
رکھا ھوں میں القصہ حق پر نظر

(۲۰۰) خدا کا کرم مصطفے کی پناہ
میں رکھتا ھوں اس بات پر سب نگاہ

(۲۰۱) بہر حال لے فوج اُتر یا ندی (ن) — ن/ج　بہر حال اور فوج اتری ندی
پکڑ دل میں دعوی وو دندی بدی　　پکڑ دل ملے دنہ دعوی بدی

(۲۰۲) ایدھر سوں یو لشکر اودھر سوں وو فوج
پڑی آکر جس میں سمندر کی فوج (ن) — ن/ج　پڑے ا لڑک جوں سمندر کی فوج

(۲۰۳) تفاوت رہا کوس دو چار کا
حکم تب ھوا اس جو کرتار کا

(۲۰۴) حکم تب ہوا صاحب ذوالجلال (ن) — ن/ج نپٹ داب آبي لگے تب ابہال
برسنے لگیا رات دن برشگال

(۲۰۵) کتیک دن سو گزرے اسی بات کوں
دیا کوئی خبر آ ادھی رات کوں

(۲۰۶) صبا جنگ ہوئیگا یو ہے خبر
یہی ذکر لشکر میں ہے گھر بہ گھر

(۲۰۷) کہا جھوٹ ہے کر کیا اعتبار (ن) — ن/ج کہا جھوٹ ہے یا نہیں کیا اعتبار
ہمارے ہیں جاسوس ہر تہار تہار ہمارے ہوں جاسوس ہوي ہوشیار

(۲۰۸) نجانے کہ جاسوس و قاصد تمام
ہوے ہیں نظام الملک کے غلام

(۲۰۹) تھی تاریخ چھٹی ماہ شوال کی
بڑی نحس تر سخت جنجال کی

(۲۱۰) اتھا روز ایتوار کا نا بکار
گھڑی تھی وو مریخ کی آشکار (ن) — ن/ج اشکہار

(۲۱۱) تھي ساعت اوساعت بہت خوں فشاں
ستارہ زحل کا اتھا بے گماں

(۲۱۲) صبح کے وقت سید نیک کام
اوٹھا بولتا ہوا یے خوش کلام (ن) — ن اٹھا اوز لگا بولنے خوش کلام

(۲۱۳) کہو کیا خبر آج ہے دوستاں
اُٹھا بول بھکی سے عباس خاں

(۲۱۴) خبر جنگ کی آج ہے تہار تہار
یہی غل ہے سب فوج میں آشکار

(۲۱۵) سو جاسوس ایسے مہں آیا شتاب
پسینے میں دستا ہے جیوں غرق آب

(۲۱۶) کھڑا ہوکے بولیا کہ اے دستگیر
نظام الملک فوج لے کر کثیر

(۲۱۷) نقارا کرایا ہے اے قبلہ گاہ
حکم کر جو تیار ہووے سپاہ

(۲۱۸) وو عالم علی سید مہرباں
شجاعت کا ظاہر ہے جس میں نشاں

(۲۱۹) سنا سوں تبھہ بکتر منگا یا شتاب
ہوا مستعد خاں عالی جناب

(۲۲۰) کہا لاو میرا جو کچھہ ساج ہے
مجھے کام دشمن ستی آج ہے

(۲۲۱) کٹاری و نیزہ و شمشیر لاو
جو ترکش ہیں خاصے سو بیگی منگاو

(۲۲۲) منگا و میرا خود توڑا منگاو
میرے خاص گھوڑوں کوں پاکھر لگاو

(۲۲۳) منگا او کمانان میری سات کیاں
کہ ہیں رات دن وو میری ہات کیاں

(۲۲۴) منگا او سپر آہنی پھول دار
کہ رہتے ہیں وو نت میرے گلے میں ہار

(۲۲۵) منگا او میرا با نک خنجر ساگاو
میری خاص پالکی کوں جھالر لگار و

(۲۲۶) میرے ھاتی کوں جاکے صندل لگاؤ
وقت لئی ہوا ھے درنگ مت لگاو

(۲۲۷) کیا جا غسل کر اوٹھایا دو ھات
کہا یا نبی سرور کائنات

(۲۲۸) تمن کوں میری آج یو لاج ھے
مدد کوی تم بن نہیں آج ھے

(۲۲۹) کمربانده بہاتا اشکوں پنہاں (ن)
لگیا پونچھنے سوکوں دے دے رومال

(۲۳۰) کہا لا وحقا دو دم ذوق ھے
کہ حقے سوں ھمنا بڑا شوق ھے

(۲۳۱) خبر دار اتنے میں لایا خبر
کہ بیٹھے ھو کیا سید شیر نر

(۲۳۲) نظام الملک فوج کل سات لے
تمہارے امیراں کے دل ھات لے

(۲۳۳) کیا ھیکا سب فوج بندی سنبھال (ن)
فتح دیوے تمناں کوں رب ذوالجلال

(۲۳۴) اگر نہیں خبر کس کوں کچھ علم غیب
سبھوں کا سودستا ھے دل (ن) پرفریب

(۲۳۵) سنا سوئیچھ قاصد کوں جھڑکا دیا
حقا سامنے تہا سو سرکا دیا

(۲۳۶) کہا لوگ میرے وفادار ھیں
میں جاکر سمجھتا نہیں یار ھیں

ن/ج: کمربانده هتیار اس کو سنبھال

ن/م: کہا تم اوپر فوج بندی سوں چال

ن/م: بالکل قریب

(۲۳۷) سبھی ایک جیو ہیں و سب ایک تن
شجاعت ملے ہینگے یک یک رتن

(۲۳۸) یو دانے تسبیح کے میں امام
رهیں ایک هو کر سو هل مل مدام (ن)

(۲۳۹) میرے سات کیونکر جدائی کریں
مجھے چھوڑ کیوں روسیاهی کریں

(۲۴۰) لڑتایا هوں اون پر یو سب ملک مال
نظام الملک کیا کر یکا نہال

(۲۴۱) اوتھا بول سب کوں سواری کرو
دنیا سہل هے دل سوں یاری کرو

(۲۴۲) رفاقت کرو زندگی سہل هے (ن)
شرافت میں نامردی جہل هے

(۲۴۳) خدا کے کرم کا هوں امیدوار
رکھے لاج میری سو پر ور دگار

(۲۴۴) میں سید هوں اُن دل، یں کیا لائے هیں (ن)
میرے گھر پہ ناحق خلل لائے هیں

(۲۴۵) خدا شات انصات سازو تمیں
فتح هے همارے سو جانوں تمیں

(۲۴۶) یکا ایک اللہ کار (ن) پیدا هوا
نظام کا اشکر هو یدا هوا

(۲۴۷) هوی هالک لشکر میں چاروں کنی
زمیں تهر تهری اور لرزا گئی

ن ـــ رهیں ایک هاگے میں هل مل مدام
ج

ن هماسا ست کرو زندگی هے سہل
ج شرافت میں ست لیو اپنے خلل

ن میں سید هوں او مجھ پہ چل آے هیں
ج مرے گھر پہ ناحق بلا لائے هیں

ن ـــ هو نمو کار
ج

(۲۴۸)کھڑا ہو رہے ہودے کماں کوں سنبھال (ن)
کہا جوش میں یوں انکھیاں کرکے لال

(۲۴۹)نپٹ کر کر شوخی یو چل آے ہیں
سبھی کہا مگر سوم کا پاے ہیں

(۲۵۰)زمیں دھس کے غرقاب ہو جاے گا
گگن توٹ کر سر اُپر آوے گا

(۲۵۱) لڑوں یا مروں یار فوجاں چلاؤں*
میں عالم علی لہو کی ندیاں بہاؤں

(۲۵۲) بحق خدا وند پروردگار
جب *الگ تو جیو ہے کروں کارزار

(۲۵۳) ہراول کیا ہے غالب خان (ے)کوں
دیا سا تھ سلیم خاں متھے خاں کوں

(۲۵۴)دلیل خاں، مسعود بیگ مرزا علی
جہاں الگ تھے سردار جو دھا بلی

(۲۵۵) کہا تم ہراول کے سب سا تھ جاؤ
ہراول کوں ان سات بیگی ملاؤ

(۲۵۶) امیں خاں کوں بولے کہ سن ایو بات
تمہیں فوج کا مل لے جاو سنگات

(۲۵۷) چلو مہربانی سوں سیدھی طرف
تمہاری شجاعت میں کچھ نہیں حرف

(۲۵۸) نہیں کوئی ثانی تمہاری مثال (ن)
یہی بات تحقیق بے قیل و قال

ن — کھڑا ہو جلدی سنبھال نکال
ج

* نسخہ (ج)میں چلاؤں اور بہاؤں کی جگہ چلاؤ اور بہاؤ ہے اور دوسرے مصرعے میں میں کی جگہ تو ہے۔

* تینوں نسخوں میں جب الگ ہے لیکن میری راے میں جلگ ہونا چاہئیے۔

ن — ملور خاں ن — متہور خاں
ج ج

ن — تمہیں مرد دکن میں ہو بے مثال
ج

(۲۵۹) امیں‌خاں کہے رہ میں دستا خلل (ن) — کوڑے ہو کے رہلے ہوں دستا خلل (ج)
گیا دور ہمارا ہراول نکل

(۲۶۰) مدد کو ہو آگے تو کچھ کر دکھاؤ
ہو بےشک اپس دل میں کھاندا چلاؤ

(۲۶۱) ٹلوگے تو سب فوج ٹل جائیگی
بلا سمجھہ اکیلے اوپر آئیگی

(۲۶۲) وہی ہو ئیگا جو ہے اب کی رضا (ن) — میں ہوں سب عزیزاں ستیں باوفا (ب)
کہ میں ہوں عزیزاں میں سینے صفا

(۲۶۳) عمرخاں کوں بولے رہو دست چپ
رہتے کو لے فوج کوں سات سب

(۲۶۴) تماری میری کچھہ جدائی نہیں
تمہیں خویش ہو کچھہ سپاہی نہیں

(۲۶۵) تمہاری میری شرم سب ایک ہے
کروگے وہی جس میں جو نیک ہے

(۲۶۶) دنیاں میں دوبارا کچھہ آنا نہیں *
یو دنیا جنم لگ تھکانا نہیں

(۲۶۷) اگر ہے شرم سو یچ جینا بھلا
وگر نہیں زہر کھا کے مرنا بھلا

(۲۶۸) خبردار ہو دل میں کچھہ ڈر نہ لاؤ
کہ جیوں شرط ہے خوب ہاتاں چلاؤ

(۲۶۹) لئے سات اپنے سوہانے (ن) حشم — رہاسو شم (ن) (ج)
چلے خوش ہور کھہ (ن) رکھہ کے یک یک قدم — آہستہ (ج)

* یہ شعر اس سے پہلے آچکا ہے صرف تھکانے اور ٹھانے کا فرق ہے نسخہ (ب) میں یہ شعر اس مقام پر نہیں نسخہ (ج) میں اس طرح ہے۔
دنیا دوپہر کی یہ جوں چھاؤں ہے
جنم لگ کسی کا نہ اب ٹھاؤں ہے

(۲۷۰) سو ایسے میں آکر کہا کوی سوار
ہر اول یو بھاری پڑی ہے جو بار (ن)

— ہراول پہ صاحب کے ہے روز کار
ج

(۲۷۱) رہی فوج جاں کی تہاں سب تھتک
(۲۷۲) چلے دیں جدہر کے تدھر سب تھک
(۲۷۳) ہزاراں سوں جدھا آگ تنگ * (ن)
سنا ارر چلا جیوں دیوے پر پتنگ

ن
— پڑا شو رجودھا بڑا پر تھتک
ج سنا اور چلایا دیسے بجای کڑک

* ایسا تسنگ

(۲۷۴) جو ہوتا اگر رستم افراسیاب
تو ہرگز نکرتا وہ ایتا شتاب
(۲۷۵) پڑیا توت ایسا ہوا سار کڑک (ن)
کسی بت کا دل منے نہیں تھا دھڑک

ن
— پڑیا ترت اسماں سوں بجای کڑک
ب ج کسے ما جنر جو سنبھالے دھڑک

(۲۷۶) اوٹھا فوج لشکر کا گرد و غبار
کہ جانو قیامت ہوا آشکار
(۲۷۷) ہوا شور و غل غلغلا فوج میں
سیادت کے دریا رہے موج میں
(۲۷۸) مقابل ہوا اور کہا ھا نک سار
وطن ہے سپاہی کا کھانڈے کی دھار
(۲۷۹) عجب دن عجب وقت ہے آج کا
بھلے سرد کی قدر معراج کا
(۲۸۰) کہا کاں ہے سردار اس فوج کا
جو دیکھے تماشا میری موج کا
(۲۸۱) X تمہارے بن کامپچ اڑاں ہے (ن)
تلوست یو سرداں کا میداں ہے

ن
— ملیں ہم و تم ہم کو ارمان ہے
ج

(۲۸۲) مجھے بان گولے سوں کوئی (ن) مت ڈراؤ
نشا ہے تو ہووے سوں ہودا بھڑاؤ

ن — تم
ج

(۲۸۳) لگا مارنے تیر گولی چلاؤ (ن)
کہا فوج کوں سب کی گودی اٹھاؤ

ن — لگامارنے تیر کر کوں پیا
ج دیا فوج یکبار گی سب ہلا

(۲۸۴) چلانے لگے تیر پر تیر کوں
ہزار آفریں مرد (ن) کے دھیر کوں

ن — مرد رنڈھیر کوں
ج

(۲۸۵) گزر جاے بکتر و چلتہ کوں پھوڑ
زرہ کی کڑیاں ڈھال کے پھول توڑ

(۲۸۶) جسے تیر ماریں ترازو کریں (ن)
سکت کیا تھی جو زور بازو کریں

(۲۸۷) ہوا دوگھڑی لگ بڑا رن کھنڈل (ن)
چلی فوج موں پر سے ساری نکل

ن — ہوا دوگھڑی لگ ہزاروں کا تھل
ج

(۲۸۸) جو ہودے کے موں پر سے سب ٹل گئے
پھرا پیٹھہ یکبارگی چل گئے

(۲۸۹) نہیں ہے عزیزاں یو عالم علی
مگر آج حاضر ہوے ہیں علی

(۲۹۰) الٰہی یو کس نور کا نور ہے
ہواں یو شجاعت سوں معمور ہے

(۲۹۱) کیا تب حکم بیگ نوبت بجاؤ
رکھو دل قوی اور گھوڑے چلاؤ

(۲۹۲) رہے کیوں کھڑے جا بجا تہار تہار (ن)
نھنے اور بڑے سب پیادے سوار

ن — رہو دیوں کے تیوں ہو کھڑے تہار تہار
ج

(۲۹۳) چلا کوئی مشرق چلا کوئی غروب
چلا کوئی شمال اور چلا کوئی جنوب

(۲۹۴) بلانے لگے فوج کوں آورے
نتم ہے فتم کوی مت جاو رے

(۲۹۵) پھرو رے پھرو ننگ سوں دور ہے
نموک کھا کے بھاگے سو مزدور (ن) ہے

ن — مقہور
ب ج

(۲۹۶) یو سن کر کہا سید پاک باز
اتا بس ہے ہمنا مدد کار ساز

(۲۹۷)X جو بھاگا سو کیا اس کی پھر آس ہے
یہ مرنا شہادت مجھے خاص ہے

(۲۹۸) کھڑا رن میں سید اپس ذات سوں
گئی فوج ساری نکل ہات سوں

(۲۹۹) سہاوت کوں بولا کہ ہاتی چلاؤ
کہا تب غالب خاں کوں بھگی بلاؤ

(۳۰۰) ہزار آفریں خان عالی قدر
تماری ہے مجھہ پر مہر کی نظر

(۳۰۱) میں اس فوج کوں ازمایا نہیں
کیت اون کے دل کا میں پایا نہیں

(۳۰۲)دغا دے کے مجکوں نکالے شتاب
قیامت میں کیا دیں گے حق کوں جواب

(۳۰۳)محبت کی کچھہ کس منے باس نہیں
دیکھو دوستاں کوی میرے پاس نہیں

(۳۰۴) بہر حال دنیا یہ گزران ہے
لگا رکھہ اب موت سوں دھیان ہے

(۳۰۵) غالب خاں نے بولے کہ سیدانام (ن)
نکو کچھہ کروفکراب دل میں خام
ن — اسام ب ج

(۳۰۶) جب لگ دم میں دم ہے کریں کارزار (ن)
رہیگا جو عالم ملے یادگار
ن — لڑیں جانثار ج

(۳۰۷) سہر خان (ن) غوری نے بولیا نواب
ن — ناصرخاں غوری کوں بولے نواب ب — ناصرخاں ن ج

ملے مل (ن) گے سب یو خا نے خراب
پلے پل / تلے تل

(۳۰۸) کیا شیخ اکبر نے (ن) آکر عرض
ن — شیخ فیض ب — فیضو ن ج

کہ ... ر نان ہمیں اب ہوا ہے فرض

(۳۰۹) مقرر ہوا ہے جو تقدیر سوں
مٹا نا سکے کوی تدبیر سوں

(۳۱۰) نواب اب رہا شہر کا دیکھنا
لڑای نہیں اب ہوا پیکھنا

(۳۱۱) اسی گفتگو میں کہ تھا یو بچار
چہری فوج سید کی کل ایکبار

(۳۱۲) پڑا مار کا * تیر اور بان کا
پڑا رن کھنڈل خوب گھمسان کا

* معرکہ

(۳۱۳) کئے قصد ایک دل ہو اہل غرور
کہ چڑیا ہے جیوں آکے دریا کوں پور

(۳۱۴) ہزار آفریں تجکوں عالم علی
کہوں سور ما بیر یا کوی بای (ن)
ن — کہوں سور ما بیر جو دھا بلی ج

(۳۱۵) مہاوت پڑیا فیل سیتی نکل (ن)
لگا پانوں اپنے کوں ڈھکلنے اگل
(۳۱۶) تہورخاں (ن)،اوںاتنے میں گولا لگا
(لگا سوپچ ہاتی اوپر تے ڈھلا (ن)
(۳۱۷) گریا سور چھل ہات سوں چھوٹ کر ج
رہا دیکھ سید لہو کھونٹ کر
(۳۱۸) رہے تھے کم و بیش کل سو جواں
ہوے گرد سید کے سب خونفشاں
(۳۱۹) اپے تہا ہتی تہا و یک تہا خدا (ن)
ہوے شاہ سوں سب سنگا تی جدا
(۳۲۰) دو ترکش لے ایسے میں خالی کیا
سگل تن کو زخماں سوں جالی کیا
(۳۲۱) لگے تیر بھرنے اسی تیر کوں
چلا کر بھرا کر بڑی ڈھیر سوں
(۳۲۲) لگا وے جسے تیر کھہ کر کماں (ن)
وو لاگے جسے سو کئے لا مکاں
(۳۲۳) یکا یک لگے موں اوپر پنج تیر
ہوے پارگالاں سوں پردے کور چیر
(۳۲۴) لیا کھینچ کر اور کیا خوب زور
آہستہ ستیا تیر پیکاں سرور (ن)
(۳۲۵) X لگے تیر پر تیر اوس شیر کوں
چلا وے پورا کر اُسی تیر کوں

ن/ج بڑا چوٹ آسن سوں مہاوت نکل
لگا پانوں ہاتھی دھکا یا اگل
ن/ب عنایت ن/ج غیاث خاں
ن/ ڈھکا
ن/ج ہتی تہا وہ تہا آپ یا تہا خدا
ن/ب لگا کر چلے کوں بھی کھینچے کماں
لگا وے جسے تو نر ہے کچھ نشاں
(لگا وے جسے سور بھی الا ساں ج)
ن/ج رہا سو ستیا پانچہ کہادا سررو

(۳۲۶) لگا تیر چلے کون کھینچی کماں
لگا و ے جسے سب کئے وو جہاں
(۳۲۷) لگا تیر پھر آ بنا گوش میں
ستیاکاڑبھی اس کوں آ ہوش میں
(۳۲۸) نزک آکے اس فوج کا کوئی امیر
لگا یا پیشانی پر آ سخت تیر
(۳۲۹) نکا لے تو ہر گز نکلتا نہیں
کیا زور پر زور چلتا نہیں
(۳۳۰) ستیاچ اور بھار کاڑ وھاں کا وھاں
دیا جواب اوس تیر کا در زماں
(۳۳۱) پڑا آکے گھوڑے سے جب کھاکے تیر
کہا کیا امیروں میں تھا بے نظیر (ن)
(۳۳۲) سو ایتنےمیں کوئی اورھودے سوار
و و آ سامنے دل کوں کر استوار
(۳۳۳) لگا یا اوسے تیر ایسا شتاب
جو دے نا سکا پھر کر اوس کا جواب
(۳۳۴) بھی ایسےمیں آ کوئی نیزہ سنبھال
غروری سے سینہ پو مارا نکال
(۳۳۵) X جو دیکھا اسے تیر مارا اچھل
پڑا پھر کر گھوڑے اوپر سے نکل (ن)
(۳۳۶) زرا مورچھا کھاے گردن پر آے
ھاتی کوں اشارہ سوں اگے چلاے

ن ج — کہا کیا جوانمرد تھا بے نظیر

ن ج — پڑا نیچے گھوڑے اوپر تیں نکل
دکھا سرنہہ جھکاوے نکا ھوں پھراے
ھتی کو اشارت سوں انگے چلاے

(۳۳۷) جو ایسے میں کوی پیرزادہ فقیر
بہوت خو بصورت وصاحب نظیر

ن مت مانگ هاتی میں صاحب سریر
ج نیت بانک پتے موں تھا بے نظیر

(۳۳۸) هتی هول آکر هوا رو برو
که جانو نظام الملک هیکا تو

(۳۳۹) که جلدی سوں دو تیر ایسا جڑا (ن)
سو هودے میں بے هوش هوکر گرا

ن — ج یکا یک اسے تیر ایسا جڑا

(۳۴۰) زخم پر زخم جب لگے بے حساب
هوا سست (ن) تب سید عالی جناب

ن — ب تنگ

(۳۴۱) هر آن آ پڑی مار تلوار کی
بڑے زور کی اور بڑے مار کی

(۳۴۲) عزیز ان گئے چھوڑ سارے نکل
نمک کی شرط نا رکھے گئے نکل (ن)

ن — ب ج نه سید هے بغل نه داویں بغل

(۳۴۳) جدھر دیکھتا هے اودھر مار مار
کہا جو رضا پاک پروردگار

(۳۴۴) ستیا هات همت سوں شمشیر پر
سو سارے دیکھو جھٹکه هودے اوپر (ن)

ن — ب تو هر کر لگا جس کے هودے اوپر

(۳۴۵) لهو لال موں کے اوپر بهه چلا
اودھر کا اِدھر جا بجا بهه چلا

(۳۴۶) لئے تھال موں پر اپس کو چھپاے (ن)
ایدھر کا اودھر مار کوں موں چکاے

ن — لئے تھال هودے کو ڈنڈیاں کوں کاٹ
ج لگے جہاں تہاں کھولنے جو کیاٹ

(۳۴۷) ستے آدے هودے کو هودوں سے کھیر (ن)
هوا تب هراساں کیا دل دلیر

ن — لئے آکے جرد هن نے هردے کو گهیر
ج رکیا دیونات بہت هیا دل دلیر (ج)

(۳۴۸) سبھی مغل اور بان کے تنداں کوں کاٹ (ن)
لگے ھودے پر چڑھنے رسیاں کوں کاٹ

ن/ب — ستے تھاں ھودے کی تنتیاں کوں کاٹ
لگے جہاں تہاں کھول رھے چواہ ھات

(۳۴۹) دو ھاتاں سے تلوار بازی کری
مگر کربلا پھر کے تازی کری

(۳۵۰) سو ایسے میں ایک آکے گولی لگی
و ۲ گولی نہیں بلکہ ھولی لگی

(۳۵۱) کہا کوی نفر ھے تو پانی پلاو
کہا آبدار ھو تو بیگی بولاو

(۳۵۲) نہ پانی اتھا وھاں ناتھا آبدار
لگیا وو ھیں لڑنے کیتئی پیاس مار

(۳۵۳) جسے ھات مارے کرے چور چور
جب لگ جیو میں جیو تھا تن پر نور (ن)

ن/ج — جب لگ تن میں جیو تھا و ۲ تب لگ ھور

(۳۵۴) انکھیاں پرتے لہو چلیا بے شمار
لگیا پونچھتے پونچھتے اپنی رومال کاڑ

(۳۵۵) بونداں لہو کے سوں پر پو نچھا تمام (ن)
رھا دیکھنے سے وو سید انام

ن/ج — بلہ ھی سنہ پہ جالی لہو کی تھام
رھا دیکھنے سوں و ۲ سید امام

(۳۵۶) سنو اے عزیزان روشن ضمیر
لگے ایک تن پر سوچھتیس (ن) تیر

ن/ج — چالیس

(۳۵۷) تھے نو وار نیزے و تلوار کے (ن)
وھم نا کیا کچھ اس آزار کے

ن/ب — اتے وار نیزوں کے تلوار کے

(۳۵۸) فوارے لہو کے او چھلنے لگے
نکل بہار ھودے سوں ڈھلنے لگے

(۳۵۹) اوٹھے ایک تن پر هزاروں کے غول
هوا مار کے موں جدا سر سوں خول
(۳۶۰) لگیا جب سینے آ کے گولا ندا ن
نکل روح تن سوں گیا جیوں بوان
(۳۶۱) جگر ٹوٹ لہو هو کر آیا اوبل
چلے حیف تن پر تے گردن پے ڈهل
(۳۶۲) مغل آ چڑھے ٹوٹ هود ے اوپر
موئے پر لگے مارنے پھر خنجر
(۳۶۳) د یے ڈال هوده ے تلے خان کوں
که دل سے پڑے لال بے جان کوں (ن)
(۳۶۴) نه جیوتها نه کچهه روح تهاکچهه نشان
نه د م تها نه کچهه نور تها جیو بجان
(۳۶۵) و و اقبال ناصر کے گهر کا غلام
هوا چور زخماں سے لہو کے تمام
(۳۶۶) سو بے هوش هو کر پڑیا کهیت میں
اوٹها یا سپا هی افسو س میں
(۳۶۷) توی تاریخ چهٹی ماه شوال کی (ن)
بڑی سخت تر نحس جنجال کی
(۳۶۸) خبر هوئی شهر میں سواس حال سوں
لئے مار کر جنت کے اس لال کوں
(۳۶۹) محل میں کیا جا کے کوی یو خبر
که تل مل (ن) هوا آج سارا شهر

ن/۴ — سو اُس کوں بھرے لعل بےجان کوں

ن/۳ — تهی تار یخ نو یں جو شوال کی
هو ی شهر میں خبر اس حال کی

ن/۳ — تل اوپر هے

(۳۷۰) لئے مار عالم علی خان کوں
سیادت کے مسند کے سلطان کوں
(۳۷۱) لئے مار لشکر آوارا ھوا
امامت کے گور کا اندھارا ھوا
(۳۷۲) گیا (ن) جگ ستی وو مبارک بدن
علی کے خزانے کا خاصا رتن
(۳۷۳) اوتھی ماں نے افسوس کھا آہ مار
کہی مہر خاں کوں کہ اب کیا بچار
(۳۷۴) زمین سخت اور آسمان دور ھے
ورونا دیکھو جان کل چور ھے
(۳۷۵) لے جانے کی بیگی اوتاولی کئے
لے جاکر دیکھو کیا خرابی کئے
(۳۷۶) ھوا غل بڑا کل محل میں تمام
جو کھانا و پانی ھوا سب حرام
(۳۷۷) کہی ماں نے فرزند میرے نونہال
ھوا دیکھنا مجکوں تیرا محال
(۳۷۸) کہاں ھے وو فرزند عالم علی
تبورے درکھسورسر پانوں لگ سیں جای
(۳۷۹) فلک بے مہر نے کیا کیا ستم
گنوایا میری دھکدھکی کا پدم
(۳۸۰) اوجالا میرے جیو کے ایوان کا
ستارا میرے ملک میدان کا

(ن) چھپا / ج

(۳۸۱) میرے زیب زینت کا تھا گل گلاب
توڑا کر کیا سب چمن کوں خراب

(۳۸۲) ہوا عیش آرام میں کیا خلل
عجب جیوتن سوں نجاوے نکل (ن) $\frac{ن}{ج}$ گیا مت لگوں تب رہے کا یہ عمل (ج)

(۳۸۳) ہزار آرزو اور ارمان سوں
میں پائی تھی عالم علی خان کوں

(۳۸۴) کہاں او کہاں اوس کی خانی گئی
سگل خاک میں اوس کی جوانی گئی

(۳۸۵) کہوں کیا جو پوچھینگے مجکوں نواب
کہاں ہے وو فرزند مبارک نقاب

(۳۸۶) اپس ہات سوں کیوں گنوائی اوسے
نہنی عمر میں کیوں کٹائی (ن) اوسے $\frac{ن}{ج}$ کہپا ئی

(۳۸۷) سنانا کیئے کیوں تم اس بات سوں
گنوائی بہادر میرے ہات سوں

(۳۸۸) نہ کھاوے نہ پیوے روے زار زار
میرا جیو بیت بن یوں ہے بے قرار (ن) $\frac{ن}{ج}$ مچھی جیوں تڑپتی ہے تیوں بے قرار

(۳۸۹) پکڑ ہات کوں میں نکالی تجہے
پھر آ کر تو مکھ نہیں دکھایا مجہے

(۳۹۰) کہے تھے فتح پا کے گھر آئینگے
یو صورت نورانی کوں دکھلا ئینگے

(۱۹۱) کہ سہراں روپے بھر کے خیرات کی
خبر کچھ نہ تھی مجکوں اس بات کی

(۳۹۲) کہیں سدہ میں آوے کہیں سدہ گنوائے
نینا ں سے انجھو تھال موتی بہائے
(۳۹۳) ہوے خود کہی تلملا ھانک مار
اے حافظ ! اے ناصر ! اے پرور دگار
(۳۹۴) پکڑ ھات سونپی تھی یارب تجھے
سبب کیا سو پھر نا دکھایا مجھے
(۳۹۵) تھی امید یہ دل میں دیدار کی
میرے فوج لشکر کے سردار کی
(۳۹۶) پھر اون کی خبراں میں خیرات کی
خبرکچھہ نہ تھی مجھہ کوں اس بات کی
(۳۹۷) ارے کوئی اس غم کی دارو بتاؤ
مجھے اس عزا باں سوں بیگی چھڑ ؤ
(۳۹۸) ھو بے ھوش سو بار یک بار بار
انکھیاں تے لہو روے وو زار زار
(۳۹۹) محل کے جتے لوگ زیر و زبر
بڑے حیف کھا کھا کے ھو بے خبر
(۴۰۰) تیرے باج پیارے اندھارا دسے (ن) ن کہیں کیوں محل میں اندھارا دسے
خدا باج پیارا نہیں کوئی دسے ج خدا باج کوئی نہیں کہیں اب کسے (ج)
(۴۰۱) نہ فریاد کوں کوئی نہ کوئی داد کوں
بھر حال جانا دولت آباد کوں (ن) $\frac{ن}{ج}$ گئے ھر طرح دولت آباد کوں
(۴۰۲) شہر ملک تھا جس کے فرمان میں
سو وو جا پڑے کوہ و ویران میں

(۴۰۳) ہزاراں سپاھی ہزاراں غلام
کریں آ کے تسلیم ھر صبح شام

(۴۰۴) ہزاراں سوں گھو ڑے ہتھی بے شمار
ہزاراں چھڑی دار چیلے ہزا ر

(۴۰۵) ہزاراں امیراں رہیں نت مدام
چھہ صوبوں میں عزت تہا زبس تمام

(۴۰۶) نہیں فکر کچھہ مجکوں سنسار کی
تھی امید واری سو دیدار کی

(۴۰۷) گیا لوٹ میں مال اسباب سب
یو قصا نہیں ھے حکایت عجب

(۴۰۸) نہ تھا زور کس کوں نہ کس کوں مجال (ن)
سکے مار دم اور کرے کچھہ سوال

ن — نہ تھا کس کوں زو ر نہ کس کوں مجال (م)

+ ج (۴۰۹) چھڑاوے لے جا پل سوں افلاک پر
ستے پل منے خاک کا خاک پر

+ ج (۴۱۰) تلا رام دیوان کا یتھہ قدیم
اتھا ساتھہ اس دائے میں خدیم

(۴۱۱) پرندے کوں طاقت نہ پنکھہ مارنے
نہ یارا تھا وھاں کس کوں بچارنے

(۴۱۲) جو بولے بچن سوے دستور تھا
کرم رات دن جن کا مشہور تھا

(۴۳۱) انگے حوض لبریز اور گل بہار
صدر مسندان جا بجا تھار تھار

(۴۱۴) سوایسا ستم ہو ستم ھاے ھاے (ن)
ارےیو دنیا بھی رستم کوں کیا تیار (؟)

(۴۱۵) کہاں وو نقارے دما مے نشان
کہاں وو عرابا کہاں توپ بان

(۴۱۶) کہاں وو صلابت کہاں وو حکم
کہاں فوج لشکر کہاں وو حشم

(۴۱۷) کہاں ھے وو دولت کہاں ھے وہ مال
عجب قدرتاں ھیں تیری ذوالجلال

+ ج (۴۱۸) کہے مل اپس موں اپن اھل راز
سیادت کا نادق ڈوبا یا جہاز

+ ج (۴۱۹) نبوت کی انگشتری کا نگین
جگر گوشۂ فاطمہ با لیقین

+ ج (۴۲۰) پڑا گرد لو ھو ملے لال ھو
گرا ایکلا رن موں بے حال ھو

+ ج (۴۲۱) ننھی عمر موں کیوں کتے پایا اُسے
لے جا کر دیکھو دکھ دکھایا اسے

+ ج (۴۲۲) نہ آرام دل کوں نہ خاطر قرار
جگر جل دھڑکتا ھے جیسے انگار

+ ج (۴۲۳) بھئے لگ نہ اب کس تیں یاریں کریں
یہ غم دل موں رکھ بردباری کریں

+ ج (۴۲۴) دنیا دغا باز فانی مقام
ھے دل باندھنا اس موں بالکل حرام

ن سو دشمنا یہ کیا کیا ستم ھاے ھاے
ج یہ دنیا ھے ایسے کوں کیا کوئی نہ پاے

(۴۲۵) جسے پائداری سو نایاب ھے
یو دنیا دیکھو سر بسر خواب ھے
(۴۲۶) یو غم جگ منے (ن) آشکارا ھوا
جگر توٹ عالم کا پارا ھوا
(۴۲۷) ھزار آہ و افسوس ھے دوستاں
چھپا حیف دنیا سوں وو نوجوان
(۴۲۸) عجب سید عالی نسب خان تھا
فراست کے دفتر میں سلطان تھا
(۴۲۹) کہاں ڈھونڈنا اب کہو خان کوں
فراست کے موتی و مرجان کوں (ن)
(۴۳۰) قاعدہ میں قاعدار عالی قدر
سیادت کے رکھہ نام اوپر نظر
(۴۳۱) گیا قلعہ میں اور کہا آشکار
میں مومن مسلماں ھوں دین دار
(۴۳۲) تمہاری میری لاج سب ایک ھے (ن)
میرا بول تمنا ستی نیک ھے
(۴۳۳) رفاقت تمہاری ھے جیو کے سنگات
میں جاگیر سوں منصب سے دھویا ھوں ھات
ج-ا- (۴۳۴) جو کچھہ ھو تمہارا کرے کا سو ھو
میں بیٹھا ھوں سب بات سے ھات دھو
(۴۳۵) رکھوں دل کوں صاحب تمہیں برقرار
لڑونگا جو چل آئے یک لکھہ سوار

ن/ج سوں جب

ن/ج رسالت کے موتی پریشان کوں

ن/ج تمہاری میری لاج اک لاج ھے
مرا قول تمنا ستی اج ھے

(۴۳۶) جو کچھ ہو تہا را سو ہو ٹہکا وو
میں بیٹھا ہوں سب سوں ہات دھو

(۴۳۷) ہ لا سا د یا او ر کہلا یا سلام
د یا خوب ر ہنے کو ں عالی مقام

(۴۳۸) مہار ک تیرا تا ج (ن) تجہہ پر ا چھو — ن ج تاڑوں
یو ہمت (ن) تیری تجکو رہبر اچھو — ن ج نیت

(۴۳۹) شجاعت کے زور (ن) میں توں فرد ہے — ن ج طورے
بہا د ر شجا ع صا حب د ر د ہے

(۴۴۰) مراقب میں مردوں کے توں بے نظیر
نبی مت اچھو تجہہ اوپر دستگیر

(۴۴۱) جو ہو لیا بجن سو رکھیا برقرار
اچھو ہاں مرداں کا تجکوں (ن) ادھار — ن ج لس ہ ن

(۴۴۲) ووجگ میں نتیجا برا پائیکا (ن) — ن ج دو جگ سوں نتیجا برا پاے کا
د نیا سہل ہے تا نوں ر ہ جا ئیگا — ج دنیا سہل ہے تا توں رہ جاے کا

(۴۴۳) ہوا بعد ازاں قتل ہندوستان میں
ہوا جنگ بڑا مغل او ر خا ں میں (ن) — ن ج ہوا جنگ مغل اور میاں خاں میں

(۴۴۴) شہادت کئیے خاں نے اختیار
کرے مغفرت خان کوں پروردگار

(۴۴۵) ہوی جب خبر جاکے نواب کوں
سیادت کی مسند کے محراب کوں

(۴۴۶) کہ ہا ام علی سید با خبر
کہا ہا ام معلو ی پر سفر

(۴۴۷) سندیا اور سنتیا غم کی جا آگ میں — ن: بیراگ ج
یو عالم علی‌خاں کے ویتاگ (ن) میں

(۴۴۸) کہا کھود تارین دکھن کی زمیں
یہ کیا بات ہمنا پہ آوے کہیں

(۴۴۹) بحق خدا وند کون و مکاں
نہ مغلاں کوں چھوڑوں کا میں‌درامان

(۴۵۰) منگا توپخانہ بڑے تھاب (ن) کا — ن: تاب ج
بنگالا پورب اور پنجاب کا

(۴۵۱) منگا ئے گو مک (ن) ہان سب ہند کے — ن: کہک
ولے جا بجا اور سرہند کے (ن) — ن: دلی ج آگرا شہر ہور سہلند کے ب

(۴۵۲) جزائل شتر نال ہزاراں ہزار
رکھے صاف دھو دھو کر سب ایکبار

(۴۵۳) غلاماں کئے سرخ بانات کے (ن) — ن: غلاماں کئے سب کوں بانات کے
زرد اور سبز رنگ کئی ذات کے — ج: سرخ، سبز اور زرد کے بھانت کے

(۴۵۴) ہزاراں جوان مرد شمشیر زن

(۴۵۵) ملے آکر بارہ سے سب ہم وطن (ن) — ن: ملے آکے بارہ سوں ست دے وطن ج

(۴۵۶) لئے سات ادشام چو ستھہ ہزار (ن) — ن: ب بست‌ہزار، یہ‌تعداد صحیح نہیں ب پچاس ہزار کی تعداد تاریخوں میں درج ہے
یک‌یک کس‌شجاعت‌میں سب‌نامدار (ن) — ن: آپس تھا شجاعت میں‌اک نامدار

(۴۵۷) بڑے خاں ستھے خاں اوٹھے بول کر (ن) — ن: اوٹھے بول اگرچے مہری جان میں جان ب بڑھکر چھڑ کہ گنگا کروںگا رواں
کہ یک یک کوں پکڑو ......

(۴۵۸) اوٹھے شے اکبر لے لوں کر پکار
کہ یک یک کوں پکڑونگا در کارزار

(۴۵۹) کہے اے خدا یا مجھے ایکبار
نظاماں ستی اُس لڑا ی کی بہار

(۴۶۰) اوتھے بول اگر ہے مرے تن میں جان
کہ ایکبار سب ہم کوں کرنا وتھان (ن)

ن — لڑا کر لڑا الگ کروں کا ادا ن
ج

(۴۶۱) بحق خدا وند پروردگار (ن)
نظام الملک سوں ملا ایکبار

ن — کہا جذب سوں اے خداوند کار
ب ج — نظاماں سوں مجھکو ملا ایک بار

(۴۶۲) اگر میں عدو اپنا پاؤنگا تو (ن)
نکل جاوں جو سامنے ہو

ن — اگر مجھکوں دشمن میرا پاے تو
ب ج — نکل جاں یوں سامنے آے تو
(نکل جاویں جو سامنے آئے تو)

(۴۶۳) زمیں دندنا نے لگی خوف کہا
پڑا دھاک ملک میں ہوا جابجا (ن)

ن — پڑا دھاک ملکوں ملک جابجا
ب ن — چلے دو منزل دکھن کے کدھن
ن — امیراں سرا فوج سب ساتھ لے

(۴۶۴) امیراں واسراولا کہاں کوں لے (ن)
چلا ہے دکن پر دہا سے کوں دے

(۴۶۵) چلے ہیں دو منز دکھن کے رہے (ن)
ہوا وو نچھ تقدیر ھک دک رہے

ن ج — ہوا اس میں تقدیر کا آکے لکھن
ب — چلے تھے دو منزل دکھن کے کدھن

ن — ہوا اس میں تقدیر کا ایک فن
ج

(۴۶۶) دغے سے لئے مار نواب کوں
لئے لوٹ سامان و اسباب کوں

(۴۶۷) عزیزاں جو کچھ ہے سو تقدیر ہے
بغیراز رضا کچھ نہ تدبیر ہے

(۴۶۸) یو دنیا دغا باز و مکار ہے
ہوس اب جتانے میں ایار (عیار) ہے (ن)

ن — و ھی بو جتا جوا ہوشیار ہے
ب ج

(۴۶۹) فہم (ن) بے خبر عقل حیران ہے
دیکھو دوستاں! کہا یو طوفان ہے

ن — و ہم
ج

(۴۷۰) دنیا کی صحبت ہے بالکل خراب
یو دستا ہے پانی اوپر جیوں حباب

(۴۷۱) اگر مال دھن لاکھہ در لاکھہ ہے
سمجھہ دیکھہ آخر وطن خاک ہے (ن)

(۴۷۲) یو جیونا جنم ہے نہ دولت جلم (ن)
اوسے خاک سونا ہے کیا ہے وھم (ن)

(۴۷۳) جسے کچھہ سمجھہ بوجھہ ادراک ہے
دنیا کی آلائش سوں وہ پاک ہے

+ (۴۷۴) سرے کا مرے کا رہے مرجاے کا
جوکچھہ یہاں کیا ہے سو وھاں پاے کا

+ (۴۷۵) اگر بادشاہ ہے وگر ہے فقیر
اجل کے دلدال (ن) ہیں‌وہ‌دونوں اسیر

+ (۴۷۶) نہ گھر کام آوے نہ‌گھر (ن) جار آے
نہ ما باپ بھائی نہ کوئی یار آے

+ (۴۷۷) جو آیا ہے جگ میں سو مہمان ہے
یہ‌جیونا سو جیوں پھول ہور پان ہے

+ (۴۷۸) خبردار اچھہ نہیں تو اکھلاے کا
جیاتی کے دم سوں نکل جاے کا

+ (۴۷۹) کہاں گئے کہاں گئے کہاں ہیں بتا
اتھا مال دھن جن کا لا انتھا

+ (۴۸۰) اتھے شہر شرزے جنو کے غلام
ہوا خاک میں دیکھہ ان کا مقام

ن/ب — سمجھہ دیکھہ آخرکوں تن خاک ہے

ن — ختم

ن/ب — ارے ج خاک سونا ہے کیا ہے وھم

ن — پلاھوں

ن/ج — ج

ج

+ (۴۸۱) کسے دل میں اپنے ز و ایاتے نہ تھے
صنم میں اپس کے و و ماتے * نہ تھے

* سالا پھلی سما تا

+ (۴۸۲) سمجھ ہو جو بس گیا سل تیرا حساب
تیرے سار کے کئی پڑے ہیں خراب

+ (۴۸۳) نہ دفتر میں چھرا نہ گھر کوں ٹھکان
کیا فلک کرے کا تو اب ویران

+ (۴۸۴) نہ گھر کام آوے نہ فرزند رہے
نہ ما باپ آوے نہ دلبند رہے

+ (۴۸۵) ہزار ھور سو تیس تھے ۱۱۳۴ ا سال دو اُپر
محمد کی ھجرت کوں سن کان دھر

+ (۴۸۶) پر ایا چا ند ربیع الاول کا آیا نظر
ھو ا آخر ت کا یو حکا یت خبر

+ (۴۸۷) تھا د ن عزیزاں جمعر ا ت کا
ھوا شہر و ا ختم ا س بات کا

+ (۴۸۸) اگر کوئی پوچھے یہ تجکوں حساب
سمجھ کر اسے بات کا دے جواب

+ (۴۸۹) محمد نبی پر درود ھور سلا م
جتے ا ن کے اصحاب پر نت مدام

(۴۹۰) نہ ھے دل کوں راحت نہ خاطر کوں چین
کہا ھے یو قصہ غظنفر حسین

ن قصہ یو کہا ھے غظنفر حسین
ب نہ راحت ھے دل کوں نہیں جیو کوں چین

+ (۴۹۱) یو دنیا مدت تک چلی جاے گی
سفیدی پو سیاھی سو رہ جاے گی

—— * ——

اردو کے اَن پڑھ شاعر

از

جناب مرزا فدا علی صاحب 'خنجر' لکھنوی

— * * * —

ضامن

ضامن حسین خاں ولد حسین خاں - لکھنؤ میں پیدا ہوئے - اُن دنوں حسین خاں ریاست بلرام پور میں ملازم تھے - کبھی کبھی رخصت لے کر وطن آتے اور بال بچوں کو دیکھہ کر ملازمت پر واپس جاتے - ضامن کا بچپن لکھنؤ میں بسر ہوا - ہنوز خورد سال ہی تھے کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھہ گیا اور ان کے حقیقی ماموؤں نے جایداد کے واسطے لڑنا جھگڑنا شروع کیا انہیں خاندانی مناقشوں کی وجہ سے ضامن کی تربیت اور تحصیل علم کا زمانہ غفلت میں گزرنے لگا -

حسین خاں کی دو بیویاں تھیں - اُن کی زندگی میں تو جو کچھہ بھی جلن یا ڈاہ ہو لیکن حسین خاں کی آنکھہ بند ہوتے ہی آپس میں میل جول قائم ہو گیا اور سوتاپے کی کوئی خلش باقی نہ رہی' مگر گھر میں کوئی مرد نہ ہونے کی وجہ سے ضامن کی علمی تعلیم نہ ہو سکی - اگرچہ رسم و رواج کے موافق پڑھنے بٹھائے گئے' درسیات کی کتابیں بستے میں باندہ

کر مکتب گئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا ـــ

کوئی نگران حال موجود نہ تھا ، گھر سے مکتب خانے کا بہانہ کر کے جاتے اور جناب رشید مرحوم کی بغیہ واقع دال منڈی میں هم عمر بچوں کے ساتھ طفلانہ اشغال چھلی چھلیا ، اونچا نیچا، تیلا ، میرجی کی گدھیا۔ اندھا بھینسہ وغیرہ میں مبتلا هو کر دن کاٹ دیتے - کتابوں کا بستہ کسی درخت کی جڑ میں رکھا رهتا ، شام کو جو وقت مکتبوں میں چھٹی کا هوتا هے ، بستہ بغل میں داب کر مکان واپس آتے - محبت والی ماں سمجھتی کہ بچہ پڑھ کر آیا هے - مامتا کے جوش میں چٹ چٹ بلائیں لیتی ، گلے لگا کر بھولا بھولا صورت سے تھکا یا هوا منہ، چومتی ناشتہ لا کر سامنے رکھتی پلکھا جھل جھل کر کھلاتی اور پیاری پیاری صورت دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کرتی - اُس غریب کو خبر تک نہ هوتی کہ صاحبزادے نے سارا دن کس مکتب میں گزارا اور کیا سبق حاصل کیا ؟

ماموؤں کی جانب سے عدالتا عدالتی کا سلسلہ جاری تھا - اول تو کچھ زیادہ پونجی نہ تھی اور جو کچھ تھی بھی وہ اس مثل کے مطابق " تو کو نہ موکو لے چولہے میں جھونکو " باهمی نزاع کی نذر هو گئی قصہ مختصر یہ کہ ضامن ایسے هی ایسے وجوہ سے بے علم رہ گئے - البتہ یہ فائدہ ضرور هوا کہ جناب رشید مرحوم کے بیٹھکے میں شعر و شاعری کے جو چرچے هوا کرتے تھے وہ وقتاً فوقتاً گوش گزار هوتے اور ان کی ذوق آشنا طبیعت اثر پذیر هوتی رهتی - رفتہ رفتہ کم سنی هی کے عالم میں طبع موزوں نے مضامین کو نظم کے قالب میں ڈھالنا شروع کر دیا لیکن طفلانہ حجاب شاعری کے اظہار سے مانع رها ـــ

ان کے پڑوس میں ایک ضعیف العمر بیوہ رهتی تھیں جن کی نیک

طبیعتی، رحیم المزاجی اور سن و سال کے لحاظ سے جاننے والے "بی اماں" کے لقب سے یاد کرتے اور پکارتے - چونکہ یہ مسماۃ ضامن کے پڑوس میں رہتی تھیں کھیلتے ہوے ضامن اُن کے یہاں بھی نکل جاتے اور بی اماں کی فطرت نسائی بچے سے محبت کرنے پر مجبور کرتی اور وہ اکثر بچے کی بھولی بھالی باتوں سے لطف اندوز ہواکرتیں - پڑوس کا رہنا تھا آناجانا ہوا ہی کرتا تھا دونوں گھروں میں نہایت محبت و خلوص تھا - جس کا انجام یہ ہوا کہ اُنھوں نے ضامن کی والدہ سے کہہ سن کر ضامن کو اپنے نام کا کرایا اور حقیقی اولاد کی طرح محبت و دل جوئی کرنے لگیں —

ضامن کی ددھیال میں سب سنی المذہب تھے لیکن ننھیال والے مشرب امامیہ کے پیرو تھے - بی اماں بھی شیعہ تھیں - اُن کی تربیت نے بچپن ہی سے ضامن کے خیالات مذہبی کو شیعیت کے رنگ میں رنگنا شروع کیا - جب دس بارہ برس کا سن ہوا تو محلے کے لڑکوں میں کھیلنے کودنے لگے - یہ بچے بھی اکثر اثناء عشریہ تھے اس ذلا ملا اور میل جول نے ضامن کے خیالات کی کایا پلٹ دی اور وہ آبائی مذہب کی قیود سے آزاد ہو کر امامیہ طریقت میں داخل ہوگئے چنانچہ اب نہایت راسخ العقیدہ شیعہ ہیں —

جب ان کے بزرگوں کو پڑھانے کی طرف سے قطعی مایوسی ہو گئی تو صنعت و حرفت کی جانب توجہ پھیری - اس زمانے میں ایک شخص میر کاظم حسین زر دوزی کا کام کرتے تھے اور مشہور کاریگر تھے اُن کا کارخانہ کامیابی کے ساتھ جاری تھا - آدمی بھی بھلے خواہ اور نیک خو تھے - ضامن اُن کے سپرد کئے گئے - اُنھوں نے بھی کام سکھانے میں بخل نہ کیا - کچھ مدت میں اُنھیں اِس کام میں خاصی مہارت ہوگئی اس درمیان میں شوق شاعری بھی بڑھتا رہا اور مخفی طریقے پر مشق

سخن جاری رہی اس مزاولت سے نسبتاً کلام میں پختگی بھی پیدا ہوگئی انہیں ایام میں سید ببن صاحب رزق روز سے راہ و رسم دوستانہ بڑھی موصوف الذکر جناب رشید کے متصل مکان میں سکونت پذیر تھے - ضامن اکثر ان کے یہاں جایا کرتے اور نہایت بے تکلفی کی وجہ سے اپنے تصنیف کئے ہوئے اشعار دل کش لحن اور دل نشین لب و لہجہ سے پڑھ پڑھ کے سنایا کرتے انھوں نے ان کا بڑھتا ہوا شوق دیکھ کر جناب رشید کی شاگردی کا مشورہ دیا اور ان کا عندیہ پاکر ایک روز جناب رشید کی خدمت میں حاضر کردیا —

رشید مرحوم کے صدہا شاگرد تھے - صبح سے شام تک شعر و سخن کا مشغلہ رہتا - ان کے ان پڑھ شاگردوں میں جناب شفیق لکھنؤی نے خاص شہرت و امتیاز حاصل کیا ہے - ضامن بھی رشید کے فیضان سخن سے محروم نہ رہے - درخواست پیش ہوتے ہی شفیق استاد نے پشت پر دست شفقت رکھ دیا اور ضامن حلقہ تلامذہ میں شامل ہونے کا افتخار حاصل کرکے ان کی شاگردگی کا دم بھرنے لگے - اب کیا تھا ؟ شعر گوئی کا شوق دونا بلکہ چوگنا ہو گیا - مولوی گنج میں ماہانہ مشاعروں کی بنا ڈالی گئی اور مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں بزم سخن سرائی آراستہ ہونے لگی - از بسکہ ضامن میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ ماہ بماہ حضرات شعراء کی خدمت گذاری کا بار اٹھا سکتے اور ان کے ہم مشقوں نے بھی ایک ذات واحد کا زیر بار ہونا گوارا نہ کیا اس لئے ایک بے قاعدہ انجمن ترتیب دی گئی جس کے معجز ، ذاکر ، مغیث ، ظفر ، قادر ، بعید ، وغیرہم رکن قرار پائے اور چندے کی رقم سے جملہ سامان فراہم کرکے مشاعرے کئے جانے لگے اور یہ سلسلہ کئی سال تک قائم رہا —

ضامن خود بھی شعرا کو دعوت دے کر بلاتے اور اُن کے مشاعروں میں بھی نہایت ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے - برسوں یہ سلسلۂ آمد و رفت بر قرار رہا - تقریباً ۱۱ - ۱۲ برس ہوئے ایک نا خوشگوار واقعہ پیش انے کی وجہ سے مشاعروں کی شرکت یک قلم موقوف ہوگئی اور ضامن کی دنیائے شاعری میں انقلاب عظیم رو نما ہوا - واقعہ یہ ہے کہ جناب جاوید مرحوم جو اساتذۂ فن اور مشہور شاعر تھے ' ان کے کسی شاگرد نے کٹرۂ ابو تراب خاں' میں صحبت مشاعرہ منعقد کی - شعراء کی خدمت میں اطلاعی کارڈ اور رقعے ارسال کئے گئے اور مشاعرے کو کامیاب بنانے کی سعی شروع ہوئی - مصرعہ طرح یہ تھا - ع -

ہم پر آتے ہیں اپنی زلف بکھراتے ہوئے

شعراء نے محنت سے غزلیں تصنیف کیں - ضامن نے بھی اپنی استعداد اور مشق کے موافق غزل کہی اور مشاعرے میں شریک ہوئے - جب شمع سامنے آئی تو کلام پڑھ کر سنایا - اتفاق سے ایک شعر کا مضمون جناب جاوید کے کسی شعر سے لڑگیا تھا - جاوید مرحوم کے بعض پرجوش شاگردوں نے اس اتفاقیہ توارد کو سرقے سے تعبیر کرتے ہوئے سرگوشیاں شروع کیں - ضامن کو یہ امر شاق گذرا اور جوش غضب میں معرکۂ شعری آراستہ کرنے پر آمادہ ہوگئے لیکن چلد صلح جو حضرات نے درمیان میں پڑ کر قضیہ رفع دفع کردیا لیکن ضامن ملول برداشتہ ہو کر محفل سے اٹھ آئے -- ان کے ساتھ ان کے مخصوص احباب بھی چلے آئے صبح سے یہ خبر حلقۂ شعراء میں مشہور ہونا شروع ہوئی - شدہ شدہ جناب رشید تک پہنچی ' انہوں نے اپنے خاص ملازم عزت علی کو بھیج کر ضامن کو طلب کیا - یہ فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوئے - انہوں نے واقعہ دریافت کیا - انہوں نے جو کیفیت گذری تھی بلا کم و بیش بیان کردی - سن کر

فرمایا ۔ " شکر کرو کہ تمہارے شعر کا مضمون کسی اور سے نہیں بلکہ جاوید سے لڑا لیکن اس واقعہ سے لوگوں کو تمہاری افتادِ طبیعت کا اندازہ ہوگیا ۔ اب میری صلاح یہ ہے کہ آئندہ مشاعروں کی شرکت سے احتراز کرو ۔ جتنی غزل گوئی کرنا تھی کرچکے اب مرثیہ ۔ نوحہ ۔ سلام کہا کرو کہ عاقبت میں ثواب حاصل ہو ۔ فرمان بردار شاگرد نے سر تسلیم خم کر دیا اور اُستاد کے احکام کی حرف بحرف تعمیل کی ۔ اس دن سے مشاعروں کی شرکت موقوف اور غزل گوئی کا سلسلہ قطع ہو گیا ۔ نوحہ و سلام کی مشق جاری ہوئی چنانچہ اب تک وہی سلسلہ قائم ہے —

غزلیں کہتے ہیں لیکن کلام کا اکثر حصہ نعتیہ ہوتا ہے ۔ عرصے سے مشق سخن جاری ہونے کی وجہ سے نوحہ وسلام تصنیف کرنے کی خوب مہارت ہے شہر کی ماتمی انجمنوں میں ان کا کلام ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے " انجمن آل عبا کے رکن اور انجمن اکبریہ گولہ گنج کے سکریٹری ہیں کلام سبکی ہوتا ہے ۔ چالیس بیالیس برس کی عمر ہے اکہرے بدن کے کشیدہ قامت آدمی ہیں ۔ اکثر چشمہ لگائے رہتے ہیں ۔ گیہواں رنگت اور طباقی چہرہ ہے زمانہ حال کے موافق لباس پہنتے ہیں ۔ مزاج میں سادگی اور بے تکلفی کا عنصر زیادہ ہے مولوی گنج میں زردوزی کا کارخانہ ہے فوجی وردیوں پر کلابتو کے تمغے بناتے اور متوسط حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں ۔ نوحوں اور سلاموں کا کافی ذخیرہ جمع ہے ۔ اگر ترتیب دیا جائے تو دو بیاضیں تیار ہو سکتی ہیں ۔ آئمہ طاہرین علیہم السلام کی مدح میں چند قصائد بھی تصنیف کئے ہیں جو ان کی بے علمی پر نگاہ کرتے ہوئے بہت خوب ہیں ۔ غزلوں میں عبرت آموز اور حسرت زا مضامین نظم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ تصوف کی طرف بھی طبیعت کا میلان ہے لیکن مزاج کا فطری

لگاؤ عاشقانہ مضامین کی جانب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس رنگ میں بہت صاف و برجستہ شعر نکال لیتے ہیں زبان میں لوچ اور شیرینی ہے جسے اُستاد کا فیض کہنا چاہئے - بعض بحور کے نام اور اوزان یاد کر لئے ہیں ان کے ذریعہ سے وزن کرلیتے شعر دریافت ہیں- جب تک جناب رشید حیات رہے اُن کو غزلیں سنا سنا کر اصلاح لیا کئے - اُن کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی سید باقر صاحب حمید مغفور سے مشورۂ سخن کرنے لگے اور اب جناب حمید کے برادر زادے جناب افضل کو کلام دکھاتے ہیں - غزلیں جمع کرنے کا شوق بالکل نہیں - خود کہتے ہیں " اگر میں اپنی غزلیں جمع کرنا چاہتا تو اب تک ضخیم دیوان جمع ہو جاتا لیکن میں نے کبھی کلام عاشقانہ محفوظ کرنے کا خیال نہیں کیا - ضرورت کے وقت غزل کہی اور اس کے بعد ضایع کر دی محلے کے لڑکے یا بے تکلف احباب اسرار کرتے ہیں تو دس بارہ شعر کہہ دیتا ہوں چنانچہ وہی کلام راقم الحروف کو اندراج تذکرہ کے واسطے عنایت کیا ہے ملاحظہ ہو ـــ

نہ زائل دل سے عشق مصطفےٰ بعد فنا ہو گا
اندھیرے میں لحد کے ' ماہ کا جلوہ پھر نما ہو گا

نبی حامی ' علی ساقی ' بہشت آراستا ہو گا
یہ سامان عاشقوں کے واسطے روز جزا ہو گا

خدا شاہد ' ازل کے دن سے اُس گل کا ہوں شیدائی
نہ جس کا کوئی ہمسر خلق میں اب دوسرا ہو گا

مسیحا سے نہ ہو گی چارہ سازی حشر میں کچھ بھی
کرم تیرا ہمارے درد عصیاں کی دوا ہو گا

کسی اہل وفانے ظلم سہ کر اس لئے جاں دی
گنہ گاران اُمت کا اسی صورت بھلا ہو گا

جہاں میں جاؤں گا اس طرح میدان قیامت سے
سرے ہاتھوں میں دامان علی مرتضیٰ ہوگا

رقم جو کچھ ہے پیشانی میں وہ پیش آئے گا ضامن
غلط اک حرف بھی ہرگز نہ قسمت کا لکھا ہوگا

اسیر زلف ہوں صورت ذرا دکھا دینا پھر اختیار ہے ' جو چاہے وہ سزا دینا
یہ کہہ کے سوئے لحد میں ترے فراق نصیب
صدائے صور ! ہمیں حشر میں جگا دینا

سکھائی آپ کو کس نے جفا کی یہ رفتار
کہ ٹھوکروں سے نشان لحد مٹا دینا
جفا ' وفا کا طریقہ اسی سے ثابت ہے
تمہارا کو ستانا مجکو ' سرا دعا دینا

عبث ہے عشق میں ضامن کو سوز غم کا گلہ
وہ شعلہ رو جو ہے عادت ہے دل جلا دینا

پردۂ چشم جو مسکن ترا ایجاں ہوتا شعلۂ حسن چراغ تہ داماں ہوتا
حشر میں عفو گنہ کی کوئی صورت ہی نہ تھی
مجکو ضامن جو نہ عشق شہ مرداں ہوتا

سوئے مژگاں دیکھ کر سمجھا یہ رخساروں کے پاس
پھول ہیں دو بوستان حسن میں خاروں کے پاس
چشم پر نم بال بکھرائے ہوے ' چہرہ اداس
یوں نہیں آتے ہیں میری جان بیماروں کے پاس

یوں چھپایا ہم نے اُس پردہ نشیں کا سوز عشق
کب جگر واقف ہوا سینے میں گو تھا دل کے پاس

عمر دو آخر میں ساکن ہوں کھلا ضامن یہ راز
فکر کے ناخن جو پہنچے عقدۂ مشکل کے پاس

گھائل ہوئے ہیں یار کی بانکی ادا سے ہم
تیغ نگاہ ناز تریں کیا قضا سے ہم

کیوں ہم کو دل دیا، اُنھیں کیوں دلربا کیا
ترک ادب نہ ہوتا تو کہتے خدا سے ہم

بستر لگا کے خوش نہ ہوں، کیوں کوئے یار میں
منزل پر آج پہنچے ہیں فضل خدا سے ہم

ضامن یہی وسیلۂ بخشش ہے روز حشر
اپٹے رہیں گے دامن خیرالورا سے ہم

میں اپنا دل ناتواں بیچتا ہوں
خریدو تو جان جہاں بیچتا ہوں

حسیں مول لے کر جو صدقہ اُتاریں
ابھی طائر دل میں ہاں بیچتا ہوں

یہ ہے نقد جاں کا مری جان سودا
میں بے سمجھے بوجھے کہاں بیچتا ہوں

تمنائیں ہیں ساتھہ اے یوسف دل
نہ گھبرا سمع کار رواں بیچتا ہوں
خوشی جو اُس بت کی ہو مجھہ سے خواہاں
سخن بیچتا ہوں، زباں بیچتا ہوں
ہے ضامن عجب چیز سچی محبت
نہیں میں یہ جنس گراں بیچتا ہوں

ترس کھاتے نہیں عاشق پہ جتنے حسن والے ہیں
وہ باطن میں ستمگر ہیں جو ظاہر بھولے بھالے ہیں
جو آہیں بے اثر میری ہیں، بے تاثیر نالے ہیں
بتائیں آپ پھر ہاتھوں سے کیوں دل کو سنبھالے ہیں
نہ آتا ہو یقیں تم کو اگر اے جاں قسم لے لو
تمھیں پر جان دیتے ہیں تمھیں پر مرنے والے ہیں
ضیا اس درجہ بخشی ہے کسی کے سوز الفت نے
ستاروں سے سوا روشن ہمارے دل کے چھالے ہیں
ہر اک جا پردہ ظاہر ہے، نظر سے ہوکے پوشیدہ
کرشمے یار کی قدرت کے اے ضامن نرالے ہیں

یہ سرائے دہر ہے غافلو! کسی کو بھی جائے اماں نہیں
کوئی آج جاتا ہے کل کوی، کوئی رہنے والا یہاں نہیں
نہ سکندر اب ہے کہیں نہ جم، ملا خاک میں نہ رہا حشم
فقط اب ہے نام جہاں میں، کسی جا پہ اُن کا نشاں نہیں

تجھے ضامن اوروں سے کام کیا ، جو خدا سے مانگے وہ پائے گا
اُسے ذرہ ذرہ کی ہے خبر ، کوی راز اُس سے نہاں نہیں

ترے صدقہ جلوہ دکھا دینے والے
مری بگڑی قسمت بنا دینے والے

تمنا ہے ، ہو غش پہ غش یو نہیں طاری
او دامن سے مجھہ کو ہوا دینے والے

کہاں ایسی قسمت ،کبھی سن کے نالہ
کدھر ہے ، ادھر آ صدا دینے والے

مریض محبت کی اپنی خبر لے
ارے درد دل کی دوا دینے والے

خدا جانے کیا ہو اگر تم کہے تو
اشارے سے مردے جلا دینے والے

ملیں گے تجھے جام کوثر کے ضامن
وہاں ہوں گے مشکل کشا دینے والے

اُنھیں ضد ہے کہ ہلکے رنگ کی کلیاں ہوں کنگن کی
تقاضا کمسنی کا ہے ابھی باتیں ہیں بچپن کی

تصور میں ہمیشہ سامنے رہتا تھا جو اے دل
قیامت ہے وہ بیٹھے آج میں اب آکے چلمن کی

کیا بربادہ بعد مرگ مجکو، ضد کوی دیکھے
اڑائی ٹھوکروں سے خاک آکر میرے مدفن کی

مجکو عادت نہیں پر بزم میں تیری ساقی　　تھوڑی پی لیتا ہوں جس وقت گھٹا ہوتی ہے
ہاتھہ میں کیوں نہ ملے خون ہمارا قاتل　　تجہہ میں شوخی یہ کہاں رنگ حنا ہوتی ہے
دم میں ہشیار کو دیوانہ بنا دیتی ہے　　نگہ مست عجب ہوشربا ہوتی ہے

صدمۂ ہجر سے ضامن نہ ہو کیوں دل نالاں
ٹھیس جب شیشے میں لگتی ہے صدا ہوتی ہے

برائے نمونہ ایک سلام بھی لکھا جاتا ہے ملاحظہ ہو —

سلام

ایسا تھا شوق وغا شہ کے عزا داروں کو　　صبح سے کھینچ لیا میاں سے تلواروں کو
رفقا شاہ کے باندھے تھے کمر مرنے پر　　صبح کب ہوتی ہے دیکھا کئے وہ تاروں کو
کہتے تھے عون و محمد کہ نہ ہو کاٹ میں فرق　　دیکھہ لو آنکھوں پر نیمچوں کے دھاروں کو
آل زہرا جو رواں دشت میں تھا برہنہ پا　　سوکھہ کے کانٹا ہوئے غم یہ ہوا خاروں کو

اب مشرف کرے ضامن کو زیارت سے خدا
حج کا ملتا ہے شرف شاہ کے زواروں کو

طالب

ان کا نام شیخ سبحان علی تھا - سنی المذہب اور طریقہ حنفیہ کے پیرو تھے - بد نصیبی سے بالکل بے علم رہے - اگرچہ اپنی بے علمی کا کمال افسوس تھا مگر لکھنے پڑھنے کی جانب کبھی توجہ نہ ہوئی ! روز مرہ کے مصارف لکھنے کے بڑے شائق تھے - محض اس شوق کی تکمیل کے لئے ہر وقت پنسل اور نوٹ بک جیب میں رہتی - حساب لکھنے کا طریقہ بھی انوکھا تھا -

روپیہ کے لئے گول دائرہ (०) اس شکل کا بناتے ۔ ' آنہ ' کے واسطے (+) یہ نشان تجویز کیا تھا اور پیسہ کے لئے اس صورت کی (—) پڑی لکیر اختیار کی تھی ۔ اسی عنوان سے بہی کھاتہ تیار کرلیا تھا اور حساب میں کبھی غلطی نہ کرتے ۔ شاید مبداء فیاض نے ریاضی داں قلب و دماغ عنایت کیا تھا ۔ مُشکل مُشکل ریاضی کے سوال اُنگلیوں کی پوروں پر شمار کرکے حل کردیتے شاعری کا بھی شوق تھا ۔ عاشقانہ غزلیں تصنیف کرتے تھے ۔ لیکن وارستہ مزاجی نے تدوین کلام کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا ۔ اشعار نظم کئے ، احباب کو سنائے ، اُن کو خوش کیا ، آپ مسرور ہوے اور بس ! اگر کسی نے کوئی شعر نوٹ کر لیا توخیر ورنہ چند روز بعد حافظہ کا ورق سادہ اور کلام فنا ہو گیا ۔ یہی سبب ہے کہ آج دنیائے سخن میں طالب کی غزلیں عنقا کا حکم رکھتی ہیں ۔ایک مشفق (شفیع صاحب) نے ان کے چند اشعار لکھوا دئیے تھے جو ترتیب تذکرہ کے وقت کام آئے —

طالب کا وطن شاید بنارس یا مضافات بنارس ہے ۔ مختلف مقامات کا دورہ کرکے بنارسی اشیا کی تجارت ذریعۂ معاش تھی ۔ مغلوب‌الغضب اور مغرورالمزاج آدمی تھے ۔ ذرا ذرا میں خفا ہونا ، روٹھہ جانا جزو عادت تھا ۔ اپنے اشعار کا ، گا کر پڑھتے ۔ کبھی کبھی چشم و آبرو کی گردش اور ہاتھوں کی حرکت سے کام لے کر مفہوم شعر ذہن نشین کرنے کی سعی کرتے ۔ تلمذ کا حال دریافت نہ ہوسکا ۔ کلام یہ ہے —

لحد مٹے تو مٹے ، اس کا غم نہیں طالب کہ ہم تو یار کا زور شباب دیکھتے ہیں

چین لیتا نہیں پہلو میں یہ بجلی کی طرح　　وہ چلے آئیں تو اس دل کو قرار آ جائے

باتیں اغیار کی سننا نہ سریجاں ' دل سے　　کہیں ایسا نہ ہو شیشہ پہ غبار آ جائے

باغ سے نکلے ہو ' پھولوں کی بلا کر ڈالی　　اور رستے میں جو طالب کا مزار آ جائے

اُف ! اُن کے شباب کا عالم　　ہر ادا قہر ہے ' قیامت ہے

سیکڑوں فکریں ' سیکڑوں آلام　　زندگانی بڑی مصیبت ہے

آ چکا ہے قریب وقت سفر　　بس! گھڑی دو گھڑی کی زحمت ہے

پھر کہاں طالب شکستہ جگر

اُس کا جو دم ہے وہ غنیمت ہے

ظہیر

حافظ مولی بخش نام اور ظہیر تخلص تھا - غریب کور مادر زاد تھے - اندھے پن کی بدولت اکتساب علوم سے محروم رہے لیکن کلام پاک حفظ کرکے حافظ بن گئے تھے - میرٹھ اِن کا مولد و مسکن ہے - عنفوان شباب سے شعر سخن کا شوق پیدا ہوا اور بطور خود کچھ کچھ نظم کرنے لگے - اُن دنوں دہلی کی سمت سے آنے والی ہواؤں نے اہل میرٹھ کو شاعری کے رنگ میں رنگ دیا تھا - ہفتہ وار اور ماہوار مشاعرے منعقد ہوا کرتے اور مقامی شعرا کامل انہماک کے ساتھ داد سخن دینے میں مصروف رہتے دہلی سے کچھ زیادہ فاصلہ بھی نہ تھا - وہاں کے خوش گو شعرا کو بھی دعوت شعر و سخن دی جاتی اور وہ بڑے ذوق و شوق سے شریک مشاعرہ ہو کر خوش کلامی و شیریں مقالی سے سامعین کی ضیافت طبع کرتے -

یہی زمانہ ظہیر کی ابتدائے شاعری کا ہے - بعض سہولتوں کے خیال سے اصلاح کلام امداد حسین ظہور کے سپرد کی - اُنہوں نے اس ادبی خدمت کو قبول کرتے ہوئے اپنے تخلص (ظہور) کی رعایت سے ظہیر تخلص تجویز کیا اور غزلوں پر اصلاح دینے لگے -

ظہیر گاہ بگاہ مقامی مشاعروں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے - نام و نمود اور شہرت کی مطلق طلب نہ تھی - گمنامی کی حالت میں زندگی گذار دی - ترتیب تذکرۂ سخن الشعرا کے وقت حیات تھے مولوی عبد الغفور خاں نساخ نے ان کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے - نمونہ کلام حاضر ہے —

کیا گلہ چرخ سفلہ پرور کا بخت واژوں ہے اہل جوہر کا

در دنداں کی آب کے آگے شرم سے زرد منھہ ہے گوہر کا

مجھکو دفنا کے قبر میں احباب ساتھہ چھوڑیں گے زندگی بھر کا

کیا گزرتی ہے جان پر ' دیکھیں سامنا ہے پھر اک ستمگر کا

دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں ظہیر

لطف ' معبود بندہ پرور کا

عابد

اس شاعر اُمی کا نام عابد حسین اور عابد تخلص تھا - لکھنؤ جائے ولادت و قیام ہے - فن سخن میں سید عباس حسین فصاحت سے استفادہ کرتے تھے - افلاس و تنگ دستی جو شاعروں کی میراث ہے نسبتاً اِن کے حصہ میں زیادہ آئی تھی ابتدا سے انتہا تک فلاکت و نکہبت نے ساتھہ نہ چھوڑا - انجام کار قبر میں جا سلایا —

اس غریب شاعر کا ذریعۂ معاش دست کاری تھا - تمام دن کتّی (کونی) بسولی بناتے اور پھر نخاس میں لاکر دو تین آنے کو فروخت کرتے - لاگت ملہا کرکے چار چھہ پیسے بچتے جس میں بمشکل بسر کرتے اور اِسی گاڑھی کمائی میں سے پیسہ دھیلا پس انداز کرتے جاتے - جب کچھہ جمع ہو جاتا تو مشاعرہ منعقد کرکے شعرا کی دعوت کردیتے —

مجھہ سے جناب محشر فرماتے تھے کہ عابد کو شاعری سے بے حد اُنس تھا - خود فاقے کرنا اور پیٹ کاٹنا گوارا تھا لیکن مقدور بھر مشاعرہ ناغہ نہ ہونے پاتا - غربت و پریشانی کا حال تو بیان ہی ہوچکا ہے ' اس حالت میں شاعروں کی خاطر و تواضع معلوم ' اور مشاعروں کے انعقاد و انصرام میں خاطر خواہ صرف کرنے کی ضرورت ! لیکن عابد کی حالت چھپی ہوئی نہ تھی - شعرائے لکھنؤ اُن کی مفلسی اور ذوق و شوق سے بخوبی واقف تھے - یہ ہی سبب ہے کہ عابد کی دعوت مشاعرہ کبھی رد نہ ہوتی - تمام شاعر خوشی خوشی آتے اور بزم سخن میں شریک ہوکر نادار شاعر کی عزت افزائی کرتے —

مشاعرے کا انتظام بھی عجیب تھا ! کسی نہ کسی ذی استطاعت کی طرف سے فرش کا اہتمام ہو جاتا - اگر روپیہ پیسہ ہوا تو خود عابد مرحوم کرائے کی دری چاندنی لاکر بچھا دیتے - روشنی کے لئے متّی کے چراغ کام آتے اور شعرائے نازک خیال و شیریں مقال ٹیمیوں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں غزلیں پڑہ پڑہ کر بزم مشاعرہ کو رشک گلزار بنا دیتے - اُن کے دل نشین نغموں پر ترانۂ بلبل کا دھوکا ہوتا ! ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ شرکائے بزم کسی امر میں تکلف نہ فرماتے حقہ نہیں آیا تو شکایت نہیں ' پانوں میں کمی ہوی تو ہو - حقیقت یہ ہے کہ خلوص سے ملنے والی پان کی ایک گلوری کو ع —

برگ سبز است تحفۂ درویش

کا مصداق تصور فرماتے تھے - اللہ اللہ ! یہ شوق تھا اور یہ لوگ جنھوں نے عالم عسرت کی منتہا میں رہ کر اپنی شاعری کی خدمات سے غفلت نہیں کی - جب تک زندہ رہے ترقی زبان کے کوشاں رہے - اب نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ زمانہ - مجلس احباب میں ذکر ہی ذکر باقی ہے - عرصہ ہوا کہ عابد مرحوم نے اپنے مکان مسکونہ واقع مولوی گنج میں وفات پائی اور پس ماندوں میں اپنا ذکر خیر چھوڑ گئے —

ان کا کلام تلف ہوگیا - لاکھ تلاش کی سراغ نہ ملا - منتہائے کوشش سے جو چند اشعار دستیاب ہوے یادگار کی طور پر درج تذکرہ کئے جاتے ہیں —

ہجر کی رات ' کوی رہ رہ کر دونوں ہاتھوں سے دل مسلتا ہے
اپنے بیمار کی خبر لینا اب کوی دم میں دم نکلتا ہے
دل بے تاب کا خدا حافظ ناوک چشم یار چلتا ہے
شانہ کش لاکھ ہو دل صد چاک کہیں زلفوں کا خم نکلتا ہے
پیچ در پیچ ہے وہ کاکل اس کا بھٹکا بھی کم نکلتا ہے
پھروں قابو میں دل نہیں آتا یوں مچلتا ہے ' جب مچلتا ہے

ماہتابی پہ ہے وہ رشک قمر شرم سے چاند چھپتا پڑتا ہے
زلف پرخم کی یاد میں شب بھر آپ سے آپ دم الجھتا ہے

غریب

غریب داس نام غریب تخلص - یہ شاعر بھی ہندوستان کا مایۂ ناز اور کبیر داس سے دوسرے درجہ پر ہے - اس کی ولادت سنہ ۱۷۱۷ ع میں

چوڑانی نام ایک گاؤں میں ہوئی جو نواح دھلی میں واقع ھے - قوم کا جاٹ تھا - باپ کا نام بلرام ھے - اس کی نسبت اہل ھنود کا خیال ھے کہ کبیر داس نے دوسری دفعہ اس کے کالبد میں جنم لیا ھے اور تصدیق میں اک عجیب و غریب واقعہ بیان کرتے ھیں جو اُن کی خوش اعتقادی اور ارادت مندی کی روشن دلیل ھے —

غریب داس کو خزانۂ قدرت سے جو دل و دماغ عطا ھوا تھا ' اُس کی بدولت نہایت معزز و ممتاز تسلیم کیا گیا ' خصوصاً پنجاب میں تو پوجا جاتا ھے - اِس کی بانیوں اور دوھوں کی اُتنی ھی قدر و منزلت کی جاتی ھے جتنی گرو نانک جی کی کتاب کی —

گھر والے بچپن میں اُسے پیار سے غریبا کہا کرتے تھے - یہ نام اس درجہ مشہور ھوا کہ سارا گاؤں اسی لقب سے یاد کرنے لگا - اِس کی نسبت مشہور ھے کہ ایک مرتبہ گاؤں کے چرواھوں کے ساتھہ جنگل میں گیا ' چونکہ کبیر داس کے ارادت مندوں میں تھا اِس لئے اکثر اُن کا دھیان کیا کرتا - اُس روز بھی وہ کبیر داس کے تصور میں غرق تھا - استغراق نے محویت کا درجہ حاصل کیا تھا - دفعتاً کبیر داس ظاھر ھوے - اُن کے جلوۂ ھوش ربا کے نظارے سے غریب داس پر بے خودی کی سی کیفیت طاری ھوئی اور اُسی خود رفتگی کے عالم میں اُس نے ادب و آداب سے گذارہ کرتے ھوے ضیافت قبول کرنے کی استدعا پیش کی - چونکہ کبیر داس قیود جسم سے آزاد ھوکر ملائے اعلیٰ کے ساکن ھو چکے تھے اور وابستگان حیات و پیکر کی طرح خواھشات کے پتلے نہ تھے جنھیں کھانے پینے ' پہننے اوڑھنے کی ضرورت ھوا کرتی ھے اس لئے اُنھوں نے انکار کیا لیکن غریب داس کا اصرار حد سے گذر گیا اور اِنھیں اُس کی تسلی کے واسطے کہنا پڑا کہ بچھڑے کا دودہ پیونگا " جواب سنتے ھی غریب داس

بہت سے بچھڑے پکڑ لایا اور عرض کی جس بچھڑے کو آپ پسند کریں اُس کا دودھ دوھدوں ؟ کبیر داس نے ایک بچھڑے پر ہاتھ رکھ دیا جو غریب داس کی ملک تھا اِس ہاتھ کی برکت سے بچھڑے کے تھنوں میں دودھ اُتر آیا اور غریب داس نے ایک ظرف میں تھوڑا دودھ دوہ کر کبیرداس کے سامنے پیش کیا - انہوں نے برائے نام وہ ظرف لبوں سے لگاکر واپس کرتے ہوئے غریب داس کو وہ جھوٹا دودھ پی جانے کا حکم دیا - اِس حکم کی تعمیل تو فوراً ہوئی لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ غریب داس غش کھاکر زمین پر گر پڑا اور کبیر داس غائب ہو گئے - ساتھیوں نے غریب داس کی یہ حالت دیکھ کر ہو شیار کرنا چاہا - جب کسی طرح ہوش نہ آیا تو بہت گھبرائے اور اُس کے مکان جا کر اُس کے مرنے کی اطلاع کی ! اس حادثہ جاں فرسا کو سن کر اُس کے گھر والے بیتاب ہو گئے - مضطرب و سرا سیمہ جنگل میں آے اور غریب داس کی حالت دیکھ کر اُس کی موت کا یقین کر لیا - آن واحد میں یہ خبر عام ہوگئی - اہل برادری جمع ہوے - آرتھی تیار کی گئی - جملہ رسوم ادا ہوے میت اُٹھا کر مسان لائی گئی - چتا تیار ہوئی ' آرتھی چتا پر رکھ کر آگ دینے کی تیاری ہوگی - ہنوز آگ نہیں دی گئی تھی کہ آپ سے آپ ارتھی کی تمام بندشیں ٹوٹ گئیں اور غریب داس " ست کبیر " اور " بندی چھوڑ ' کے نعرے لگاتا ہوا اُٹھ بیٹھا —

یہ شاعر بھی علم سے نا آشنا تھا - لیکن ذہن رسا اور فکر بلند کی مدد سے ایسے ایسے نادر مضامین نظم کئے ہیں جو آسمان سخن پر آفتاب کی طرح روشن وضوفشاں ہیں کلام شایع ہو چکا ہے - اِس کی تصنیف کی ہوئی بانیاں چوبیس ہزار سے بھی متجاوز ہیں • اس نے سنہ ۱۷۸۲ ع میں وفات پائی - کلام کا نمونہ یہ ہے جو کبیر داس کی مدح میں کہا ہے —

پانی سے پیدا نہیں ، شواسا نہیں سریر
پانچ تتب جا کے نہیں تا کا نام کبیر
آنلت کوٹ برھما نڈ میں ، ہندی چھوڑ کہائے
سو تو پورکھہ کبیر ہیں جلنی جنا نہ مائے

گگن منڈل سے اُترے ، ست گرو پورکھہ کبیر
جل ماں ہی پوڑھن کئے ، سب پیرن کے پیر

اساتذہ کی اصلاحیں

از

(حضرت صفدر مرزا پوری مرحوم)

تتمۂ اصلاح حضرت وسیم

محمد یوسف نفیس بنگلوری :- قدم فلک ھی پہ پڑتا ھے اھل الفت کا

دیار عشق میں کوسوں زمیں نہیں ملتی

آقائے سخن نے اس شعر پر یہ نوٹ تحریر فرمایا جلیل القدر نے " پہ " کو ترک نہیں فرمایا - میں نے ترک کر دیا ھے - آپ اپنے نے اُستاد کے پیرو رھئے اور مصرع نہ بدلئے - میں بطور خود یہ مصرع لکھتا ھوں — ع

قدم فلک ھی پر اھل طلب کے پڑتے ھیں

یہ مصرع رکھیئے گا تو ھماری طرف سے دو صاد " وسیم "

جناب نفیس کے مصرع میں " پہ پڑتا " کانوں کو ناگوار ھے کیوں کہ دو (پ) کا یک جا ھونا مخل فصاحت ھے—

حضرت وسیم کے مصرع نے اس عیب کو بھی رفع کر دیا - گو میں بھی حضرت جلیل کا مقلد ھوں مگر اس موقع پر " پہ " ضرور مخل فصاحت ھے—

نفیس :- تری گلی میں لگے ہیں یہ ڈھیر کشتوں کے
میری لاش کو بھی دو گز زمیں نہیں ملتی

اصلاح :- تری گلی میں لگے ہیں یہ ڈھیر کشتوں کے
کہ میری قبر کو دو گز زمیں نہیں ملتی

" بھی " بھی زاید تھا اس مصرعۂ ثانی میں " کہ میری قبر کو " بنایا گیا —

نفیس :- یہ میں نے خاک اُڑائی ہے جوش وحشت میں
اب آسمان کے نیچے زمیں نہیں ملتی

نسخہ :- یہ وحشیوں نے اُڑائی ہے خاک مل جل کر
اب آسمان کے نیچے زمیں نہیں ملتی

اس پر آثیم خان حضرت وسیم نے یہ نوٹ تحریر فرما " بھائی صاحب میرے خیال میں مل جل کا لفظ ذکینہ ہے شعر بلیغ ہو گیا - صرف اس ٹکڑے کی وجہ سے اس مصرع کے ساتھ یقیناً یہ شعر صاد کے قابل ہے گو قبلہ و کعبہ نے نسخے کے طور پر لکھ دیا ہے " آثیم "

نفیس :- یہ مذاق ارض حرم میں شرب ناب کی ہے
کہ تشنہ تشتے ہیں دوا کو کہیں نہیں ملتی

اصلاح :- یہ تیر سے راعظوں کے ہے شراب کا توڑا
کہ تشنہ تشتے ہیں دوا کو کہیں نہیں ملتی

یہ نوٹ تحریر فرمایا کہ " ارض حرم کو پاک رکھئے دیکھئے " —

نفیس :- یہ حسن و عشق کی خلوت کا اک کرشمہ ہے
جو دامن اُن کا میری آستیں نہیں ملتی

اصلاح :- شب وصال کا اُن کی یہ اک کرشمہ ہے
جو دامن اُن کا میری آستیں نہیں ملتی

یہ نوٹ تحریر فرمایا - حسن و عشق صاف معنی نہیں دیتا تھا الجھاؤ تھا —

نفیس :— جہاں آنسو گرا اک چشمۂ زمزم وہاں اُبلا

پڑی بنیاد کعبہ کی جہاں میں نے جبیں رکھہ دی

اصلاح :— جہاں آنسو گرے اک چشمۂ زمزم وہاں اُبلا

پڑی بنیاد کعبہ کی جہاں میں نے جبیں رکھدی

" گرا " اور " گرے " میں جو فرق ہے ظاہر ہے " گرا " بحالت واحد اور " گرے " بحالت " جمع "

نفیس :— مرے دل میں جمایا نقشہ اس نے بت پرستی کا

مصور کھینچ کر تونے جو تصویر حسیں رکھدی

اصلاح :— مرے دل میں جمایا نقشہ اپنے حسن کا اُس نے

مصور کھینچ کر تونے جو تصویر حسیں رکھدی

" اُس نے بت پرستی کا " بجائے اس کے " اپنے حسن کا اُس نے " بنایا - " بت پرستی کا " یہ ٹکڑا بے کار سمجھا گیا - کیوں کہ بت پرستی کو تصویر سے کیا تعلق حسن سے البتہ لگاؤ ہے —

نفیس :— یہ بت منہ سے نہ بولیں اور میں سجدے کروں اِن کو

وہ خوبی کون سی اِن میں ہے صورت آفریں رکھدی

اصلاح :— یہ بت منہ سے نہ بولیں اور میں سجدے کروں اِن کو

وہ خوبی کون سی اِن میں احسن‌العالمین رکھدی

مصرعۂ ثانی میں " ہے " زائد تھا اس لئے بجائے " صورت آفریں " کے " احسن‌العالمین " بنا دیا مگر ہیچمدان مؤلف کی رائے میں مصرعۂ ثانی سے " صورت آفریں " کا ٹکڑا ہٹانا نہ چاہئے - مصرع یوں بھی ممکن تھا - اس سے بہتر تو یہی تھا - ع - عجب خوبی یہ اِن میں تونے صورت آفریں رکھدی - اب پہلے

مصرع کو ملاکر پڑھئے —

یہ بت منہ سے نہ بولیں اور میں سجدے کروں اِن کو
عجب خوبی یہ اِن میں تو نے صورت آفریں رکھدی

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصرع اسی مصرع کا محتاج تھا —

نفیس :- چلے کا سمجھ یہ کیا جادو زمانے کی دورنگی کا
نظر میں میں نے رکھا ہے تمہاری چشم پُرفن کو

اصلاح :- چلے کا سمجھ یہ کیا جادو زمانے کی دورنگی کا
کہ برسوں میں نے دیکھا ہے کسی کی چشم پُرفن کو

اصلاح دیکر یہ نوٹ حضرت وسیم نے تحریر فرمایا - نظر میں رکھنا " تکلف سے خالی نہ تھا - اس لئے تصرف کرنا پڑا " سبحان اللہ کیا اُستادانہ اصلاح دی ہے —

نفیس :- ستم ہے پھوٹ پڑی ہے یہ کیسی آپس میں
نگاہ لطف سے چین جبیں نہیں ملتی

اصلاح :- ادا کی تیغ سے شمشیر کیں نہیں ملتی
نگاہ لطف سے چین جبیں نہیں ملتی

پہلے شعر تھا - اصلاح سے یہ شعر مطلع ہو گیا اور مصرعے برابر کے کس قدر لطف دے رہے ہیں —

نفیس :- آنے کا جوش پر جو مرا بحر انفعال
بہتی پھریں گی حشر میں فردیں حساب کی

اصلاح : دریا ترے کرم کا جو آنے کا جوش پر
بہتی پھریں گی حشر میں فردیں حساب کی

بحر انفعال معمول سا ٹکڑا تھا - عرق انفعال - اشک انفعال - تو ہے مگر

بحر الفعال نہیں اس پر اُستاد نے کتنا چبھتا ہوا مصرع لگا دیا ہے کہ جس کی جس قدر داد دی جائے کم ہے - اے سبحان اللہ "دریا ترے کرم کا جو آگیے کا جوش پر" مصرعۂ ثانی گویا اسی مصرع کا محتاج تھا —

نفیس :— مستانہ وار آتے ہیں وہ جھومتے ہوے
مستی شراب کی ہے کہ مستی شباب کی

اصلاح :— مستوں کی طرح آتے ہیں وہ جھومتے ہوے
مستی شراب کی ہے کہ مستی شباب کی

" مستانہ اور پھر وار کو کہا گیا ہے مگر احتیاط اولیٰ ہے یہ نوٹ جناب وسام نے لکھ کر بجائے "مستانہ وار" "مستوں کی طرح" بنایا گو مستانہ وار بھی صحیح ہے مگر اس اصلاح سے شعر اور صاف ہوگیا —

اسی غزل کا ایک مطلع ہم ناظرین مشاطۂ سخن کی ضیافت طبع کے لئے پیش کرتے ہیں جو لسان الملک حضرت ریاض کے رنگ میں ہے - سنئے

ارض حرم میں سنتے ہیں قلت ہے آب کی
ساقی وہاں بھی نہر بہا دے شراب کی

نفیس :— ہزاروں تیغ ہیں چین جبیں کے قبضے میں
چھری نہیں ہے کہ شمشیر آب دار نہیں

اصلاح :— ہزاروں تیغیں ہیں چین جبیں کے قبضے میں
چھری نہیں ہے کہ شمشیر آب دار نہیں

بجائے تیغ " کے تیغیں" بنا دیا - نفیس نے ہزاروں کے بعد "تیغ" کو واحد کہا تھا اُستاد نے جمع کردیا —

نفیس :— اُڑائی موسم گل کی غلط خبر کس نے
سرا لباس سلامت ہے تار تار نہیں

نفیس :- نہیں ہیں پھول مری قبر پر یہ ساغر ہیں
خم شراب ہے ساقی مرا مزار نہیں

ان دونوں شعروں پر حضرت وسیم نے اگرچہ کوئی اصلاح نہیں فرمائی مگر جناب حکیم اثیم خلف جناب وسیم نے اِن الفاظ میں داد دی - " پر کیف لطیف تشبیہوں میں شعر پورا اُتر گیا جواب نہیں ہو سکتا - ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ " (اثیم)

(مرسلہ حضرت نفیس بنگلوری)

خواجہ عبدالروف عشرت لکھنوی

نواب محمد داور خاں قلندر نواب آف کرنول :—

نہ ناز چاہئے قاروں کی طرح سے زر پر
کہ بعد بوجھہ اُٹھانا پڑے وہی سر پر

اصلاح :- لگا نہ جان کو قاروں کی طرح تو زر پر
یہ بوجھہ تجکو اُٹھانا ہے ایک دن سر پر

خواجہ صاحب نے " جان " کے ایک لفظ سے مطلع میں جان ڈال دی اور دوسرے مصرع سے تو فصاحت کے دریا بہا دئیے - اور لطف یہ کہ مفہوم وہی رہا —

قلندر :- لکھا جو نامہ میں احوال درد فرقت کا
تو راستے ہی میں بجلی گری کبوتر پر

اصلاح :- لکھا جو نامہ میں احوال بے قراری کا
تو راستے ہی میں بجلی گری کبوتر پر

بجلی کی مناسبت سے " بے قراری " کا لفظ بنایا گیا جس سے شعر میں ایک خوبی پیدا ہو گئی —

قلندر:- جو شوق قتل کا قاتل نے مجھ میں دیکھ لیا
کہا پکار کے رکھ دو گلے کو خنجر پر

اصلاح :- یہ شوق قتل ہے قاتل کو میں نے جب دیکھا
رگیں پکاریں کہ رکھ دو گلے کو خنجر پر

جناب قلندر کا شعر مذاق شاعری سے گرا ہوا تھا یعنی معشوق کا یہ کہنا کہ تم خنجر پر گلا رکھدو اس سے عاشق کے شوق قتل کا ارمان ثابت نہیں ہوتا اصلاح سے یہ عیب رفع ہو گیا - اور شعر مزے کا ہو گیا - نازک اصلاح دی

قلندر :- ہم نشیں رفتہ رفتہ دور ہوئے
ہو گئی ساری انجمن خالی

اصلاح :- ہم نشیں رفتہ رفتہ اُٹھ گئے سب
رہ گئی آہ انجمن خالی

" دور ہوئے " یہ ٹکڑا سہل تھا بجائے اُس کے " اُٹھ گئے سب " کیا خوب بنا یا جس سے شعر میں ترقی کے علاوہ معنوی خوبیاں بھی بڑھ گئیں - دوسرے مصرع میں " رہ گئی آہ " یہ ٹکڑا قابل داد ہے - پھر شیر محمد عاجز فیروز آبادی :-

میرے آزار کو نہیں سمجھا کرتا تشخیص ہے طبیب غلط

اصلاح :- میرے آزار کو نہ سمجھا تو تیری تشخیص ہے طبیب غلط

نہیں کا لفظ ماضی کے ساتھ نہیں بولتے - اس لئے اُستاد نے " نہ سمجھا تو " بنا کر اس نقص کو دور کردیا - دوسرے مصرع میں تعقید لفظی تھی - اس لئے اُسے بھی بدل دیا - اِس اصلاح سے شعر میں بہت سی خوبیاں پیدا ہوگئیں - اور جو عیوب تھے رفع ہو گئے —

عاجز :- قامت ہے کہ شمشاد ہے غارت گر دیں کا
پھولوں سے رنگ میں عارض ہے حسیں کا

اصلاح :- قامت ہے کہ شمشاد ہے غارت گر دیں کا
گلدستہ ہے پھولوں کا کہ عارض ہے حسیں کا

عارض کو پھولوں کا گلدستہ بنا کر مطلع کو رنگیں بنا دیا ــ

عاجز :- دنیا جسے کہتے ہیں وہ ہے خواب کا عالم
دو روز میں ہو جاتا ہے گم نام مکیں کا

اصلاح :- دنیا جسے کہتے ہیں وہ ہے خواب کا عالم
اٹھوارے میں ہو جاتا ہے گم نام مکیں کا

اٹھوارے کے لفظ نے معنی میں ترقی پیدا کردی - مطلب یہہ ہے کہ انسان آٹھہ دن میں مر جاتا ہے

عاجز :- غیر حالت رات سے ہے عاشق دلگیر کی
انتہا اب ہو چکی ہے گردش تقدیر کی

اصلاح :- غیر حالت رات سے ہے عاشق دلگیر کی
منہہ چھپانا تھلے یہہ بھی بات ہے تقدیر کی

اصل مطلع میں باہم دونوں مصرعوں میں ربط نہ تھا - اس اصلاح نے مطلع میں چار چاند لگا دئیے -

عاجز :- قسمت نے شہر شہر کیا در بدر مجھے
آرام کا ملا نہ کہیں ایک گھر مجھے

اصلاح :- غربت نے شہر شہر کیا در بدر مجھے
آرام کا ملا نہ کہیں ایک گھر مجھے

بجائے "قسمت" کے "غربت" کا لفظ بنادیا - اس ایک لفظ نے مطلع میں ایک نئی روح پھونک دی اسی کا نام استادی ہے-

عاجز :- اے تپ نہ جلانا استخواں کو کھائے گا ھما انہیں میرے بعد

اصلاح :- اے تپ نہ جلانا استخواں کو مایوس نہ ہو ھما میرے بعد

"مایوس نہ ہو" اس ٹکڑے نے معنی میں ایسی نزاکت پیدا کردی جو احاطۂ تعریف سے باہر ہے ۔۔

(نوٹ)

یہ اصلاحیں بھی حضرت عشرت لکھنوی نے خود اپنے قلم معجز رقم سے لکھ کر مرحمت فرمائیں - گو ان شعروں میں وہی پرانا رنگ ہے - مگر ہمیں صرف اصلاح دکھانا مقصود ہے -

ادب

مذہب

تاریخ

متفرق

اردو کے جدید رسالے

— * —

ادب

روس میں اردو کی تعلیم

قواعد اردو ، پہلا صفحہ (۱۹۲۹)

منتخبات اردو ، حصہ اول و دوم (۱۹۲۷ اور ۱۹۳۰)

اردو - روسی - انگریزی لغت (۱۹۳۰)

مرتبہ جناب الک سے ئی براننی کوف صاحب ، دارالاشاعت

"مدرسہ علوم مشرقی" لینن گراڈ

حامیان اردو کو یہ سن کر بہت خوشی ہوگی کہ روس میں لوگوں کو اردو سیکھنے کا شوق ہوگیا ہے اور وہاں اردو زبان کی تعلیم دی جانے لگی ہے۔ اسی سلسلے میں لینن گراڈ کے مدرسہ علوم مشرقی نے چارکتابیں شایع کی ہیں جو روس کے شایقین اردو کے لئے بہت کار آمد ہوسکتی ہیں - اس مدرسے کے نصاب میں اردو ۱۹۲۳ میں داخل ہوگئی تھی ، لیکن ان کتابوں کے مرتب ہونے تک روسی طالب علموں کے پاس اردو سیکھنے کا کوئی ذریعہ سوا ان کتابوں کے نہیں تھا جو انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں شایع ہوئی ہیں۔ اب براننی کوف صاحب اور ان کے چند ساتھیوں اور شاگردوں کی محنت سے چارکتابیں مرتب ہوگئی ہیں جو طالب علموں کی تقریباً کل ابتدائی ضروریات پوری کرسکتی

ھیں - ان میں سے "قواعد اردو" ۱۹۲۶ میں شایع ہوئی یہ لسانیات کے جدید اصولوں کے مطابق لکھی گئی ھے اور ان لوگوں کے لئے جو اردو کی لسانی خصوصیات سے واقف ہونا چاھیں یہ بہت کافی ھے - لیکن اس میں مشق کے لئے سوالات نہیں ھیں اور مشق کے بغیر قواعد کا ذھن نشین ہونا دشوار ھے - روسی طالب علموں کو اردو کا ہر قاعدہ انوکھا اور ہر ترکیب نرالی معلوم ہوتی ہوگی ' اس لئے ان کو مشق کی اور بھی حاجت ہوتی ہوگی ' اور اس لحاظ سے یہ کتاب کی ایک بہت بڑی خامی ھے - دوسری کتاب ' منتخبات اردو " حصہ اول اس کمی کو ایک حد تک پورا کرتی ھے - یہ عزیزالدین احمد صاحب کی تصنیف " گدگو تری کا افسانہ ھے " جس کی سادہ اور سلجھی ہوئی زبان حواشی اور فرھنگ کے ذریعہ سے اور بھی آسان کر دی گئی ھے - لیکن پھر بھی اس کا مطالعہ کرنے کی اسی کو ھمت ہو سکتی ھے جس نے مشق کرتے کرتے اردو الفاظ اور جملوں کی ساخت سے خاصی واقفیت حاصل کر لی ہو ' اور اردو عبارت اسی قدر بے تکلفی سے پڑھ سکتا ہو " - منتخبات کا دوسرا حصہ ۱۹۳۰ میں شایع ہوا - اس میں مولوی نذیر احمد کی " مراۃالعروس " مولانا شبلی نعمانی کی " سفر نامہ روم و شام " اور مولانا حالی کی " حیات جاوید " سے اقتباس دئے گئے ھیں ' اور تمہید میں اردو زبان کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ھے - اس حصے کے ساتھ فرھنگ دینا ضروری نہیں سمجھا گیا ' کیونکہ اس کے ساتھ ھی ایک خاصی مکمل لغت الگ شایع ہو گئی ھے -

قواعد اردو " میں زبان سیکھنے والوں سے زیادہ ان لوگوں کا خیال رکھا گیا ھے - جنھیں لسانیات سے دلچسپی ھے ' اور گو قواعد صحیح اور مکمل ھیں پھر بھی اس میں شبہ ھے کہ وہ زبان سیکھنے والوں کے لئے ایک پختہ بنیاد کا کام دے سکتے ھیں - مشق کے واسطے سوالات نہ ہونے سے کتاب کی علمی وقعت کم نہیں ہوتی ' مگر عملاً وہ اتنی مفید نہیں ثابت ہو سکتی جتنی مشقوں کے ساتھ ہوتی. مثالیں دینے میں بعض جگہوں پر الفاظ کے معنی غلط دیئے گئے ھیں ' صفحہ ۱۵ پر " بعد " کے معنی ظاہری " بدیہی ' دئے گئے ھیں ' حالانکہ " بعد " یا تو " بات " کا مخفف ہوتا ھے یا ایک قسم کی مرغابی (بط) کا نام ھے ؟ صفحہ ۸۹ پر "گرم دلی " کے بجائے " دل گرمی " لکھا ھے ' صفحہ ۹۰ پر " یار " کا مونث " یارنی " بتایا گیا ھے ' جو صریحاً غلط ھے - مگر اصول سمجھانے میں مصنف سے کوئی

ایسی غلطی نہیں ہوئی ہے - "گنگوتری کے افسانے" کے ساتھ جو فرہنگ دی گئی ہے اس میں ایسی غلطیاں نہیں ہیں، اور حاشئے میں جو محاورے سمجھائے گئے ہیں ان کا مطلب بھی روسی میں صحیح ادا ہوا ہے - "منتخبات" کے دوسرے حصے میں حاشئے نہیں ہیں، اور گو لغت کے مرتب کرنے میں "منتخبات" کا مطالعہ کرنے والوں کی مشکلیں آسان کرنا مد نظر رکھا گیا ہے، لیکن مولوی نذیر احمد اور مولانا شبلی کی زبان روسی طالب علم محض لغت کی مدد سے نہیں سمجھ سکتے کیونکہ لغت میں محاورے وغیرہ بہت کم دئے گئے ہیں - لغت میں کہیں کہیں غلطیاں بھی ہیں - سرسری مطالعے میں جن پر نظر پڑی وہ مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہیں :-

غمی	بمعنی	درد اور تکلیف
غمی	بمعنی	غمگین
متنا	--	مشورہ کرنا راضی ہونا - یہ لفظ کسی اردو لغت میں نہیں ملتا
متوالپن	بجائے	متوالا پن
متیلا	--	متھیلا
نتنا	بمعنی	ناچنا
بڑھا	بجائے	بوڑھا
بھو	بمعنی	بیوی
بوو	بجائے	بہون
کڑائی	بمعنی	کڑاپن، کڑا ہونا، سخت ہونا
کوڑھی	بمعنی	ڈھیر، گھر، خاندان
لکھنوانہ	بجائے	لکھنوی یا لکھنو کا
لمبانا	بمعنی	لمبا کرنا
مُتھا	بجائے	مُٹھا
مٹھا	بجائے	مٹھی
مچھویلی	بمعنی	مچھلی والے کی بیوی یا مچھلی بیچنے والی
محکمۃالتمیز	بمعنی	عدالت عالیہ
مدرسہ	بمعنی	اکاڈمی، مدرسہ یا تعلیمی ادارہ
نھا	بجائے	نھہ

نفسی بمعنی شہوانی
لٹھیلدی بمعنی ایک قسم کے لفنگے جو رات کو سڑکوں پر گھومتے ہیں
ہاریل بمعنی سبز بجائے ہریالی یا ہریالا (سبزی)
ملائم بمعنی نرم، خوشگوار
ہٹھ بجائے ہٹ
ہٹیلے پن بجائے ہٹیلا پن
ہلکا بمعنی ہلا
ہنسا بمعنی ہنسی
یکجہت بمعنی وفادار، قابل اعتبار، دوست

ایسی غلطیوں کا سبب صرف یہ ہے کہ کسی واقف کار اہل زبان سے مدد نہیں لی گئی، انھیں زیادہ اہمیت نہ دینا چاہئے - روسی مدرسے اور بوانڈیکوف صاحب کی کوشش بہت قابل قدر ہے اور ہمیں امید ہے کہ بہت سے روسی اس سے فائدہ اٹھائیں گے - اعتراض کا حق ہمیں اسی وقت ہو گا جب ہم اردو میں روسی زبان کے قواعد اور فرہنگ شایع کریں اور ان میں ایسی غلطیوں سے بچے رہیں -

اردو ادب کی جو تاریخ "منتخبات" کے ساتھ دیباچے کے طور پر دی گئی ہے اسے مرتب کرنے میں گارساں دتاسی اور رام بابو سکسینا کی تصانیف سے مدد لی گئی ہے - ہندوستان میں مختلف نسلوں کی آمیزش، اردو کا آغاز اور تدریجی نشو و نما تفصیل سے بیان کیا گیا اور اردو کے دکنی سرپرستوں اور قدردانوں کا پورا حق ادا کیا گیا ہے - اردو شاعری پر چند اعتراض بھی کئے ہیں مثلاً یہ کہ اس کا میدان بہت تنگ ہے اور اسے روزمرہ زندگی اور ہندوستان کے مناظر فطرت سے بہت کم تعلق رہا ہے - لیکن ان کا اعتراض مخالفانہ نہیں محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے قسم کا مذاق رکھنے کی وجہ سے وہ ہماری شاعری کا پورا لطف اٹھانے سے معذور ہیں - مضمون میں ایک جگہ رجب علی بیگ سرور کا نام سرر چھپ گیا ہے، ملا راشدالخیری کی تصانیف "صبح زندگی" وغیرہ حکیم محمد علی کی طرف منسوب کردی گئی ہیں، مہر انیس کو ان شاعروں کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے جنھوں نے سپہ گری چھوڑ کر شاعری کا پیشہ اختیار کیا تھا، اس لئے کہ سپہ گری میں نفع یا شہرت حاصل کرنے کا امکان نہیں رہا تھا - لیکن یہ بھی معمولی غلطیاں ہیں، اور ہمیں ان کا خیال بھی نہیں

رهتا جب هم یہ پڑهتے هیں کہ هندوستان میں اردو کی وهی حیثیت هے جو روس کی متعدد ریاستوں میں روسی زبان کی آج کل جب اردو کے مقابلے میں متعدد زبانیں میدان سے آگئی هیں همیں ایسی بات سے کو صرف خوشی نہیں هوتی بلکہ همارے حوصلے بهی بڑهتے هیں -

(م م)

کهیتی

مصنفہ محمد مجیب صاحب ' بی اے (آکسن) پروفیسر جامعہ ملیہ دهلی - مطبوعہ جامعہ پریس - دهلی ۸۰ صفحے - قیمت چھ آنے)

اس ڈرامے کے اشخاص فرضی یا خیالی نہیں هیں بلکہ ایسا معلوم هوتا هے کہ وہ وهی لوگ هیں جن سے همیں آے دن سابقہ پڑتا هے - اور جن کے اثر سے هماری قومی زندگی کی بری یا بهلی جیسی بهی هو ' تشکیل هو رهی هے - مصنف اس خیال کے حامی معلوم هوتے هیں کہ زندگی اور آرٹ دو علحدہ علحدہ چیزیں نہیں هیں بلکہ لازم ملزوم هیں اور ایک دوسرے پر اپنا اثر رکھتی هیں اگرچہ اس ڈرامے میں مصنف نے زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی هے مگر وہ اشاروں اشاروں اور باتوں باتوں میں بڑی صفائی سے وہ سب کچھ کہہ جاتے هیں جو شاید کوئی واعظ کہتا اور بهونڈے طریقے سے کہتا - اور یہی بات ڈراما کا اصل مقصد هے - ڈراما لوگوں کے سامنے انهیں کی روزمرہ کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا هے - اور ان هی کے سامنے ان کے دلوں کے چور اور ان کی نیتوں اور منصوبوں کے اصلی محرکات کو اس طرح کهول کر بیان کرتا هے کہ وہ خود تعجب کرنے لگتے هیں —

محمد مجیب صاحب نے اپنے ڈرامے میں عبدالغفور کی زبانی وہ سب کچھ بیان کر دیا هے جس سے همارے آج کل کے نام نہاد لیڈروں کی ذهنیت کا پورا اندازہ هوسکتا هے یہ لیڈر سیدھے سادے لوگوں کو کس هشیاری سے اپنے قبضے میں لاتے هیں اور اقتدار کو برقرار رکھنے کے واسطے کیا کیا تدبیریں کرتے هیں اور اسی ضمن میں قابل مصنف نے نہایت لطف کے ساتھ هندو و مسلم سماجوں کی اصلیت بیان کی هے اور ان حضرات کی گرفت کی هے جو واقعی

ان ساری بد مزگیوں کے حقیقی ذمہ دار ہوتے ہیں - عبدالغفور کے پہلو بہ پہلو ایک اور دوسرا کیریکٹر حسام الدین کا ہے - یہ ایک تعلیم یافتہ خوشحال نوجوان ہیں - دل میں قوم کا درد ہے اور عقل سلیم رکھتے ہیں - حسام الدین بخلاف مولوی عبدالغفور کے اپنے ملنے جلنے والوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے جانی دشمن نہیں ہیں اور اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کریں اور اپنی خدمت اور ایثار سے ان کی نظروں میں عزت حاصل کریں - ایک جگہہ حسام الدین کی زبانی نہایت دلنشین فقرہ کہا گیا ہے - مسلمانوں کو سمجھاتے سمجھاتے وہ ان سے یوں مخاطب ہوتا ہے " خدا نے جس زمین پر تمہیں بسادیا ہے ' جس ملک کو تمہارا دیس بنادیا ہے ' جن لوگوں کے ساتھہ تمہیں رکھا ہے ' اس میں اس کی کوئی مصلحت ہوگی " --

اس ڈرامے میں ادبی اور فنی دونوں خوبیاں موجود ہیں اور اگرچہ غالباً اسے ایکٹ کرنے کے لئے لکھا گیا ہے لیکن اسے پڑھنے میں بھی لطف آتا ہے —

(ی)

گناہ کی دیوار - ہمزاد

(مصنفۂ اشتیاق حسین قریشی - مطبوعات مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی -
"گناہ کی دیوار" قیمت ۱۲ آنے - صفحات ۷۱ "ہمزاد" قیمت ۶ آنے - صفحات ۴۷)

یہ ڈرامے اسی غرض سے لکھے گئے ہیں کہ اسٹیج پر لائے جائیں - ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھیں بے وجہ چھوٹے چھوٹے سینوں میں تقسیم نہیں کیا گیا - ہندوستانی اسٹیج کی جو حالت ہے وہ ظاہر ہے -- یورپ میں بھی جہاں اسٹیج پر سائنس کی کرشمہ سازیوں کی بدولت بڑی سہولتیں حاصل ہیں بالعموم ایسے وقت بار بار سین بدلے جاتے ہیں جب واقعی کوئی نیا ماحول پیش کرنا مقصود ہو اور اسکے لئے کافی ساز و سامان موجود ہو مصنف نے بھی ان ڈراموں میں اسی اصول پر عمل کیا ہے —

"گناہ کی دیوار" کا قصہ یہ ہے کہ نرمل ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے اور کاملی اس کی بیوی ہے جو نوجوان ہونے کے ساتھہ حسین بھی ہے - نرمل کا ایک دوست ہے جس کا

نام گلشن ہے - یہ ایک نہایت بے اصول اور دغا باز آدمی ہے - وہ میاں بیوی کی معمولی ناموافقت سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے میں اپنی عیارانہ چال بازیوں کی بدولت کامیاب ہو جاتا ہے - پھر کاملی کا اعتماد حاصل کرکے اسے ایک قحبہ خانے میں بھیج آتا ہے جہاں اسے گناہ کی زندگی پر مجبور کیا گیا - کاملی کی زندگی کے یہ تجربے ظاہر ہے جیسے کچھ جان گسل ہوں گے ان کا اندازہ ناظرین خود کرسکتے ہیں - نرمل نے جوگ اختیار کرلیا تھا - اتفاق سے وہ کاملی کے حالات سے آگاہ ہوا - ادھر کاملی کو رنبیر کی بدولت جو انجمن اصلاح افتادگان کا سکریٹری تھا قحبہ خانہ سے نجات ملی - نرمل اور کاملی پھر ایک دوسرے سے ملے اور باوجود ان تمام واقعات کے دونوں میں اتحاد و خلوص قائم ہو گیا - اور گناہ دیوار" جو دونوں کے درمیان حائل تھی خلوص کی بدولت ڈھے گئی - اس ڈرامے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات افراد کی گناہ کی زندگی اختیاری نہیں ہوتی بلکہ حالات کی مجبوری کا نتیجہ ہوتی ہے - سوسائٹی اس بات میں جو تشدد اختیار کرتی ہے وہ بے جا ہے - اس ڈرامے کی زبان سلیس ہے

" ہمزاد " کا قصہ یوں ہے - شاہ رخ ایک دولتمند سن رسیدہ شخص ہیں - ان کی ایک بیوی ہے جس کا نام شکیلہ ہے - دولت کی لالچ میں اس نے ان بڑے میاں کے ساتھ نکاح کر لیا ہے - ایک اور شخص ہے صبیح، اس سے شکیلہ کی اشنائی ہے - شاہ رخ کا نوکر وزیر ان سب باتوں سے واقف ہے - چنانچہ اس نے بڑی ہشیاری سے ایسی صورت حالات پیدا کی کہ شکیلہ نے مہر سے دست برداری لکھ دی اور صبیح کے ساتھ نکاح کر لیا - دونوں نفع میں رہے - شاہ رخ بھی اور شکیلہ بھی - یہ اپنے گھر خوش وہ اپنے گھر خوش - یہ چھوٹاسا ڈراما مزاحیہ اور بزمیہ ہے -

(ی)

گڑیا

(مصنفہ لفٹنٹ کرنل ایم اے قوشی - آئی - ایم - ایس مطبوعہ خواجہ برقی پریس -- دہلی)

یہ ایک ٹھر پیسی ڈراما ہے - اسکے اشخاص یہ ہیں : کلثوم، پروفیسر علم نسواں اور "بزم تحقیق عادات و اطوار نسواں" کا صدر - حسینہ، گڑیوں کے تاجر

یوسف کی بیٹی ہے - شگفتہ کلیم کا دوست ہے -

اپنے دوست شگفتہ کے کہنے پر کلیم اس بات پر آمادہ ہوتا ہے کہ ایک گڑیا اپنے ہاں رکھے تا کہ عورت کی شخصیت سے وہ مانوس ہو اور اس صنف کے ساتھ جو اسے بیزاری ہے وہ کم ہو - وہ یوسف کی دکان پر جاتا ہے - ایک گڑیا خریدتا ہے جو اس تاجر کی بیٹی حسینہ کی ہو بہو نقل ہے دکان میں حسینہ اور کلیم کی گفتگو ہوتی ہے اور حسینہ تہیہ کرتی ہے کہ اگر اس شخص کو رام نہ کیا تو کچھ نہ کیا - گڑیا کا روپ بھر کے وہ خود کلیم کے گھر جاتی ہے - کلیم اسے ایک الماری میں قفل لگا کر رکھ دیتا ہے - آہستہ آہستہ کلیم کو اس گڑیا سے محبت پیدا ہوئی - دفتر جاتا ہے تو اس کا دھیان رہتا ہے - جب گھر واپس آتا ہے تو کچھ گنگناتا ہوا - بالآخر جب حسینہ نے دیکھا کہ کلیم کا دل اب پسیجنا شروع ہو گیا ہے تو ایک دن اس نے سارا راز افشا کر دیا قصہ میں حقیقت نگاری کو پیش نظر نہیں رکھا گیا - ہم نے بعض سائنٹفک لوگوں کے متعلق یہ تو سنا ہے کہ ٹہل کر گھر واپس آتے ہیں تو خود کونے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے ڈنڈے کو چارپائی پر لٹا دیتے ہیں لیکن اس میں غالباً مبالغہ ہے کہ کوئی سائنٹفک آدمی مصنوعی گڑیا اور ایک ۱۸ سال کے پیکر نسوانی میں فرق نہ کر سکے - ہاں، اس کے امکان سے انکار نہیں - محض دل لگی کی چیز ہے -

(ی)

کلام جوہر

(رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا
مجموعہ - مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ - قرولباغ - دہلی)

مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا مجموعہ اس سے پہلے اردو پبلک کے سامنے آچکا ہے - اور اس پر تقریظیں بھی لکھی جا چکی ہیں - اس کے پہلے ایڈیشن کا ختم ہو جانا اور پھر اس کا شائع ہونا پبلک کی خوش مذاقی پر دلالت کرتا ہے - مولانا مرحوم کا کلام بہت کم ہے - زمانہ نے انہیں اتنی

فرصت ہی نہ دی کہ وہ اطمینان سے بیٹھکر شاعری کرتے - لیکن اس تھوڑے سے کلام سے بھی یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ مولانا کی طبیعت اور جبلت میں شاعری کوٹ کوٹ کر بھری تھی - ان کا شعر ان کے جذبات و احساسات کا ترجماں ہوتا ہے - بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی سیاست میں بھی ایک لحاظ سے شاعری کا رنگ پایا جاتا تھا رومانیت ان کی طبیعت پر ایسی حاوی تھی کہ وہ معمولی ماہرین سیاست کی طرح نام نہاد اعتدال و حکمت عملی کو خیر باد کہنے میں مطلق پاس نہ کرتے تھے - خود ایک جگہ فرماتے ہیں —

سنتے ہیں یہ بھی ایک بزرگوں کی رسم تھی
اس دور اعتدال میں دارورسن کہاں

اور یہ واقعہ ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے تک ہندوستان میں "دارورسن" کا ذکر ' خصوصاً سیاست میں ' شاید سیاسی رومانیت سے زیادہ وقیع نہ سمجھا جاتا ہو -

لیکن بعد میں لوگوں کے خیالات بدلے ' ان کی ذہنیتیں بدلیں اور ان کے نصب العینوں میں بڑے بڑے تغیرات پیدا ہوئے - کوئی منصف مزاج آدمی اس سے انکار نہیں کریگا کہ مولانا مرحوم کی " سیاسی رومانیت " کا ان تغیرات کے پیدا کرنے میں بڑا ہاتھ رہا - در اصل انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی حیات اجتماعی کی رفتار کے رخ کو بدل دیا —

شاعر مختلف قسم کے ہوتے ہیں - ایک وہ جو لفظوں کے گورکھ دھندے سے آگے نہیں بڑھتے ' ایک وہ جو اپنے لفظوں سے ہمارے واسطے تصورات حسن پیدا کرتے ہیں ' ایک وہ جو جن کے پاس بعض خیال ہوتے ہیں جنہیں وہ شاعری کی زبان کے توسط سے دوسروں تک پہونچانا چاہتے ہیں اور ایک وہ ہوتے ہیں جو اپنے دلی جذبات کی تصویر دوسرے کے آگے کھینچ دیتے ہیں تاکہ دوسرے بھی ان کی طرح محسوس کرسکیں - مولانا مرحوم کی شاعری اسی قسم کی تھی - ان کے دل پر جو گزرتی تھی اسے لفظوں اور وزن کا جامہ پہنا کر ظاہر کر دیتے تھے - یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر ہر مصرع ولولۂ عشق سے مملو ہے مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :-

ہو کچھ بھی مگر شور سلاسل تو نہیں یہ
جوہر کا تڑپنا دم بسمل تو نہیں یہ

ہے بات تو جب نوع میں ممکن رہے قایم
مقتل ہے ولا ! رقص کی محفل تو نہیں یہ
کچھ ترک محبت تو نہیں ' ضبط فغاں ہے
ہم کرنے پہ آجائیں تو مشکل تو نہیں یہ

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
خوف ممتاز ' عدالت کا خطر ' دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوف خدا اور سہی
ہم وفا کیشوں کا ایماں بھی ہے پروانہ صفت
شمع محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

دور حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کیا عشق ناتمام کی بتلاؤں سر گذشت دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ

اس مجموعہ کے ساتھ مولوی عبد الماجد صاحب دریا بادی کا مقدمہ ہے جو انہوں نے جوہر اوران کی شاعری کے عنوان سے لکھا ہے ۔ یہ مقدمہ موصوف نے اپنے خاص انداز میں لکھا ہے اور دلچسپ ہے ۔

(ی)

آفتاب وطن

(مصنفہ لالہ انوپ چند صاحب آفتاب پانی پتی یاد گار حضرت سلیم مرحوم پانی پتی ۔ بڑی تقطیع ' لکھائی چھپائی اوسط درجے کی ' کاغذ اچھا صفحات ۱۱۲ ۔ قیمت ۱۲ آنے علاوہ محصول ڈاک ۔ ملنے کا پتہ بلونت سنگھ ولد لالہ چھ کوار سنگھ پانی پت)

یہ جناب آفتاب پانی پتی کی مختلف نظموں کا مجموعہ ہے ۔ اس میں ۶۹ نظمیں ہیں اور اخیر میں چار صفحوں پر متفرق اشعار ہیں ۔ اکثر نظمیں

قومی ہیں اور بعض مذہبی اور اخلاقی - معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل قومی درد سے بھرا ہوا ہے وہ طرح طرح سے ہند و اہل ہند کی حالت زار پر آنسو بہاتا ہے کبھی ان کو ہمت و غیرت دلاتا ہے اور کبھی ان کے عیوب کی پردہ دری کرتا ہے ' اس میں شبہ نہیں کہ اس موضوع کے لئے جس شاعرانہ کمال اور استادانہ مہارت کی ضرورت ہے وہ حضرت آفتاب میں ابھی پیدا نہیں ہوئی تاہم نظموں کی زبان صاف سادہ اور طرز بیان بھی بڑی حد تک سلیس و عام فہم ہے اور سب سے بڑی بات یہہ ہے کہ وہ درد مند دل رکھتے ہیں ان کا قومی احساس اور جذبہ حب وطن بہت زبردست معلوم ہوتا ہے یہی وجہہ ہے کہ جب وہ اپنے " بد نصیب وطن " کی بپتا بیان کرنے پر اتر آتے ہیں تو ہندیوں کے دماغی ' ذہنی ' اخلاقی اور روحانی امراض کے ساتھہ انتہائی سادگی سے امراض خبیثہ کا بھی ذکر کر دیتے ہیں - اس خیال کا ماخذ غالباً مس میو کی کتاب مدر انڈیا ہے —

کتاب کے شروع میں بلونت سنگھہ صاحب پریسی پانی پتی کا ۱۲ صفحوں کا ایک مضمون ہے جس میں انہوں نے مصنف کے حالات اور شاعری کا حال لکھا ہے اور اس کا فخریہ اعتراف کیا ہے کہ آفتاب صاحب کی شاعرانہ زندگی کے بنانے اور سنوارنے میں حضرت سلیم مرحوم کا بڑا ہاتھہ ہے - اس ضمن میں سلیم مرحوم کی قابلیت پر بھی بڑی دلچسپ بحث کی ہے جن حضرات کے دلوں میں حب وطن کی گرمی ہے وہ ضرور اس کتاب سے لطف اٹھائیں گے -- (چ)

انتخاب حسرت

(مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کا منتخب کلام مرتبہ جلیل احمد قدوائی صاحب بی - اے - مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی صفحات ۱۳۲ قیمت ایک روپیہ)

حسرت غزل کے استاد ہیں - ان کے کلام میں پختگی ' متانت ' صفائی اور سوز پایا جاتا ہے - زندہ غزل گو شعرا میں ان کا درجہ بہت بلند

ہے - غزل جس سے عبارت ہے وہ حسرت کی غزل ہے --
انتخاب کے شروع میں قدوائی صاحب نے حسرت کی شاعری پر ۱۴ صفحے کا دیباچہ بھی لکھا ہے - انتخاب اچھا ہے اور چھپا بھی اچھا ہے --

---

تجلیات فرخ

(مصنفۂ جناب سید واجد علی صاحب فرخ بنارسی ، پاکٹ سائز ، صفحات مع مقدمہ و تبصرہ ۲۵۰ - لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی - قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ :-علی ہادی پسر مصنف محلہ انصار اناؤ)

یہ جناب فرخ بنارسی کے کلام کا مجموعہ ہے ، اس میں پہلے دس صفحوں پر حضرت علی کی شان میں قصیدہ ہے ، اس کے بعد ۱۶ صفحوں پر مختلف نظمیں ہیں ۱۳۲ صفحوں پر غزلیں ہیں آخر میں ۱۲ صفحوں پر چند رباعیاں ہیں --

اردو شاعروں کا ابھی بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جس پر جدید انقلاب شاعری کا بہت کم اثر پڑا اور جو برابر پرانی طرز میں تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ طبع آزمائی کر رہا ہے - حضرت فرخ بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں - اس مجموعہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل ہیں واقعی ان کی طبع آزمائی کا میدان ہے - غزل میں وہ نئے نئے مضامین ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں غزلیں زبان اور بیان کے اعتبار سے بھی اچھی ہیں - چونکہ ان کو دوسری اصناف سخن سے دلچسپی نہیں اس لئے ان میں کوئی خاص خوبی نہیں -

فرخ صاحب جدید شعرا میں اس وجہ سے شریک ہو سکتے ہیں کہ وہ جدید زبان استعمال کرتے ہیں ، اگر زبان کا یہ امتیاز باقی نہ رہے تو ہماری قدیم شاعری اور ان کے کلام میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے وہی خیالات اور مضامین ہیں جو قدیم سے نئے نئے اسلوب سے پیش ہوتے آئے ہیں - صرف زبان جدید ہے اور وہ بھی اس معنی میں کہ اس میں فارسی کی نئی نئی ترکیبیں جن کو عموماً آج کل انشا پرداز

اور شاعر وضع کر کے استعمال کرتے ہیں بعض ترکیبیں بہت خوش نما معنی خیز اور عام فہم ہیں اور دیر تک زندہ رہنے والی معلوم ہوتی ہیں اور بعض بھونڈی مبہم ناقابل فہم ہیں اور جن کی خود تعمیر میں تخریب چھپی ہوئی ہے -

فرخ صاحب کے کلام میں ایک خاص بات قابل ذکر یہ ہے کہ وہ صوفیانہ مضامین اور رکیک خیالات سے احتراز کرتے ہیں جن سے بہت کم غزل گو شعرا بچے ہیں —

کتاب کے شروع میں جناب رضی احمد صاحب رضی بدایونی نے ۳۳ صفحوں پر تبصرہ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں جناب فرخ کے کلام کے محاسن کسی قدر مبالغے سے بیان کئے گئے ہیں - اس کے بعد جناب ضیاء احمد صاحب ایم - اے پروفیسر علی گڈہ یونیورسٹی کا مقدمہ ہے جو ۴۴ صفحوں پر مشتمل ہے - مقدمہ بڑی محنت سے لکھا ہے اس میں قدیم و جدید شاعری کا مقابلہ کرتے ہوے جناب فرخ کے کلام پر تبصرہ کیا ہے - موجودہ شاعری کو قدیم کے مقابلے میں سراہا ہے اور اردو شاعری کے " درخشاں مستقبل " کی پیشین گوئی کی ہے فاضل مقدمہ نگار نے اپنے دعوے کی بنیاد جن دلائل پر رکھی ہے وہ زیادہ استوار نہیں ، تاہم انھوں نے اپنے خیال کے مطابق جن مسائل پر بحث کی ہے وہ ضرور سنجیدگی اور فکر و تامل سے غور کئے جانے کے قابل ہیں

(چ)

باغ و بہار

(مولفہ میر امن دہلوی ، مع مقدمہ وفرہنگ مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو ، صفحات ۲۶۷ اوسط درجہ کی تقطیع ، لکھائی چھپائی نہایت نفیس اور پاکیزہ ، کاغذ عمدہ - قیمت مجلد تین روپیہ غیر مجلد دو روپے - ملنے کا پتہ : انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن)

باغ و بہار اردو زبان کی ان کتابوں میں سے ہے جو کسی تعارف کی محتاج نہیں - شاید ہی کوئی بدنصیب اردو داں ہوگا جس نے اسے پڑھکر لطف نہ اٹھایا ہو باغ و بہار کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی وہ اردو زبان کی بہت کم

کتابوں کو نصیب ہو سکی - اس کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے آسانی سے ہو سکتا ہے کہ اس کے لکھے جانے کے بعد ہی سے اس کی شہرت ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئی اور ایسے زمانے میں جب طباعت اور ذرایع آمدو رفت کی یہ سہولتیں میسر نہ تھیں اس کے سیکڑوں مطبوع و مخطوط نسخے بہت جلد تمام ہندوستان میں شائع ہو گئے تھے - چنانچہ دکن جیسے دور افتادہ حصہ ملک کے بعض شہروں میں اس کے ایسے قلمی نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں جو سال تصنیف کے ایک آدھ سال بعد کے لکھے ہوے ہیں —

اس کی مقبولیت کا راز اس کی فصاحت و سلاست ہے ' اس کی زبان اور بیان اس قدر سلیس ' پاکیزہ اور دلکش ہے کہ پڑھنے والا بے تکلف اور بے تکان پڑھتا چلا جاتا ہے ' اس میں رو یداد (پلاٹ) کی کوئی خاص خوبی نہیں لیکن اسلوب بیان کی سادہ اور فطری لطافتوں نے اس میں جو حسن پیدا کر دیا ہے وہ افسانہ نویسی کے اصول و ضوابط مشکل سے کر سکتے ہیں - میرامن کا یہ بڑا کمال ہے کہ وہ موقع محل کے اعتبار سے نہایت موزوں اور ٹھیٹ زبان استعمال کرتا ہے ' اس کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے وہ اپنےمافی الضمیر کو بے تکلف ' موثر اور دلنشین پیرایہ میں پیش کرتا ہے باغ و بہار کی تصنیف نے سنجیدہ نثر کا بنیادی پتھر رکھا اس کے بعد لوگوں کو نثر میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا ' اس لحاظ سے تاریخ ادب میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے کتاب بارہا چھپ چکی ہے اور اب بھی چھپتی جاتی ہے ' اس کا انگریزی میں بہت پہلے ترجمہ ہوچکا ہے -

اس کے مختلف اڈیشنوں میں اختلاف پیدا ہوتا جا رہا تھا اور اکثر غلط بھی چھپ رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی حیثیت ہی نہ بدل جاے ' اس لئے بڑی ضرورت تھی کہ خاص اہتمام سے اسے شائع کیا جاتا ' انجمن ترقی اردو کی یہ حق شناسی ہے کہ اس نے اسے کمال صحت ونفاست کے ساتھ چھپوا کر شائع کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے -

مولوی عبدالحق صاحب مدظلہٗ معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو نے اس کو مرتب کیا ہے ' اور اس پر بڑی تحقیق سے ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے - مقدمہ میں کتاب کے ماخذ کے متعلق جو غلط فہمی اب تک چلی آرہی تھی اور جس کا

شکار خود میرانیس بھی تھا اس کا ازالہ کیا ہے ، داخلی اور خارجی شہادتوں سے فاضل مرتب نے اس پر بحث کی ہے اور خاص انداز میں تنقید بھی کی ہے - بلغ و بہار پر بیسیوں مضامین لکھے گئے ہیں لیکن اس کو کسی نے اس کی اصل حیثیت میں اب تک پیش نہیں کیا تھا - مولوی صاحب کا مقدمہ تنقید و تحقیق کے اعتبار سے نہایت گراں قدر ہے -

اس کتاب میں کئی ایسے الفاظ و محاورات ہیں جن کے معنی و مفہوم بتانے سے ہمارے بڑے سے بڑے لغت بھی قاصر ہیں ، اس لئے مولوی صاحب نے اخیر میں مشکل و متروک الفاظ و محاورات کی فرہنگ بھی دیدی ہے جو بڑی تحقیق و محنت سے مرتب ہوئی ہے -

امید ہے کہ اردو داں حضرات ضرور اس کی قدر کریں گے اور طلبہ خصوصاً اس سے ضرور مستفید ہوں گے -

(چ)

حسن فطرت

(مصنفہ منشی گورکھ پرشاد صاحب عبرت مرحوم
گورکھپوری مطبوعہ اشاعت گورکھپور - چھوٹی تقطیع)

عبرت اچھے شاعر تھے اور ان کی شاعری عام شاعروں کی طرح غزل ہی تک محدود نہ تھی - مسدس عبرت مشہور نظم ہے جو اپنے وقت میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھی ، اس میں انہوں نے مسدس حالی کی بڑی خوبی سے تقلید کی تھی - اب تو لوگ بھول بھال گئے - اس مثنوی میں انہوں نے حسن و دل کے معاملات کو نظم کیا ہے - یہ وہ واردات ہے جس کا جلوہ ہر زمانے میں اور ہر مقام میں نظر آتا ہے - متقدمین نے نظم و نثر میں اس پر بڑی بڑی گلفشانیاں کی ہیں - حضرت عبرت نے بھی اس مثنوی میں کمی نہیں کی اور شاعرانہ انداز میں حسن و دل کے معرکوں کی خوب بیان کیا ہے - ان کے بیان میں سادگی ، بے تکلفی اور حسن پایا جاتا ہے -

---

غنچۂ تبسم

(مجموعۂ مضامین سید تمکین کاظمی صاحب - چھوٹی تقطیع - صفحات ۱۶۹ قیمت دو روپے ' مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن وغیرہ)

ظرافت ایک لطیف شے ہے اور اس کے لئے بڑی ذہانت کی ضرورت ہے - تمسخر ' پھکڑ اور چیزیں ہیں اور ظرافت بالکل دوسری چیز - بہت کم ایسے ادیب ہیں جو اسے خوبی سے نبھا سکتے ہیں -- بعض لوگ طبعاً ظریف ہوتے ہیں ان کی ظرافت میں ایک حسن ہوتا ہے گو بعض اوقات وہ حد سے تجاوز ہی کیوں نہ کر جائیں - اُن کی نظر میں خاص بات ہوتی ہے وہ وہیں پڑتی ہے ' جہاں پانی مرتا ہے - بعض طبعاً ظریف نہیں ہوتے مگر ظریف بننے کی کوشش کرتے ہیں اور ظریفانہ مضمون لکھتے ہیں - اس میں کچھہ تو نقل اور تقلید سے کام لتے ہیں اور کچھہ لفاظی سے ' مگر ان کی کوشش اکثر رائگاں جاتی ہے - اصل ظریف بعض وقت ایک فقرے بلکہ ایک آدھ لفظ میں ایسی کہہ جاتا ہے کہ دوسرا آدمی صفحے کے صفحے لکھہ جاے تو وہ بات پیدا نہیں کر سکتا - یا کبھی وہ ظرافت کے پردے میں ایسی نکتے کی باتیں لکھہ جاتا ہے کہ جن کی ذرا سی ٹھیس سے قدیم روایات اور توہمات کی بڑی بڑی عمارتیں ہل جاتی ہیں - اس مجموعے میں ایسے فقرے یا ایسی باتیں کہیں نظر نہیں آتیں البتہ بعض مضامین جن میں خاص خاص اشخاص اور مواقع کو بیان کیا ہے ایسے ہیں کہ اُسے پڑھنے والا دلچسپی سے پڑھے گا ' خصوصاً ایسے مضامین جن کا تعلق دکن سے ہے - عید کا بیان لکھا ہے خاصا ہے ' لیکن حیدر آباد کی عید میں ظریف کو ایسی پتے کی باتیں نظر آئیں گی کہ وہ لکھنے بیٹھے تو لطف پیدا کر دے - قابل مصنف اس میں کامیاب نہیں ہوے - اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی ظرافت کی تحریروں کا بڑا مقصد ہنسنا ہنسانا اور لطف پیدا کرنا ہے لیکن ان کی تہ میں کچھہ اور بھی ہوتا ہے - غرض ان مضامین میں اصل سے نقل اور سادگی سے تصنع زیادہ پایا جاتا ہے —

مذہب

مولود ہمایوں

(مرتبہ مولوی حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ - مطبوعہ مطبع عہد آفرین حیدر آباد دکن ' اوسط درجہ کی تقطیع - صفحات ۱۶۲ قیمت سوا روپیہ)

مولوی حاجی موسیٰ خاں صاحب اسلامی خلافت کے کار نامے پر ایک مستقل کتاب لکھ رہے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ خلافت کے کار نامے کی جھلک دکھائی جائے - پہلا حصہ چھپ چکا ہے جس میں اسلام سے پہلے دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت پر مورخانہ نظر ڈالی گئی ہے دوسرے حصہ کی پہلی جلد بھی چھپ چکی ہے جو ہمارے پاس تبصرے ' کی غرض سے وصول ہوئی ہے اس میں پیغمبر اسلام کی حیات پاک کے حالات (ولادت سے ہجرت تک کے) درج ہیں - فاضل مرتب نے محنت سے کام لیا ہے مستند اور وقیع مواد فراہم کرکے اس کو عالمانہ انداز میں لکھا ہے واقعات کی ترتیب بھی اصولی ہے نتائج اخذ و استنباط میں سلیقے سے کام لیا گیا ہے واقعات کی ترتیب میں اپنے مقصد تصنیف کو ہر جگہ پیش نظر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اصل مضمون سے ہٹنے نہیں پائے —

کتاب کی زبان اور بیان زیادہ سلیس اور عام فہم نہیں کم پڑھے لکھے لوگ اس سے سہولت سے مستفید نہیں ہوسکتے - بحیثیت موجودہ کیا بلحاظ ضخامت اور کیا بلحاظ انداز تحریر اوسط درجے کے پڑھے لکھے لوگ کم وقت میں کسی قدر سہولت سے آں حضرت صلعم کی سیرت کا مطالعہ کر سکتے ہیں؟ —

(پ)

میلاد النبی پروجکٹ

(مرتبہ محمد عبدالغفار صاحب ، جامعۂ ملیۂ اسلامیۂ قرول باغ - دہلی
چھوٹی تقطیع ' صفحات ۹۴ - قیمت آٹھ آنے)

اس سے قبل ہم اس پروجکٹ کا ذکر ان صفحات میں ہو چکا ہے ۔ جامعہ ملیہ کا یہ سلسلہ بہت کار آمد اور مفید ہے بچوں کی صحیح تعلیم کا یہ نہایت عمدہ طریقہ ہے ۔ اس سے اُن میں کام کرنے کا شوق ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ بصیرت بھی پیدا ہوتی ہے ۔ ہندوستان میں میلاد کہاں نہیں ہوتے لیکن اکثر مقامات پر جو طریقے اس مبارک کام کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں اُن سے کوئی معتد بہ فائدہ نہیں ہوتا اور بچے تو اسے بالکل نہیں سمجھتے اس کتاب میں جو منصوبہ تیار کیا گیا ہے اور اس پر جس طریقے سے بچوں نے عمل کیا ہے وہ بجائے خود ایک تعلیم ہے ۔ میلاد کے لئے ابتدا سے لیکر آخر تک جن جن باتوں کی ضرورت ہے وہ سب اس میں آگئی ہیں - بچے ہی سب اس کا انتظام کرتے ہیں اور سب کچھ، انہیں کے ہاتھوں انجام پاتا ہے استاد انہیں صرف رستہ سمجھا دیتا ہے جن صاحبوں کو بچوں کی تعلیم سے تعلق ہے نیز بچوں کے والدین کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے —

تاریخ

مرقع دہلی

(از نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالارجنگ خاندوراں -
مرتبہ حکیم سید مظفر حسین صاحب)

" مرقع دہلی " جس کا دوسرا نام حکیم مظفر حسین صاحب نے "دہلی بارھویں صدی میں " رکھا ہے ایک مختصر اور دلچسپ تذکرہ ہے - درگاہ قلی خاں بہادر

صالار جنگ موتمن الدولہ کے آبا و اجداد شاہجہاں کے عہد میں ایران سے ہندوستان آئے اور مناسب عالیہ پر مامور رہے - نواب درگاہ قلی بہادر نے ابتدائے عمر سے نواب مغفرت مآب - نظام الملک آصفجاہ کی نگرانی میں پرورش پائی اور پھر بھر ان کی مصاحبت میں رہے اور کار نمایاں کئے - نواب مغفرت مآب کے بعد نواب ناصر جنگ شہید نواب صلابت جنگ اور نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں مختلف عہدوں پر سرفراز رہے - اور آخر میں جب وہ صوبہ اورنگ آباد خجستہ بنیاد کی صوبیداری پر تھے سنہ ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی - یہ تذکرہ انھوں نے اس وقت لکھا جبکہ وہ نواب نظام الملک آصف جاہ کے ہمراہ سنہ ۱۱۵۱ھ میں دہلی گئے تھے —

اس تذکرے میں وہاں کے مزارات اور اُس وقت کے مشائخ شعرا مرثیہ خوانوں اور ارباب طرب کا مختصر سا ذکر ہے - ضمناً بعض حالات - معاشرت بھی آگئے ہیں جو صرف عیش و عشرت سے متعلق ہیں - بیان صاف ہے اور اس سے نواب مرحوم کا ذوق ادب ظاہر ہوتا ہے - وہ شاعر بھی تھے - بہر حال اس کے مطالعہ سے عہد محمد شاہی کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے -

اصل تذکرہ ۸۲ صفحے پر ہے - قابل مرتب نے ۹۹ صفحے کا مقدمہ لکھا ہے جسمیں مصنف کے خاندان اور خود مصنف کی زندگی کے حالات اور کتاب کا خلاصہ ہے - اور اس کے بعد ۱۶ صفحے پر اسناد وغیرہ کی نقول ہیں -

---

کلیات عزیز

(مجموعہ کلام خواجہ عزیز الدین مرحوم -
مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ - قیمت
مجلد چھ روپے ' غیر مجلد پانچروپے)

ایران کے بعد فارسی ادب و زبان کو فروغ ہوا تو ہندوستان میں ہوا - یہ زبان اب تک ہمارے اخلاق و عادات ' طرز خیال معاشرت اور ہماری زبان اور ادب پر چھائی ہوئی ہے - اس سر زمین میں ایسے ایسے فصیح و بلیغ اور بلند پایہ شاعر پیدا ہوئے کہ اہل زبان بھی ان کا لوہا مان گئے - مرزا غالب کے بعد خواجہ عزیز نے ایرانی تخیل اور شستہ ایرانی زبان کو بڑی شان

اور آب و تاب کے ساتھ زندہ رکھا۔ اس دور کا اب خاتمہ ہو چکا ہے، زمانے کی روش بدل گئی ہے، فارسی ہمارے لئے غیر زبان ہو گئی ہے لیکن بزرگوں کے کمال اب بھی دلوں کو گرمانے کے لئے کافی ہیں —

خواجہ صاحب بڑے قادرالکلام اور باکمال شاعر تھے اور ہر صنف سخن پر پوری قدرت رکھتے تھے اور یہ کلیات ان کے کمال کا شاہد ہے۔ علاوہ غزلوں کے چار مثنویاں ہیں۔ قیصرنامہ جس میں جنگ روم و روس کی داستان ہے سکندر نامے کی طرز پر اور نظامی کے رنگ میں کہی ہے۔ دوسری مثنوی گلگشت کشمیر، تیسری مثنوی ید بیضا، چوتھی ہدیۃ الثقلین، مسدس قصیدے اور بہت سے قطعات اور رباعیاں بھی ہیں۔ تاریخ بے تکلف کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ کلام استادانہ اور بلند ہے۔ زبان نہایت پختہ اور شیریں اور ہر قسم کی صنائع اور خوبیوں سے مملو ہے۔ غرض کہ خواجہ صاحب کا کلام بڑے بڑے اساتذہ کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم کے فرزند خواجہ وصی الدین صاحب مستحق شکریہ ہیں کہ ان کی وجہ سے یہ کلام محفوظ ہو گیا۔

نبیوں کے قصے

(مصنفہ مولانا خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی ـ مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ـ قرول باغ دہلی ـ صفحات ۸۰ ـ قیمت ۲ آنے ـ)

اس کتاب میں مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے رسولوں کی زندگی کے حالات سادہ زبان میں بیان کئے گئے ہیں ـ ان حالات میں بالخصوص ان محاسن کو اجاگر کر کے پیش کیا گیا ہے جن کے جانے بغیر ہمارے بچوں اور بچیوں کی سیرت کی تشکیل ناقص رہتی ہے ـ انسانیت کے ان محسنوں کے حالات نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کو بھی جاننا چاہئیں ـ اس چھوٹی سی کتاب میں ہمت نہ ہارنے، ثابت قدم رہنے، صبر سے کام لینے، صداقت کی رسی کو مضبوط پکڑنے اور زندگی کو ایک امانت سمجھنے کے سبق ہر صفحہ

پر ملیں گے -

زبان سادہ ہے اور بچوں کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی

(ی)

متفرق

مظاہر ذہنیات

(از ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب ، ایل ، ایم ، پی ، آئی
ایم ، ڈی دھولپور صفحات ۱۸۴ قیمت دو روپے)

اگرچہ تمہید میں فاضل مصنف نے یہہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہہ کتاب نفسیات کی تمام مستند کتابوں سے مدد لیکر لکھی گئی ہے ، لیکن اصل میں اس میں نفسیات کا حصہ بہت کم ہے ، بلکہ جا بجا عملی زندگی میں کامیابی کے متعلق ہدایت و مشورہ دیا گیا ہے - اگرچہ اس کتاب میں ترکیب دماغی ، حافظہ اور تخیل سے بحث کی گئی ہے ، لیکن چونکہ کسی قسم کی ترتیب اور باہمی ربط ان مباحث میں نہیں ہیں ، اس لئے بحیثیت نفسیات کے ایک رسالے کے ، اس کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے ، تحت الشعور کی اصطلاح فاضل مصنف نے جا بجا بیان کی ہیں ، لیکن انہیں تحت الشعور (سب کانشس) اور لاشعور (آن کانشس) میں التباس ہوا ہے - اسی طرح سے تحت الشعور کی بحث کرتے کرتے وہ شعور کائنات کی حد تک جا پہنچے ہیں اور اس طرح اس رسالہ کے ڈانڈے ما بعد الطبیعات سے ملادئے ہیں -

کتاب میں ابواب نہیں ہیں - اگرچہ مباحث جلی قلم سے ظاہر کئے گئے ہیں - لیکن خود ان میں کوئی ربط نہیں ، حافظہ ، تخیل ، اور توجہ کی بحث البتہ تفصیلی ہے ، لیکن ان کے ضمن میں بھی عملی فواید مثلاً اشتہار بازی کی کامیابی کا راز ، مطالعہ کرنے کا طریقہ ، اعتقادات کے حیرت انگیز کرشمے

وغیرہ بیان کئے گئے ہیں - مسمریزم اور عمل تنویم کرنے کے طریقے بھی بیان کئے گئے ہیں - جن کے متعلق ہماری صدق دل سے دعا ہے کہ خدا کرے کوئی نا تجربہ کار نو جوان ان کی مشق نہ شروع کرے -- آخر میں کچھ صفحات غذا اور لباس کے متعلق ہیں یہ گویا اس تصنیف کا طبی حصہ ہے - اور مفید ہے ' " کامیابی کے زریں اصول " پر کتاب ختم ہو جاتی ہے -

اگرچہ ہم اس کتاب کو نہ نفسیات کا رسالہ کہہ سکتے ہیں ' اور نہ طب کا ' لیکن چونکہ عملی زندگی کی کامیابی برابر فاضل مصنف کے ذہن میں رہی ہے - اس لئے امید ہے کہ اس کے مطالعہ سے ناظرین کو نفسیاتی معلومات کا شوق پیدا ہو جائے ' اور یہ بہت غنیمت ہے ' لکھائی چھپائی اچھی ہے ' قیمت دو روپے جو بہت زیادہ ہے — (و)

اعادۂ شباب و درازیٔ عمر

از

(ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب ایم - بی ' سی - ایچ - بی
(اڈنبرا) ایم - ڈی ' ایل - ایس - آر (برلن) سول سرجن مہد یکل
افسر فوج باقاعدہ سرکار عالی گولکنڈہ حیدر آباد دکن

کھوئی ہوئی جوانی اور درازیٔ عمر کا شوق آج سے نہیں بلکہ قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے اور اپنے اپنے وقت میں حکما اور اطبا نے طرح طرح کی کوششیں کی ہیں - آج کل ڈاکٹر ڈارونوف اور ڈاکٹر جاوور سکی نے اس باب میں خاص شہرت حاصل کی ہے - ڈاکٹر اشرف الحق صاحب نے اس خاص علاج کی تحقیق اور سیکھنے کی غرض سے یورپ کا سفر کیا اور پیرس اور برلن وغیرہ میں رہ کر اس فن کے اساتذہ سے اسے سیکھا ہے - اس مختصر رسالے میں انہوں نے اپنے تجربات کو بڑی خوبی اور صفائی سے بیان کیا ہے اور ہر ڈاکٹر کے طریقے کا جس نے اس علاج میں کمال حاصل کیا ہے صاف اور سلیس زبان میں ذکر

کہا ہے اور جو کتابیں ان ڈاکٹروں نے اس مبحث پر لکھی ہیں اُن کے نام بھی درج کر دئے ہیں۔ ان ڈاکٹروں کے عملوں میں جو فرق ہے اُسے مختصر طور پر لکھ دیا ہے —

ڈاکٹر صاحب نے اس کی تحقیق اور حصول ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود بھی عمل کو شروع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اشرف الحق صاحب نہایت ذہین شخص ہیں اور اگر وہ استقلال سے اس کام کو کرتے رہے تو یقین ہے کہ وہ بہت نام پیدا کریں گے۔

اردو کے جدید رسالے

ندیم

(مدیر سید ندیم الحسن صاحب رضوی۔ شریک، سید بشارت احمد صاحب رضوی۔ جاگیر دار کالج، بیگم پیٹ۔ حیدر آباد دکن)

یہ ماہانہ رسالہ جاگیر دار کالج حیدر آباد دکن سے سید ندیم الحسن صاحب مدرس کالج مذکور کی سعی کا نتیجہ ہے۔ اس کے دلچسپ اور خوبصورت بنا نے میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مضامین بھی نظم و نثر دونو کے خوب جمع کئے ہیں۔ ایک حصہ صرف طلبہ کے مضامین کا ہے وہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ ہز ایکسلنسی مہا راجہ بہادر صدر اعظم، سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ، کرنل سر رچرڈ ٹرنچ، نواب مسعود جنگ، نواب اکبر یار جنگ، نواب ذوالقدر جنگ بہادر نواب ولی الدولہ بہادر، نواب نظامت جنگ بہادر، خان فضل محمد خاں، نواب جیون یار جنگ بہادر، سر امین جنگ بہادر، نواب مہدی یار جنگ بہادر اور دیگر صاحبین کی تصویروں سے اُسے اور زینت ہو گئی ہے۔ کاغذ اعلیٰ درجے کا ہے اور چھپائی

بھی اس سے بہتر حیدرآباد میں نہیں ہو سکتی - ہم قابل مدیر کو اس عمدہ رسالے پر مبارک باد دیتے ہیں - خدا کرے یہ قائم رہے —

اردو ایسوسی ایشن میگزین الہ آباد

(اڈیٹر محمد حبیب الرحمن صاحب الہ آباد -)

یہ رسالہ الہ اباد یونیورسٹی کی اردو ایسو سی ایشن کی طرف سے شایع ہوا ہے اور اس کے اڈیٹر ایسو سی ایشن کے جوائنٹ سکرٹری محمد حبیب الرحمن خاں ہیں - تمام مضامین یونیورسٹی طلبہ کے ہیں اور ہر مضمون اچھا ہے جس سے طلبہ کا علمی شوق ظاہر ہوتا ہے ظاہری شان بھی قابل تعریف ہے - اگر ایسو سی ایشن نے اس معیار کو قائم رکھا تو بلا شبہہ وہ اردو کی خدمت انجام دے گی —

اعلان

ہندستانی ایکیڈیمی کی جانب سے دو انعام ہندی میں اور دو انعام اردو میں قیمتی ۵۰۰ روپیہ فی انعام ، حسب ذیل مضامین پر دیے جائیں گے :—

(۱) دماغی اور اخلاقی سائنس (Mental and Moral Science) (ہندی و اردو)

(۲) نظم (ہندی و اردو)

نوٹ :—

کتاب خود مصنف کی تصنیف کردہ ہو —

نظم کی کتاب میں ایک ہی مصنف کی نظموں کا مجموعہ ہو سکتا ہے یا ایک ہی طویل نظم ہو سکتی ہے —

انعام کے واسطے کتابیں ۳۱ اگست سنہ ۱۹۳۲ ع تک بھیجی جانی چاہئیں —

تاریخ مقررہ سے قبل دفتر هذا میں انعام کے لئے پیش کردہ ہر کتاب کی سات جلدیں روانہ کی جانی چاہئیں —

(دستخط) تارا چند

جنرل سکرٹری

ہندستانی ایکیڈیمی صوبہ متحدہ الہ آباد

یہ کتابیں بھی انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں

(تصانیف مرزا سجاد بیگ صاحب)

الفہرست	۱۰ روپے
الانسان	۲ روپے ۸ آنے
الاستدلال	۳ روپے
تمنائے صید (ناول)	۱۰ آنے
تسہیل البلاغت	۳ روپے

(مطبوعات ہندستانی اکاڈیمی)

عرب و ہند کے تعلقات	۴ روپے
کبیر صاحب	۲ روپے
اردو زبان و ادب	۱ روپیہ
ہندوستان کے معاشرتی حالات	۱ روپیہ ۴ آنے
ناتن	۲ روپے ۸ آنے
فریب عمل	۲ روپے

(کتابستان الہ آباد)

مثنوی ناسخ	۱۲ آنے
بس کا روکھہ	۱ روپیہ
تاریخ اسلامی حصہ اول	۸ آنے
... ... دوم	۹ آنے
... ... سوم	۱۰ آنے
... ... چہارم	۱ روپیہ

موحدین	۲ روپے ۸ آنے
اخبارالاندلس جلد اول	۱۰ روپے
... ... دوم	۸ روپے
... ... سوم	۷ روپے
تاریخ مغرب	۲ روپے ۸ آنے
خلافت موحدین	۴ روپے
عبادت اور اس کی غایت	۸ آنے
اساس عربی	۲ روپے
غریب القرآن	۲ روپے ۸ آنے

(تصانیف سید سجاد حیدر صاحب بی اے)

زہرا (ناول)	۸ آنے
خیالستان	۳ روپے
حکایات احتساسات	۱ روپیہ ۴ آنے
جلال الدین خوارزمشاہ	۱ روپیہ ۱۲ آنے
پرانا خواب (مع ۲ افسانے)	۱ روپیہ ۸ آنے
مطلوب دسیداں	۸ آنے
آسیب الفت	۱۲ آنے
پرانا خواب	۱۰ آنے

(مصنفہ برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب)

نہدا وانا عرف رواداری	۱ روپیہ ۸ آنے

اردو

جلد ۱۲ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء حصہ ۴۶

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

اردو لسانیات

از جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی
(یہ توسیعی لکچر حضرت کیفی نے کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد
دکن میں ۸ نومبر سنہ ۱۹۳۱ ع کو دیا تھا - سامعین نے اسے بہت
پسند کیا تھا - اس میں فاضل لکچرار نے بڑی خوبی اور دلاویزی کے
ساتھ اردو زبان کے بعض ایسے مسائل پر بحث کی ہے جو نہایت
اہم اور بنیادی ہیں اور جن پر زبان کی ترقی کا بہت کچھ دارمدار
ہے - ہمیں امید ہے کہ یہ محققانہ اور پر از معلومات لکچر غور اور
شوق سے پڑھا جائے گا —

(اڈیٹر)

زبان اصل میں انسان کے تعینات یا اداروں میں سے ہے - وہ اون کی
معمول ہے جن کی کار براری اوس سے ہوتی ہے - وہی اوس کے محافظ
اور مختار ہیں اونہیں نے عوارض اور ضروریات کے مطابق اوس کو اپنے
ڈھب کا بنایا ہے - ہمیشہ ہر کہیں ایسا ہی ہوتا ہے - زبان کا ہر جز و ترکیبی
مسلسل تغیرات کا ماحصل ہے جو اہالیان زبان کے ارادے اور رغبت سے
عمل پزیر ہوا - یہ لوگ تاریخی عوارض ' انسانی فطرت اور داعیے کے تہاجم
سے متاثر تھے جن کے نشانات ہماری نظر میں صاف نمایاں ہیں - اور یہی
زبان کو سائنٹیفک تحقیق و تفحص کا شایاں موضوع قرار دیتے ہیں -

انھیں امتیازی اعتبارات سے مطالعۂ زبان کی نوعیت کا مثل تاریخ و اخلاقیات کے تعیّن ہوتا ہے —

زبان انسانی تہذیب اور نوع انسان کی تاریخ کا ایک شعبہ ہے ۔ زبان متعدد علوم سے استعانت کرتی ہے ۔ لیکن باوجود اس کے انسان کا ذہن افکار کے اظہار کی تلاش اور چھان بین میں زبان کی ترقی و حل معضلات اور روابط ونتایج کے درمیان ایک قسم کی حد وسطی ہے ۔ تاریخ کی مانند زبان کی بھی تحلیل علمیہ مثل کیمیا اور طبیعات کے ایک معمل میں ممکن ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معمل میں اوسی شے کا دخل ممکن ہے جو امر واقعہ ہو اور قانون قدرت کے کُلیّہ کے تحت جگہ پاسکے ۔ زبان امر واقعہ تو ہے مگر بہ تقاضائے نوعیت ہمیشہ معرض تغیرّ میں ہے اور یہی مابہ‌الامتیاز لسانیات کو دوسرے علوم سے حاصل ہے —

لسانیات کے باب میں تحلیل و تجزئے کے وہ اصول عہدہ برآ نہیں ہوسکتے جو طبیعات و مادیات پر حاوی ہیں ۔ زبان سالمات یاسالبات کے قدغن سے مبرّا ہے ۔ ہاں علما کوشش میں ہیں کہ زبان کو سائنس ۔ کہئے علم نفسیات وصوتیات کے تحت لائیں ۔ اس ضمن میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اول الذکر جیسا کہ اس وقت ہے ضرور یہ شان رکھتا ہے کہ لسانیاتی مسائل پر اس کے خاص نظریوں کی روشنی میں فکر کی جائے ۔ یہ امر متقدمین اردو کے ذہن نشین تھا ۔ اہالیان اردو نے زبان کی طرف سے علمی تخیّل کو کبھی طلاق نہیں دی ۔ افعال کے صیغوں کی تنظیم ۔ سائنٹیفک اصول پر صفت و موصوف اور مضاف و مضاف الیہ کی تقدیم وتاخیر کا آئین — حروف جار کی معنوی حیثیت کی تعین — اسلوب اور زبان کی داخلی استعداد کے مطابق مرکبات کی توضیع ۔ تاریخ کے موقعوں پر تصرف کا مستحسن استعمال

محاورے کی سلاست اور منطقی تدوین -- ضرب الامثال کی عمومیت اور کلیت اور قوت تالیف -- اور تعقید و اضمار قبل الذکر کی معائب انشا میں شمولیت وغیرہ وغیرہ -- وہ امور ہیں جو عہد قدیم و متوسط میں اہالیان اردو کے حسن شعور اور سلیقہ تنظیم کی ہزار زبان سے داد دیتے ہیں -- ان میں سے بعض امور جستہ جستہ آپ کی توجہ کے لئے پیش کئے جائینگے —

خدا معلوم وہ دن اردو زبان کے حق میں کتنا اہم اور نتیجہ خیز تھا جب حضرت شاہ سعداللہ گلشن نے شمس الدین " ولی " کو یہ ہدایت کی :—

" ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ بہ کار ببر -- از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت " ترجمہ

یہ اتنے سارے فارسی کے مضمون جو بیکار پڑے ہوئے ہیں ان کو اپنے ریختے میں استعمال کر - کون تجھ سے جایزہ لیگا —

استاد کی ہدایت کی تعمیل میں وہ مضمون تو شاگرد رشید نے اٹھا لئے جن کی بدولت اس کے کلام کو شہرت دوام کا تمغا نصیب ہوا مگر زبان اس شاہ جہان آباد کی اردو معلیٰ ہی رکھی -- شاہ صاحب کا منشا یہ تھا کہ ولی دکنیت کو ترک کرکے اردو زبان کو ایران کی نغز گفتاری -- تشبیہ و استعارہ وغیرہ محاسن کلام یا اصناف شعری سے متمول کرے انہیں کیا خبر تھی کہ تین صدی بعد ایسا زمانہ آئیگا کہ اوس مفید مشورے کے الٹے معنی لئے جائینگے -- اور چند حروف جار اور امدادی افعال وغیرہ کے سوا اردو کلمے کلام سے خارج کردئے جائینگے —

اردو نے قدیم اور متوسط زمانوں میں کیا لسانی ترقی کی اور اس اعتبار

سے اب اوس کی کیا حالت ہے -- اس کا مجمل تذکرہ آج کیا جائیگا -- تحقیق اس امر کی منظور ہے کہ عہد حاضر میں اردو لسانیاتی اعتبار سے کس درجہ کو پہونچی ہے اور یہ کہ وہ حالت اطمینان کے قابل ہے یا نہیں؟ یہ تحقیق نہ صرف اس یا اوس جماعت بلکہ ہر شخص کا فرض ہے جو اردو کو اپنی زبان کہنے کا دعوی کرتا ہے —

زبان کے ترکیبی فعلوں میں سے یہاں صرف دو کا ذکر کیا جائیگا -- یعنی اختراعی یا ابداعی استعداد اور اخذ کی قابلیت -- یہی دو علامتیں ایک زبان کے سرجیون ہونے کی ہیں - یہ قابلیت اور استعداد جب کسی زبان میں زایل ہو جاتی ہے تو اوس کی ترقی کا رستہ مسدود ہو جاتا ہے -- اور اسباب بھی ہیں جو زبانوں کی ترقی بلکہ زندگی کے مزاحم ہوتے ہیں - جیسے رواج و پسند عام کو قطعاً نظر انداز کردینا اور زبان سے متعلق ہر امر کو سائینٹفک تنقیح قرار دیکر قاعدے کے قیود و تعینات میں جکڑ بند کردینا جیسا کہ سنسکرت کے ساتھ وئیاکرنیوں نے کیا -- میں مانتا ہوں کہ قاعدے اور آئین کی ضرورت مسلم ہے لیکن اوس کا استبداد اور بارن تولے پاورتی جیسے یقینیات عامہ کا حکم ناطق زبان کی شبابیات اور ابج کا دشمن ہے - یہ یاد رکھنا چاھئیے کہ اختراع بغیر حسن شعور اور ذوق سلیم کے اور اخذ بغیر تصرف حسنہ کے ممکن نہیں -- اردو کی موجودہ حالت دیکھکر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ بیچاری اوس مقام کے قریب تو نہیں پہنچ رہی ہے جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا -- اگر ہم انانیت اور برخود غلط ہونے سے دور ہٹ کر نظر غایر سے کام لیں تو خوف ہے کہ شبہ یقین کے قریب پہنچ جائیگا —

لسانیات اور ادبیات یا کہئیے کہ زبان اور لٹریچر میں جو امتیاز ہے

اوس کی تصریح کی ضرورت نہیں - مختصر یہ کہ یہ امر تمام اردو دنیا کا دل بڑھانے
اور امید دلانے والا ہے کہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے دارالترجمہ کا محض تتمہ نہیں
یعنی کسی خطّ تو اماں کا ورق ثانی نہیں بلکہ زبان کی ترقی واصلاح
بھی اس کے مقاصد میں سے ہیں - آج کا موضوع محض اس غرض سے انتخاب
کیا گیا کہ جامعہ کے معزّز آر اکین و اصحاب حلّ وعقد اور دوسرے ادیب
اور نکتہ رس اصحاب جو اس صحبت میں تشریف رکھتے ہیں - اون کی توجّہ اس
طرف منعطف کی جائے - یعنی اردو کی لسانیاتی حالت کی جانب تاکہ وہ
بزرگ اس کی کیفیت و کمیت کا موازنہ کریں - اس لحاظ سے شاید ہندی
بھی اوسی ضغطے میں ہے جس میں اردو ہے - لیکن میرا روئے سخن
اردو کی طرف ہے —

عرض کیا گیا ہے کہ جب کوئی زبان اختراع و اخذ کے بارے میں
قوّت فعل سے عاری ہوجاتی ہے تو ارتقا کی شاہراہ سے بھٹک جاتی ہے -
اگر ابھی سے روک تھام نہ کی گئی تو خوف ہے کہ اب سے دور یہ موذی
مرض کہیں لاعلاج نہ بن جائے —

پہلے اس کا جایزہ لیا جائیگا کہ اردو کی لسانی ترقی سے متعلّق
متقدمین اور متوسطین نے کیا کچھہ کیا - اور پھر بتایا جائیگا کہ اون کے
متعا قبین اور عہد حاضر کے کارنامے کیا ہیں - لیکن یہ سب امور ایک واحد
لکچر میں احاطہ نہیں ہو سکتے - جو کچھہ کہا جائیگا بالاجمال ہوگا —

متقدمین کرام کو جس وقت یہ چیتک لگی کہ اردو یا ریختہ کو
منظم کریں تو اون کے سامنے کوئی مکمل دیسی ہندوستانی نمونہ موجود
نہ تھا - اوس وقت کی ہندی یا برج بھاشا - سورسینی یا پراکرت کو آج
کل کے لسانیاتی معیار اور اصول کے متبع مکمل نہیں کہاجاسکتا - کیونکہ اگر

کسی میں اعلیٰ نظم موجود تھی تو نثر مفقود - اور کسی میں نثر تھی تو نظم مہتمبالشان ندارد تھی - اس لئے تحقیق اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ " ھندیرانی " مسالے سے جوبت تیار ہوا تھا اوس کی پوشاک تو ھندوستانی رھی لیکن اوس کے لئے زیور کچھہ ھندوستان اور زیادہ تر ایران کا استعمال کیا گیا - یہ آپ جانتے ھیں زیور کس قدر پیارا اور سہانا ھوتا ھے —

اردو زبان کی تدوین و تزئین کے بہت سے اصول اور طریقے بتائے گئے ھیں - لیکن جو گر سیدانشا مرحوم نے دریافت کیا فلسفۂ زبان کا سرتاج ھے اور رھیگا جب تک اردو زندہ ھے - آپ فرماتے ھیں :—

" مخفی نہ ماند کہ ھر لفظے کہ در اردو مشہور شد عربی باشد یافارسی یا ترکی - یا سریانی - یا پنجابی یاپوربی - ازروئے اصل غلط باشد یا صحیح - آں لفظ لفظ اردوست - اگر موافق اصل مستعمل است ھم صحیح و اگر خلاف اصل است ھم صحیح - صحت و غلطی آں موقوف بر استعمال پزیرفتن در اردو است - زیرا کہ ھرچہ خلاف اردوست غلط است گودر اصل صحیح باشد - و ھرچہ موافق اردوست صحیح باشد گودر اصل صحت نہ داشتہ باشد " * —

ترجمہ

یادرکھنا چاھئےکہھرلفظجواردو میں مشہور ھو گیااُردوھوگیا - خواہ وہ عربی ھو یا فاسی - ترکی ھو یا سریانی - پنجابی ھو یا پُوربی — ازروئے اصل غلط ھو یا صحیح — وہ لفظ اردو کا لفظ ھے - اگر اصل کے مطابق ھے تو بھی صحیح ھے اور اگر اصل کے خلاف مستعمل ھے تو بھی صحیح ھے — اوس کی صحت اور غلطی اردو میں اس کے استعمال میں آنے پر منحصر ھے - کیونکہ جو اردو کے خلاف ھے غلط ھے - خواہ وہ اصل زبان میں صحیح ھو — اور جو اردو کے موافق ھے صحیح ھے خواہ وہ اصل میں صحیح نہ بھی ھو — "

---

* دریائے لطافت —صفحہ ۲۴۱ —

سید مبرور نے ان چند فقروں میں تہذیب لسان کے ضابطے کا لب و لباب پیش کر دیا ہے - اسی اصول پر اُردو بنی اور پروان چڑھی - اسلاف کا دستور العمل یہی تھا- یہ تصرفات اُردو جن کو میں ایک لفظ 'تاریہ' سے تعبیر کروں گا تفریس و تعریب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور رکھیں گے جب تک اُردو زندہ اور چالو زبان ہے - کیونکہ اول تو وہ عربی یا سنسکرت کی طرح صرفی زبان نہیں اور دوسرے یہ کہ اُس کی بنیاد ہی کات چھانت اور تصرف ہے - اس سے بحث نہیں کہ آیا زبان کی ساخت کا یہ گر اردو والوں نے ہندی سے سیکھا جس کا بہت امور میں سنسکرت سے انحراف بدیہی ہے- بہرحال کامل تحقیق اب اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ دسویں صدی عیسوی کے قریب سورسینی آپ بھرنش سے مغربی ہندی نکلی جس کے میل سے دوآبہ گنجم * میں ایک نئی زبان پیدا ہوئی - اسے مستشرق اور لسان ہندوستانی کہتے ہیں- پھر اس کی دو شاخیں ہوگئیں - جس کی وجہ اول اول زیادہ تر رسم الخط تھی - یہ دو شاخیں آپ کی ہندی اور اردو ہیں - زبان کی تاریخی روداد کے اس مجمل حوالے سے میرا مطلب یہ ظاہر کر دینا ہے کہ جو دعوی ہم اردو کے بارے میں کرتے ہیں بہت ممکن بلکہ اغلب ہے کہ اوس میں ہندی والوں کا بھی حصہ شریک ہے - کیونکہ یہ امر ثبوت اور استدلال کا محتاج نہیں کہ جب تک ہندوستانی دو شاخوں میں منقسم ہوکر جداگانہ ضبط تحریر میں نہ آئی سب برابر کام کرتے رہے اور اُسے بناتے رہے —

---

* میں نے اُس حصۂ ملک کو جو دریاے گنگا اور جمنا کے بیچ میں واقع ہے دو آبہ گنجم نام دیا ہے —

اس سلسلے میں پہلے اسموں کو لیا جاےگا۔ اردو والوں نے نہ صرف یہ کیا کہ الخالق کو الخالق (پوشاک کی ایک چیز جیسے اچکن) جاجِم کو جاجَم اور موسِم کو موسم بنا لیا بلکہ بہت سے عربی الفاظ کی جنسیت بھی بدل دی۔ فارسی خوش نصیب تھی کہ اُس نے یہ بکھیڑا پالا ہی نہیں۔ مثلاً شمس جو عربی میں مونث تھا اردو میں مذکر ٹھیرا۔ آپ کہیں گے یہ مداخلت بیجا کیوں؟ یہ تو سخت لسانی بدعت ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اس لغت کے لئے اُن کے پاس صرف دو متبادل طریق عمل تھے۔ یا تو وہ اس لفظ کو لیتے ہی نہیں اور لیتے تو اُس کے مترادف لغت ہندی کی جنسیت کا اتباع لابد تھا۔ جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا یعنی سورج۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ غیر زبانوں کے اسموں کی تذکیر و تانیث سے متعلق اُن کا نظریہ یہ تھا کہ اُن کو دیسی اسموں کی جنس کا متبع کرتے تھے۔ مدتوں اہل اُردو اسی دستور پر چلتے رہے اور جو محتاط ہیں اور ذوق سلیم رکھتے ہیں اب بھی اسی پر عامل ہیں۔ اُنھوں نے 'منددل' کو 'مَندیل'۔ 'جادہ' (بر وزن 'مادہ') کو جادہ۔ 'توشک' (بعز فوقانی سب حرف ساکن) کو 'توشک' اور بغچہ (غین معجمہ) کو بقچہ کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں جلدی سے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان اور بیسیوں دوسرے الفاظ میں تصرف کی معقولیت اور وجاہت کے حق میں زبردست دلائل پیش ہوسکتے ہیں۔ جس کا یہ موقع نہیں۔ تصرف کا عمل الفاظ فارسی و عربی کی صوتی حیثیت یعنی تلفظ اور جنسیت تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اصل معنوں میں بھی تصرف کئے گئے۔ 'تحفہ' سوغات کے معنی رکھتا تھا لیکن وہ اچھے۔ سجل اور تازے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا—

وہ زمانہ بیسویں صدی عیسوی کا زمانہ نہ تھا کہ بات بات میں

ملی- پچھ نکالی جاتی - اُن لوگوں کے نزدیک ھندو مسلمان اور اُن کے مذھب یا مذھبی روایتیں اور اصطلاحیں یکساں تھیں - اُنھوں نے اپنی زبان کو بنانے اور سنوارنے کا عزم کیا تھا - شدھی یا تبلیغ کا نہیں - اُن کا قول و فعل تھا " عیسیٰ بدین خود و موسیٰ بدین خود " خیر - قرآن کا جامہ پہننا اور گنگا اُتھانا تو رہا ایک طرف انھوں نے صلواۃ جیسے لغت کے معنی میں بھی جو جناب رسالت مآب کی مقدس ذات سے مخصوص ہو چکا تھا تصرف کیا - اگرچہ اتنا پاس ادب ضرور رھا کہ اُسے محض صیغہ جمع تک محدود رکھا - میر تقی 'میر' مغفور فرماتے ھیں :—

پڑھتا تھا میں تو سبحہ لئے ھاتھ میں درود
صلواتیں مجھ کو آ گے وہ نا حق سنا گیا

اُنھوں نے گنگا کو اُلٹا کر پھر شوجی کی جٹاؤں میں پہنچا دیا - منشی اسیر کا شعر ھے :—

ھم تو پیاسے رھے سے غیر کو دی پیر مغاں!
اُلٹی اس شہر میں بہتی ھوئی گنگا دیکھی

اصل میں تھا :— " لا اِلی الذین و لا الی الذّین " یعنی نہ اُن میں سے نہ اُن میں سے - اس سے بنا لیا اِلّذی نہ اُلّذی - بمعنی مذبذب - ڈانواں ڈول - چنانچہ سید رضی نے کہا :—

نہ تو عاشقوں ھی میں جا ملی نہ وہ فاسقوں سے بنی رھی
تری وہ مثل ھے اب اے رضی کہ اللّذی نہ اللّذی

کلمہ مقدس 'لن ترانی' کی شان ورود تشریح کی محتاج نہیں - اس کے معنی قرار پائے خود ستائی - انانیت - شیخی وغیرہ - شیخ ناسخ نے فرمایا :—

لنترانی سنتے ہیں دیدار سے محروم ہیں
یعنی اس حیرت کدہ میں کور ہیں ہم کر نہیں

ٹھاکروں کی پوجا میں سب سے پہلے گنیش جی کی پوجا کی جاتی ہے - مگر وہ بھی تصرف و اختراع کی زد سے نہ بچ سکے - "گوبر گنیش" کا مرکب آپ کے روز مرہ اور لغات میں موجود ہے —

سامعین کرام - ذرا بگلا بھگت ' اور ' ولی کھنگر ' کی طرف التفات فرمائیےگا - کیا برابر کی جوڑ ہے - شوق قدوائی مرحوم نے فرمایا —

کھویا انہیں شوق کیمیا نے اے شوق
لوٹا انہیں جھوٹے فقرا نے اے شوق
کامل نہیں ایک اور ولی کھنگر لاکھہ
بس دور کے ڈھول ہیں سہانے اے شوق

' رام کہانی ' ہندؤں کے ہاں رامچندر جی کی کتھا کو کہتے تھے - اردو والوں نے اس کے معنی میں تصرف کرکے اس طرح استعمال کیا - جرات مرحوم کا ارشاد ملاحظہ ہو :—

درد دل اوس بت بےدرد سے کہئے تو کہیے
جا کے یہ رام کہانی تو سنا اور کہیں

کھٹ سنسکرت میں چھہ کا نام ہے - کھٹراگ کے لغوی و اصطلاحی معنی ہیں چھہ راگ - یہ مرکب اون چھہ مول راگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جن سے اور بہت سی راگنیاں نکلی ہیں مگر اردو میں اس کے معنی کے کے اور سُر کیا ٹھاٹھہ ہی بدل دیا - صبا کا شعر ہے :—

پڑے ہیں عشق کے کھٹراگ میں ہم اے مطرب
کسے خیال ہے دھرپد - ترانے تروٹ کا

مرکب اسموں کے سلسلے میں ایک اور لفظ کا ذکر کیا جائے گا وہ ہے "کُت بدّیا" - اس کے معنی آپ جانتے ہیں مار پیٹ زدوکوب یہ وہ بدیا ہے جو بے سکھائے پڑھائے آتی ہے —

مبادا آپ سنتے سنتے اکتا جائیں اس لئے اب اس سلسلے کو ختم کرتا ہوں - میں نے کئی سو لفظوں کا ایک نقشہ مرتب کیا ہے جن میں اسم بھی ہیں اور افعال و ضمایر وغیرہم بھي - اس کے چھہ خانے رکھے ہیں (۱) اردو (۲) ہندی (۳) پنجابی (۴) اپ بھرنش (۵) پراکرت اور (۶) سنسکرت۔ اس موقع پر سارا نقشہ پیش کرنا تو طول امل ہے نمونے کے طور پر پانچ چھہ لفظ عرض کئے جائیں گے جو اردو والوں نے اخذ و تصرف کے سلیقے کا بین ثبوت پیش کرتے ہیں —

اردو	ہندی	پنجابی	اپ بھرنش	پراکرت	سنسکرت
چھانو	چھئیاں	چھاں	چھاؤ	چھاآ	چھایا
بیکا	بانکا	ویںگا	وَنکڈُو	وَکّئُو	وکْر ک
ڈِھیت	ڈِھیتّھ	ڈھیتّھ	ڈھٹّھُو	ڈِھٹّھو	دِھرِشٹ
سچ	سانچ	سَچّ	سَچّ	سچّم	سَتْیم
کوڈَل	کوڈِل	کول	کوئِل	کوئِلا	کوکِلا
دِکھا	دِیکھا	ڈِٹھا	دِتّھو	دِٹّہ	دِرشٹ

حفظ مراتب کی نظر اور ادبی روا داری ملاحظہ فرمائیے گا - ایک لفظ کو مفرد حالت میں تو اپنے ڈھب کا بنالیا مگر مرکب حالت میں اوس کی اصلی ہئیت کو ہاتھہ نہ لگایا - مثلاً سانچ کو بدل کر سچ کرلیا لیکن " سانچ کو آنچ نہوں" اس میں سانچ ہی رہنے دیا - اسی طرح ہست سے بتدریج "ہتھ" بنا - جب ہمارے ہتے چڑھا تو ہم نے اس کو ہاتھہ بنا لیا لیکن

مرکبات میں اس کی وهی سورسینی شکل قائم رکھی - جیسے " هتهه چُهٹ " " هتهه پهیری " " هتهه پهول " - " هتهه کهنڈا " - پُهلّم سے پهول بنا مگر مرکب پهلجهڑی اور پهلکاری میں اصل شکل قائم رکھی - اسی طرح سورسینی " نک " میں الف ایزاد کرکے " ناک " تو بنالیا لیکن " نکتوڑا " نکٹا میں اس کی هئیت کذائی قائم رکھی —

قدما اور متوسطین کی نکته رسی اور معنی آفرینی کی کہاں تک داد دی جائے - ایک معمولی لفظ ' خوف ' کو لیجئے - اس کے کتنے مترادف الفاظ وضع یا اختراع کئے - یا تصرف سے کام میں لائے اور اون کو وہ وہ معنی پہنائے که نفسیات کا ماهر دنگ رہ جاتا هے - ملاحظ هو : -

ڈبدا - جهجک - بهچک - سانسا - کهٹکا - دهڑکا - سهم - سنّاٹا - دهچکا - ڈر -

یه سب کلمے خوف کے مختلف درجوں کو واضع کرتے هیں اور پکار کر کہه رهے هیں که هماری زبان کا دامن کتنا فراخ هے —

مرکبات کو دیکھئے - " سرتکا " سے ادل بدل هوتے هوتے ماٹي بنا - اس بهاشا کی ماٹی کو انهوں نے مٹی بنا لیا اور پهر اوس سے نهایت اهم مرکب توصیفی تیار کیا یعنی مٹیالا - میرے خیال میں یه مرکب سنسکرت کی سندهی کے قاعدے پر بنا هے - بے محل نه هو گا اگر گریمر کی اس اصطلاح سندهی کی نسبت یہاں دو لفظ کهدئے جائیں - جب ایک لفظ ایسے حرف پر ختم هو که اوس کی آواز متعاقب لفظ کے اول حرف کی آواز کے ساتهه آسانی سے پیدا نه کی جا سکے تو اون حروف میں سے ایک حرف کو کبهی کسی کبهی کسی حرف سے بدل دیتے هیں - یا کهئے ایک حرف کو حذف کر کے اوس کی جگه ایک نیا حرف ایزاد کر دیتے هیں - سنسکرت کا اصل فقره تها " دَدِهی آنے " چونکه ' ای ' اور ' آ ' دونوں کی آواز یکے بعد دیگرے ادا نهیں هو سکتی تهی اس

واسطے اس کا " دھیانے " بن گیا - اسی طرح " روی آتی تھکشنو بھوتی " میں آتی کے الف کو " ر " سے بدلا اور ' روی رتی ' - بنا دیا آپ نے دیکھا اب جس کو ہمارے ہاں تنافر حروف کہتے ہیں رفع ہو گیا - سنسکرت میں یہ قاعدہ یعنی سندھی کا قاعدہ مہتم بالشان حیثیت رکھتا ہے - میری تحقیقات میں اکثر ' انڈو یوروپین ' یعنی آریائی زبانیں اس پر کم و بیش عمل پیرا ہیں فارسی کو لیجئے ' بندہ ' اور ' مژہ کی ' جمع ' الف ' ' نون ' سے بنانی تھی - دیکھا کہ ہائے مختفی کے ساتھ الف کا میل نہیں - چنانچہ ' بندہ ' اس کے بدلے بندگا ن ' اور ' مژہ ان ' کے بدلے ' مژگاں ' بنایا - یعنی ہائے مختفی کو ' گ ' سے بدل دیا - یہ دقت اور سندھی کے اصول کی پابندی کی ضرورت وہیں آ کر پڑتی ہے جہاں دونوں طرف حرف علت ہوں - یا ایک طرف ہائے مختفی اور دوسری طرف حرف علت —

ایک خاص فقرے کے تلفظ پر آرنلڈ بنٹ کا غصہ سرا سر بے محل تھا جب اوس نے ' وسٹ انڈ ' کے ایکٹروں کی زبان سے سنا : —

" سوڈا رینڈ ملک "

وہ سمجھا کہ " سوڈا اینڈ ملک " کی مٹی خراب کی ہے جاہل ایکٹروں نے * مگر مغربی لندن کے جاہل ایکٹر نادانستہ پانٹنی کا اتباع کر رہے تھے - جس نے " روی آتی " کو " روی رتی ' بنا دیا - وضع کرنے والے نے کیوں نہ سوچا کہ دو الف پیہم آواز نہیں دے سکینگے - لوگوں کو اس ترکیب کی غیر فطری ادا کا احساس ہوا اور اب وہ اور تو کچھ نہ کر سکے " ملک اینڈ سوڈا " اور " وھسکی اینڈ سوڈا ' بولنے لگے —

---

* تفصیل کے لئے دیکھو (Modern English in thi Making مصنفۂ جارج میکنا ئٹ - صفحہ ۵۶۹

اس ضمن میں ایک مثال انگریزی زبان سے اور پیش کی جائیگی ۔ یہاں اوسی سندھی کے اصول کو قاعدے کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ۔ انگریزی گرامر کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جو لفظ حرف علت سے شروع ہو اوس کے پہلے اے (A) بمعنی ایک نہیں لاتے بلکہ ' آین ' An لاتے ہیں ' اے بک ' تو ٹھیک لیکن اے ایکٹ غلط ۔ کیوں کہ دو الف کی آواز ایک سا تھہ نکا لنا آلات نطق کے بس کا روگ نہ تھا اس لئے (N) یا نون بڑھا کر (A) کا آین بنانا پڑا ——

عجمی جب عربی زبان کے قاعدے باندھنے بیٹھے تو ان کا ذہن سندھی کے اُس اصول سے متاثر تھا ۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے فصاحت سے متعلق تنافر حروف پر بہت زور دیا ۔ لیکن چونکہ عربی ان کی مادری زبان نہ تھی اور سامی حروف کی صحیح آواز پیدا کرنے سے ان کے آلات نطق عاری تھے نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں تنافر حروف نہ تھا وہاں بھی انگلی رکھہ گئے ۔ سب جانتے ہیں کہ ہائے ہوز اور حائے حطی کی آوازیں جدا جدا ہیں لیکن غیر اہل زبان اپنے منہ سے اُس امتیاز کو ظاہر نہیں کرسکتا ۔ اسی طرح بعض شاعروں نے جن کے آلات نطق الف اور عین کی صحیح سامی آواز پیدا کرنے میں قاصر تھے الف کی طرح عین کو بھی گرا دیا ہے ——

مرکب افعال ایسے ایسے مرتب اور وضع کئے کہ اس بارے میں شاید کوئی زبان اردو کا مقابلہ کرسکتی ہو ۔ مثال کے لئے ایک معمولی مصدر ' لکھنا ' کو لیجئے ۔ ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے :—

(۱) خط لکّھو

(۲) خط لکھدو

(۳) خط لکھڈالو

(۴) خط لکھہ چکو

آپ ان چار جملوں کے معنی جانتے هیں - ترکیب نے جو زور اور معنوی امتیاز فعل کو بخشا هے اُس کو بهی محسوس کرتے هیں - اردو کی لسانیاتی وقعت جو اوسے اصلاح نے عطا کی ایک اور واقعه سے ثابت هے علما کے اس مجمع کے سامنے اس توجیهه کی ضرورت نهیں که همارا مجموعه تعزیرات هند شاید جستی نین کے ضابطۂ قانون کے سوا سیاسی قوانهی میں مکمل بلکه اکمل تسلیم کیا جاتا هے - یورپ کے کئی ملکوں میں اس مجموعه کو آگے رکهه کر ضابطے مدون کئے گئے - باوجود اس کے یه مجموعه بهی اُردو کا مرهون منت هوئے بغیر نه ره سکا - اور لارڈ مکالے جیسا وحید عصر اور بے بدل منشی اُردو کے سامنے هاتهه پهیلانے پر مجبور هوگیا - یه اشاره هے دفعه ۵۰۸ کی تشریح الف کی جانب جس میں لفظ ' دهرنا ' قدرے الحاقی تصرف کے ساتهه استعمال هوا هے - ' دهرنا دینا ' کے معنی آپ کو معلوم هیں جو هیں —

اونهوں نے ماخذ کی پروا نه کر کے ماخوذ سے واسطه رکها اور اوسے اپنے مطلب کا بنالیا - چنانچه عربی یا فارسی لفظوں کی جب اپنے قاعدے کے بموجب جمع بنانے لگے تو حرف ثانی کی حرکت کو حذف کردیا - 'محل' کی جمع بنی 'محلوں' - حائے حطی کی حرکت غائب - اسی طرح ' نظر ' کی جمع بنائی ' نظروں ' نه که ' نظَروں ' —

اگر اونهوں نے فارسی اور عربی یا سنسکرت کے لغات کی اندهی تقلید کی هوتی تو اُردو کو یه لغاتی تمول هرگز نصیب نه هوتا - اب جو کوئی " ازالته الاغلاط " یا " تصحیح اللغات " وغیره کا نام لے تو سمجهه لو که وه اُردو کا اهل نهیں —

' صفات ' میں بهی ایسے مرکب وضع کئے که انسان حیران ره جاتا هے

کہ کن الفاظ میں ان کے ذہن رسا اور جدت آفرینی کی توصیف کرے ' سیتلا مُنہ داغ ' اور سیتاستی ' کو ملاحظہ فرمائیے - اس مرکّب توصیفی وسیتاستی ' کے معنوں میں لکّھا گیا ہے " ہندی - مسلمان عورت " یعنی یہ مرکب مسلمان عورتوں کے استعمال سے خصوصیت رکھتا ہے - اس کے معنی ہیں :- " عفیفہ - بیوی زن - جس کے دامن پر نماز جایز ہو " -
یہ معنی وہ ہیں جو مسلمان مولف اس لغت کے سامنے لکھتا ہے —

صفت نسبتی میں انھوں نے نہایت دلچسپ تصرف سے کام لیا - " تاریخ فیروز شاہی " آپ نے دیکھی ہے - یہ بھی جانتے ہیں کہ اوس کا مصنف " ضیاء برنی " ہے -- جغرافیہ کے بڑے سے بڑے ماہر سے پوچھئے کہ برن کہاں واقع ہے -- وہ سوئیزرلینڈ کے نقشے میں تو ایک برن آپ کو بتا دیگا لیکن ہندوستان کے نقشے میں یہ مقام معدوم رہیگا -- آپ جانتے ہیں کہ بلند شہر کا قدیم نام " برن " ہے -- اونھوں نے قصبہ کا نام تو بدل دیا مگر صفت نسبتی کو ' برنی ' رکھا -- بلند شہری نہ بنایا -- اس کا دوسرا رخ بھی دلچسپ ہے - آگرہ کا نام اکبرآباد نہ پڑسکا اکبر کے عہد کے قبل سے آج تک سب آگرہ ہی کہتے ہیں - لیکن شاہ نظیر اکبرآبادی کہلاتے ہیں -- دہلی شاہجہان آباد تو بنگئی لیکن اوس کے شاعر دہلوی ' ہی رہے -- بات یہ ہے کہ اون کا تصرّف مصلحت اور حسّ مشترک پر مبنی تھا -- ضد اور استبداد پر نہیں اور اون کے نظر یے معقولیت پر مدون تھے —

ذرا غور فرمائیے کہ اون بزرگوں کی ذہنیت کتنی دقیقہ رس اور نکتہ پرور ہوگی - اور اُن کی تصرف لسانی کی قوت عمل کتنی زبردست ہوگی جو بخشنا - خریدنا -- آزمانا -- بدلنا -- فرمانا ' وغیرہ مصدر ترکہ میں

چھوڑ گئے -- مختصر یہ کہ اردو کے متقدمین نے اوس کی تدوین و تنظیم میں جو مسالا اون کے سامنے تھا اوس سے بہترین کام لیا -- جس کی بدولت زبان کو مستقل اور قایم بالذات حیثیت حاصل ہوگئی -- تصرف لسانی کے معنی صرف ' اپنانا ' نہیں بلکہ اپنا سا بنالینا ہیں -- آپ نے دیکھا عربی لفظ " بدل " کو لے کر بدلنا مصدر بنایا -- اب اس کی فعل کے ہر زمانے اور صیغے میں گردان ہوسکتی ہے -- یہیں تک نہیں حاصل مصدر بنا " بدلی " تابع مہمل بھی اس کے ساتھ ملایا گیا جیسے ادل بدل ' -- مختصر یہ کہ اوس کی وہی حیثیت ہوگئی جو آنا -- جانا -- کھانا پینا کی تھی -- انگریزی میں یہ عمل اب تک جاری ہے اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ وہ زبان برابر ترقی کررہی ہے -- 'لوت' انھوں نے ہمارے ہاں سے لیا اور ایسا اپناسا بنا لیا کہ فعل کی گردان میں ' تولوٗ ' اور ' تولوت ' بالکل یکساں ہیں -- چارلس ڈکنس جیسے مستند مصنف نے یہ لفظ استعمال کیا ہے -- اور پھر ہمارے ' لٹیرا ' کی جگہ 'لوٹر ' بنایا -- حال ہی میں ایک لفظ انگریزی میں داخل ہوا ہے -- ہڑتال ' سے اونھوں نے ہڑتالست ' بنایا اور جمع کے لئے ' س ' اوس پر ایزاد کیا - جیسا کہ انگریزی گریمر کا قاعدہ * ہے -- میرا مطلب تصرّت سے یہ ہے —

پچاس برس کا مشاہدہ اور تجربہ جو منظر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے - حسرت ناک اور مایوس کرنے والا ہے -- یہ دیکھکر جی ڈوبتا ہے کہ اس نصف صدی کی مدت میں ہم نے اردوکی لغات میں کوئی ایزادی نہیں کی - یعنی اس بارے میں اردو کا ترکیبی فعل گویا معطّل ہوگیا -- چند اصطلاحیں جیسے " برقانا وغیرہ ضرور وضع کی گئیں -- اور ' بدروت ' جیسے چند

---

* دیکھو ٹائمس آف انڈیا ہفتہ وار - بمبئی - مطبوعہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۳۱ ع صفحہ ۱۹ —

دیسی لفظ اردو میں ضرور لے لئے گئے هیں - لیکن یہ سب علم و فن کی اصطلاحیں هیں -- اور پھر یہ بھی دیکھنا ھے کہ ان کے وضع یا اختیار کرنے والوں کو کیا کہا گیا —

غیر زبانوں سے جو لفظ بلا ضرورت بجنس اردو میں آئے اون میں سے اکثر نا خواندہ مہمان کی طرح اردو کی سبھا میں اوپرے معلوم هورهے هیں -- اس ضمن میں آگے چل کر کچھ عرض کیا جائیگا —

سیاسیات کی مانند لسانیات میں بھی سخت جان هوا کرتے هیں -- یہ سخت جان اون سخت جانوں سے مختلف هیں جن کی سوانح عمریاں غزل کے اشعار میں بکھانی جاتی هیں - ان کا استبداد اور سخت گیری زبان کی ترقی اور توسیع کے مزاحم اور جانی دشمن ثابت هوئے هیں -- هر زبان ان حضرات سے تنگ ھے - کہاں اللہ بخشے وہ بزرگ جن کا قول تھا کہ برقع چونکہ هماری زبان میں الف سے نکلتا ھے اس لئے بجائے عین کے الف سے لکھنا چاھئیے اور کہاں یہ حضرت جو تصرت لسانی کے نام سے بھویں تانتے هیں -- کہا جاتا ھے کہ اردو میں ' خود رفتہ نہیں بلکہ ' از خود رفتہ ' استعمال کرنا لازم ھے -- جواب دیا گیا کہ ' سر گذشت ' کی سرگذشت تو ذرا بیان فرمائیے -- یہ اوسی قسم کی موشگافی اور ماخذ پرستی ھے جیسی انگریزی میں لفظ " Reliabli " کے متعلق انگلستان کے ادبی سخت جانوں کی طرف سے ظہور میں آئی تھی -- ذرا سنئیکا بڑے لطف کی بحث ھے —

اس لفظ کے معنی هیں اعتبار کے قابل -- اعتراض هوا کہ ایک لفظ ٹرسٹ ورڈی (Trust Worthy) پہلے سے موجودہ ھے تو پھر زبان کے نازک اندام پر اور بوجھ کیوں لادا جاتا ھے -- اس کا شافی جواب ملا یعنی ثابت کردیا

کہ پرانا لفظ نئے لفظ کے نفس معنی کا حامل نہیں -- تو ارشاد ہوا :-
چونکہ یہ نیا مرکب لفظ ' Rely ' سے بنا ہے اور اس فعل کے بعد التزاما
حرف جار آن ' On ' آیا کرتا ہے - اس واسطے اس مرکب کو رلائنبیل
' Relionable ' کہو - سب جانتے ہیں جو حشر اس غلط استدلال کا ہوا۔
لفظ ' رلائیبل ' اس وقت انگریزی کے معتبر کلمات سے ہے --

ارشاد ہوتا ہے کہ لفظ رہائش غلط ہے -- اردو مصدر رہنا سے فارسی طریق پر حاصل مصدر بنا لیا معترض کی ناواقفیت پر ہنسی آتی ہے کہ اوس نے اِس لفظ کی تاریخ تحقیق کرنے کی زحمت نہ اُٹھا کر اس کے اختراع کی تہمت ایک صوبے کے سر تھوپ دی جو اس بارے میں قطعاً معصوم ہے -- جاننا چاہئیے کہ سید انشا نے بالکل معمولی طور پر ناچ اکثر وغیرہ کے ساتھ اس لفظ کو لکھا ہے -- اس بے نظیر ادیب اور اہل نظر نقاد کے قلم سے پورب ' پچھم ' اتر ' دکھن کوئی نہ بچا اور مغل پورہ کی زبان اور لہجے پر تو بے پناہ حملے ہوئے ہیں - اگر یہ لفظ مغل پورہ کی جدت آفرینی یا بد مذاقی کا مولود ہوتا تو سید انشا اس کو ایک سادھا رن لفظ کی طرح ہرگز نہ لکھہ جاتے -- *

زبان کی قوت اشتقاق و اختراع اور سلیقہ ترکیب کا ذکر آگے آ چکا ہے - یہاں چند مرکبات پیش کئے جاتے ہیں جو اردو کی قوت حیات اور فعل ترکیبی کی صلاحیت کا بین ثبوت ہیں - ملاحظہ ہو :-

مُنہ پھٹ - ہتھہ چھٹ - ہری چُگ - نین موتلی چمکّو - کھاؤ - لُٹاؤ -

---

* رسالہ صبح امید :- لکھنؤ بابت دسمبر سنہ ۱۹۱۹ ع صفحہ ۳۰ و ۳۱ -
اور دریائے لطافت صفحہ ۱۳۱ --

بڑ بڑیا - کچ پیندیا - نِکھٹّو - تلوریا - گُلچھلا - کھاؤ کھپ - انگو ٹیا یار - هنس مکھ - گلچھرّے - کٹھ پتلی - چھچھوڑ - تل چاولی - گنگا جمنی - روتی شکل - ماما نچتیاں - ٹھڑ دلا - گرہ کٹ - جیب کترہ - گلے باز - شور بے چت - منہ زور - جوشیلا - دل لگی - کمر کس - آگن بوٹ - قبول صورت - ڈھلمل یقین - ایماندار - درشنی جوان - بیکل - ٹکڑ گدا - گھنچکڑ وغیرہ وغیرہ —

آپ نے دیکھا کہ تصرف و اختراع کے ہاتھہ سے عربی - فارسی اور نیز سنسکرت کوئی زبان نہ بچی - ان الفاظ میں جو مرکبات ہیں ان میں اسم اور فعل - اسم اور صفت - اسم اور اسم ہر قسم کے کلموں کو آپ شیر و شکر پائیں گے - ایسا اُس وقت ہوتا ہے جب زبان کا بلوغ درجۂ کمال پر ہو - بقول خواجہ آتش مغفور :—

یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا

میں کہتا ہوں کہ اردو کو آریہ زبان ہونے کے باوجود نہ سنسکرت کا حلقہ بگوش بنانا چاہئے نہ فارسی یا عربی کا دست نگر - علمی اصطلاحوں کا معاملہ دوسرا ہے جس کو مبحث بنانے کا یہ موقع نہیں —

اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ شعر کی زبان نثر کی زبان سے اور بول چال کی زبان علمی تصنیف کی زبان سے ممیز ہوا کرتی ہے - یہ کون کہتا ہے کہ فلسفہ ما بعد الطبیعات یا اسلوب تحلیلی کے نظریے پر باغ و بہار یا فسانۂ آزاد کی زبان میں کتابیں تصنیف ہونی چاہئیں - علمی زبان روز مرہ سے اُسی طرح مابہ الامتیاز رکھتی ہے جس طرح ڈریس سوٹ - رائیڈنگ سوٹ سے کوئی صحیح حواس رکھنے والا شخص کھانے کی پوشاک پہن کر سواری کو

نہیں نکلتا - لیکن وہ سواری کی پوشاک پہن کر شام کی پوشاک کی ہولی بھی نہیں مناتا - یہ تمثیل میں آگے نہیں لے جاؤں گا —

عہد حاضر کے ایک جید لسان یعنی عالم لسانیات کا قول * ہے کہ تحریری (علمی) زبان کی ہستی کو یخ کی اُس پپڑی سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو دریا کی سطح پر بن گئی ہو - یخ نے اپنے اجزاے ترکیبی دریا سے لئے حقیقت میں وہ کچھ نہیں سواے اس کے کہ دریا ہی کا پانی ہے - پھر بھی اُسے دریا نہیں کہہ سکتے - ایک بچہ اِسے دیکھ کر سمجھتا ہے کہ دریا نیست و نابود ہوگیا لیکن یہ صرف دھوکا ہے - یخ کی پپڑی کے تلے پانی برابر بہہ رہا ہے —

یہ تمثیل جو فاضل وینڈریاس نے دی فرانسیسی زبان پر صادق آتی ہوگی - اُردو پر عائد نہیں ہوسکتی - یہاں کی علمی یا تحریری زبان کو اس دریا سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی جس کی سطح جم کر یخ کی پپڑی بن گئی ہو - یخ کے کڑاڑے یا برفانی چٹان کو دریا نہیں کہہ سکتے - حالانکہ تینوں کے وجود کی بنا پانی ہی پانی ہے —

ممکن ہے کسی ذہن میں یہ سوال اُٹھے کہ اگلے زمانے میں علمی یا تحریری زبان کیا تھی یا تھی ہی نہیں ؟ میں عرض کروں گا کہ تھی نمونہ حاضر ہے —

تار برقی کا سلسلہ صوبہ شمال مغربی یا زیادہ صحت کے ساتھ کہیے صوبۂ آگرہ میں نیا نیا تھا - آج کل آپ تلغراف کو ترجیح دیں گے اُس زمانے

* Language - A Lingiustic Introduction to History - By J. Vendryes, Paris University. p. 275.

میں اُسے ڈاک بجلی کا عام نام دیا گیا تھا۔ علمی زبان میں 'تار مخبر کھربائی' کہتے تھے۔ فروری سنہ ۱۸۵۶ ع میں آگرہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں ایک ہزار سے زیادہ رئیس اور شرفا جمع ہوے۔ قاضی صفدر علی نے 'تار مخبر کھربائی' کا تجربہ دکھاتے ہوے ایک تقریر کی جس کو اُردو میں سائنٹفک موضوع پر شاید اولین تقریر کہنا درست ہوگا۔ اس کا جستہ جستہ خلاصہ جسے آج کل کی زبان میں 'ملخص' کہنا چاہئے پیش کیا جاتا ہے۔ غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا :—

" صاحبو۔ علم دو قسم کے ہیں۔ اول وہ جس کو انسان بدون مشاہدہ اور استعمال اجسام کے حاصل کرسکتا ہے۔ اس کو ریاضی کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جس کا جاننا بغیر تجربہ کے نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ فرض کرو ایک شخص پیدا ہوا اور اُس نے کچھ بھی گرم و سرد زمانے کا نہیں دیکھا۔ ایک اندھیرے کمرے میں رہتا ہے۔ تو وہ عقل سے ریاضی کے اصول دریافت کرسکتا ہے کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ اُس نے اجساموں کے تجربے نہیں کئے اس واسطے وہ نہیں جان سکتا کہ اگر پتھر کو پانی میں ڈالیں تو وہ گھلے گا یا نہیں۔ وہ علم جو تجربہ پر منحصر ہیں اُن کی قسموں میں سے ایک قسم علم طبیعی ہے ......

" یہ علم بہت سے علموں کے واسطے حاوی ہے۔ چنانچہ منجملہ علوم طبیعی کے ایک علم کھربائی بھی ہے —

" کھربا ایک سیال لطیف ہے جو جہان کے تمام اجساموں میں بہ مقادیر مختلفہ پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے چند اوصاف مخصوصہ ہیں جن سے حوادث عجیبہ اور فوائد غریبہ سرزد ہوتے ہیں ... ...

" یہ علم بذاتہ دو قسموں پر منقسم ہے — اول وہ کھربا جو رگڑنے

سے پیدا ہوتی ہے - دویم وہ کہربائی جو چھونے سے پیدا ہوتی

آپ نے تین چوتھائی صدی پہلے کی علمی زبان ملاحظ فرمائی - یہ تو ہوئی بہتےدریا کی سطح پر برف کی پپڑی - آج کل کی زبان جیسی کچھہ ہے آپ جانتے ہیں - اوس کو کہنا چاہئے انجماد خالص - صاحب زبان خواہ کسی قوم کے موضوع پر لکھے وہ زبان کو یخ کے کڑاڑے اور برف کی چٹان کے نیچے دفن نہیں کریگا —

ترجموں کی زبان بھی اسی بھول بھلیاں میں چپر غٹو ہے - ایک بات اسی ضمن میں عرض کرونگا - ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا اور اوسی شان کا کیا جس شان کی اصل کتاب تھی اس ترجمہ میں جہاں آپ کو استحصال بالجبر ' اور ' تخویف مجرمانہ ' جیسے اصطلاحی فقرے ملیں گے جو مرحوم کی دقت نظر اور اختراعی کمال کا ثبوت ہیں - ٹھیٹھ اردو کی مثالیں بھی ملیں گی - جن کی اصطلاحی اہمیت قانون میں کسی لاطینی اصطلاح سے کم وقیع نہیں مثلاً " لے بھاگنا " اور " بہکا لے جانا " وغیرہ - یہ وہی مرکب مصادر یا افعال کی طلسم کاری ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے . وہ اُردو کیا کہ جب تک قاموس اور برہان اسر کوش اور شبد کلپدرم داہنے بائیں تشریف فرما نہ ہوں ایک تحریر کا معنی مدعا سمجھہ ہی میں نہ آسکے - یہ تو ہوئی ایک بات اور میں ان مہربانوں کی خاطر سے کچھہ دونگا اس کا مضایقہ ہی کیا ہے - لیکن زبان کی بہبودی اون کی یا کسی کی خوشنودی پر فوقیت چاہتی ہے - میں اس موقع پر لسانیات کا نہایت وقیع اور مہتمم بالشان اصول

---

* تفصیل کے لئے دیکھو رسالہ خورشید پنجاب - لاہور بابت مارچ سنہ ۱۸۵۶ ع مرتبہ منشی ہرسکھہ رائے - مالک اخبار و مطبع کوہ نور —

موضوعہ آپ کی توجہ کے لئے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے :- کہ جب کسی زبان کو دوسری زبانوں سے الفاظ یا مرکبات اپنے کا لپکا پڑ جاتا ہے اور وہ اونہیں بلا چوں و چرا یعنی اپنی طور پر تصرف کے بغیر استعمال کی عادی ہو جاتی ہے تو اوس کی تصریفی قوت - اختراعی قابلیت - اور اشتقاقی اہلیت زایل ہو جاتی ہے —

متاخرین اور اون سے بڑھکر ہمارے معاصرین نے یہ نہ سوچا کہ وہ جو اور زبانوں کی لغات اندھا دھند لئے جاتے ہیں اس کا نتیجہ اون کی زبان کے حق میں کیا ہوگا - میں پھر کہتا ہوں کہ پچھلے پچاس برس میں اردو میں ایک لفظ - ایک مرکب - ایک محاورہ وضع یا اختراع نہیں ہوا بزرگوں کی کمائی کہاں تک ساتھہ دیگی - زبان کا تصریفی اور اشتقاقی عمل معطل ہو رہا ہے - یہی حالت رہی تو یاد رہے کہ یہ تعطل سقوط کی صورت پکڑ جائیگا اور اب سے دور ہماری زبان آئے دن بھیک کا کاسہ ہاتھہ میں لئے اور زبانوں کے دروازوں پر الکھہ جگاتی پھرا کریگی - مانگے تانگے کی خوشباشی اور قرض پر دھوم دھام کو تمول نہیں کہتے —

اگلے موقعہ پر آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا تھا کہ متکلم یا منشی کے اور سامع یا مخاطب کے باہم ذہنی قربت ہی روح فصاحت ہے - آج میں یہ گزارش کرونگا کہ یہ ذہنی قربت لسانی تربیت کی محتاج ہے - محض ابتدائی مدارس کو رہنے دیجئے اور مدارس ثانوی کے نصاب تعلیمی پر نظر ڈالئے تو آپ پر ظاہر ہوگا کہ ان مدارس کے لئے جو اردو نصاب مدون ہوتے ہیں سائنٹیفک نقطۂ نظر پر راجع نہیں ہوتے میں فوراً یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہاں میرا روئے سخن دکن کے مدارس ثانوی کے اردو نصاب سے ہرگز نہیں - میرا تجربہ ہندوستان کے دوسرے حصوں

تک محدود ہے -- لیکن یہ چونکہ اُصولی امر ہے اس لئے اس کا تذکرہ ضروری سمجھا گیا -- میں امید کرتا ہوں آپ میرے ہم خیال ہونگے اس بارے میں کہ جو بچے مدارس ثانوی میں داخل ہوتے ہیں اون کو فصیح و سلیس اردو میں تربیت کرنے کی ضرورت ہے -- اس میں بھی آپ کا اتفاق ہوگا کہ فصاحت اور نکھار اردو میں اثر اور ترنم بھرا ہوا ہے -- اصطلاح میں جسے روز مرہ کہتے ہیں اُس پر زور دینا مفید نہ ہوگا کیونکہ اس کے ساتھ صوبیت اور مقامیت تشریف لے آتے ہیں -- بچے کے ذہن میں شروع سے ہی اختلاف اور تناقض کے جراثیم ڈالدینا اوس کی آئندہ ادبی زندگی کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے -- اون کو ایسی زبان میں تربیت کرنا چاہئیے کہ وہ اپنے پڑوسیوں اپنے شہر یا قصبے والوں کو اور اون لوگوں کو جو اردو سمجھتے اور جانتے ہیں اپنا مطلب سمجھا سکیں -- ابتدائی تعلیم میں نوخیز طلبا کی ذہنی تربیت کا خیال رکھنا نہایت اہم ہے -- یہ بھی یاد رہے کہ ابتدائی عمر میں ابداع و اختراع کی اُپج اون میں کمال ہوتی ہے -- جنھوں نے بچوں کے کھیل کود اور ورزش کے مقاموں میں چند لمحے توجہ سے گذارے ہیں وہ تسلیم کرینگے کہ بچے آپس کی پھبتیوں -- جوش و خروش کے مکالموں اور فی البدیہہ تک بندیوں میں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں اور ایسی ایسی ترکیبیں گھڑ لیتے ہیں کہ آپ حیران رہجاتے ہیں اور نہایت محظوظ ہوتے ہیں - اختراع کی یہ قوت اپنے وقت پر ہنسی کھیل سے منتقل ہوکر علم و فضل اور تحقیق تفحص کے میدان میں مستعمل ہونی چاہئے نہ یہ کہ وہاں کی وہیں رہ جائے اس لئے لازم ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم ایسی اردو میں ہوکہ طلبا کے تخیل اور قوت اختراع کی مزاحم نہ ٹھیرے -- یہ تربیت جبھی ہوسکتی ہے کہ اردو الفاظ کے ٹھیٹھ معنی اور وضعی صورت کو اون کے ذہن نشین کردیا

جائے -- اور جملہ کی ترکیب و انشا کا اصول اون کے لوح دل پر نقش ہوجائے -- اسے کہنا چاہئے زبان متداولہ کی تعلیم -- اس لسانی استعداد کے حاصل ہونے کے بعد ادب یعنی لٹریچر کی تعلیم کی نوبت آتی ہے —

زبان سے متعلق بہت سے امور ایسے ہیں جنھیں متوسطین نے متنازعہ فیہ یا تصفیہ طلب چھوڑا وہ ابھی تک لٹک رہے ہیں -- ایک تذکیر و تانیث ہی کو لیجئے -- میرا مطلب اس بارے میں اُس اختلاف سے نہیں جو ایک مقام یا زمرےکو دوسرے مقام یا زمرے سے ہے -- اس جگہ غیرذی روح اسموں کی تذکیر و تانیث کا سوال نہیں اٹھایا جائیگا -- میں یہ کہنے کو ہوں کہ ہماری بے بسی اور بے بضاعتی کتنی شرم کے قابل ہے کہ ہم ابھی تک یہ فیصلہ نہ کرسکے کہ جنسیت کے بارے میں کلمہ ربط کس کا متبع -- مبتدا کایا خبر کا ؟ " ذوق " اور " غالب نے " اس تنقیح کو جہاں چھوڑا تھا وہیں موجود ہے -- وہ دونوں استاد جب اس کے تصفیہ میں قاصر رہے تو ہم میر فیصلی کہاں کے ؟ ہمارا یہ انداز معلوم ہوتا ہے -- ذوق مرحوم کا قول ہے :—

دریائے غم سے میرے گذرنے کے واسطے
تیغ خمیدہ یار کی لو ہے کا پل ہوا

اس شعر میں کلمہ ربط جنسیت میں خبر کا متبع ہے -- مرزا غالب کا ارشاد ہے :—

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خوں فشاں ہو جائیگا

یہاں کلمہ ربط مبتدا کے تابع رکھا گیا -- اس ایک ادنیٰ مثال سے آپ قیاس کرسکتے ہیں کہ زبان کی یہ گڑبڑ کتنی منحوس ہے اور یہ آج تک شامت اعمال کی طرح ہمارے پیچھے پڑی ہوئی ہے - اس کے نتائج و عواقب کی شدت ثبوت

کی محتاج نہیں - آپ دیکھتے ہیں یہ وہ بات نہیں جوفرض کیجئے دھلی اور لکھنؤ یا پنجاب اور پٹنہ کے درمیان ایک امر تنقیح کا حکم رکھتی ہو - بلکہ یہ وہ امر ہے جو زبان کی یگانگت اور ہم آہنگی کا مدعی ہے - جب تک ایسے نقص ہم میں موجود ہیں اور جب تک یہ نامراد تشخص ذاتی سادھاون اور کار آمد انفرادیت کا رنگ پکڑ کر اپنے تئیں اجتماعیت میں جذب اور محو نہیں کر دیتا ہماری زبان کا بس اللہ والی ہے —

انگلستان تو اب انگریزی زبان کے بارے میں ' امریکنزم ' اور " یانکی ازم " یعنی ' امریکیت ' کو بھول گیا جس طرح پہلے ' سکاٹیزم ' یعنی ' سکاٹیت ' کو بھول گیا تھا - لیکن ہم اب تک وھی بے وقت کی راگنی الاپے جاتے ہیں —

ہم کو یاد رکھنا چاھئیے کہ ہم اردو کے واحد مالک نہیں بلکہ امیں ہیں وہ ایک ودیعت ایک امانت ہے جو حفاظت اور ترقی کے لئے ہمیں سونپی گئی - وہ ایک جدی جائداد ہے جس کی ملکیت ہمیں پر ختم ہونے والی نہیں - ہمارا فرض ہے کہ ہم ماضی سے سبق لیکر اُوس کی موجودہ حالت کا صحیح موازنہ کریں اور اوسے ایسا بنا جائیں کہ ہمارے بعد آنیوالے ہم کو دعائے مغفرت سے یاد کریں - یاد رہے کہ ہم ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک کڑی ہیں - اس سے زیادہ نہیں - اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ذاتی پسند اور چاؤ چونچ کو اجتماعی مفاد پر قربان کردیں - ہمارا مطمح نظر مستقبل اور آئندہ ضروریات ہوں نہ کہ ذاتی تشخص اور خود پسندی —

§ * §

خطبات گارساں دتاسی

بارھواں خطبہ - یکم دسمبر سنہ ۱۸۶۲ ع

(مترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی -

لٹ - (پیرس) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد)

حضرات !

گذشتہ ایک سال میں ہندوستان جنت نشان کی زبان میں کافی ترقی ہوئی ہے -- اس باب میں مستشرقین اور خود ہندوستان کے علماء و فضلاء نے بڑی جانفشانی کا ثبوت دیا -- انہوں نے اردو کے مطالعہ کے لئے بعض سہولتیں بہم پہنچانے کے ساتھہ ساتھہ اس کے ادب میں بیش بہا نئے اضافے بھی کئے -- بقول 'بُلدر' " ادب ہی وہ سب سے بڑی آسمانی نعمت ہے جس کا شمار مذہب کے بعد ہونا چاھئیے -- "

راجندرلال متر نے ہندوستان سے اردو کے نئے اخبارات و رسائل کے متعلق میرے لئے بعض معلومات بہم پہنچائی ہیں -- میں پہلے اس کی نسبت کچھہ عرض کرونگا -- در اصل مجھے میجر 'جیمس' کا مرہون منت ہونا چاھئیے کہ ان کے ذریعہ سے راجندرلال متر کے ساتھہ میرا غائبانہ تعارف ہوا -- میں ذیل کی سطروں میں ان اخبارات و رسائل کے نام گناتا ہوں جن کے متعلق پچھلے خطبات میں میں نے ذکر نہیں کیا --

(۱) جام جہاں نما۔ یہ ایک اردو کا اخبار ہے جو کلکتہ سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس میں سوائے سرکاری یا انفرادی اعلانوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اسی نام کا ایک اخبار میرٹھ سے نکلا کرتا تھا جس کی نسبت میں اپنے ۲۹ نومبر سنہ ۱۸۵۳ ع کے خطبہ میں ذکر کر چکا ہوں میرٹھ والے اخبار میں ادبی رنگ غالب تھا۔ کلکتہ کا جام جہاں نما ٹائپ میں چھپتا ہے اور میرٹھ کا جام جہاں نما ہاتھ سے لکھ کر چھاپا جاتا تھا —

(۲) ایک اخبار بریلی سے نکلنا شروع ہوا ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ صرف رہیلکھنڈ کی خبریں ہوتی ہیں۔ اس کا نام رہیلکھنڈ اخبار ہے — یہ مہینہ میں دو بار شائع ہوتا ہے اور چھوٹی تقطیع کے ۱۶ صفحوں پر مشتمل ہے —

(۳) بمبئی سے کشف الاخبار سنہ ۱۸۶۱ ع سے نکلنا شروع ہوا ہے — یہ ہفتہ وار ہے اور ہر بدھ کے روز شائع ہوتا ہے — یہ چھوٹی تقطیع کے ۸ صفحوں پر مشتمل ہے — لکھنؤ کے منشی امان علی اس کے مدیر ہیں — ہر نمبر کے شروع میں ایک چھوٹی سی نظم ہوتی ہے جس میں اس نمبر کا پورا پروگرام لکھا ہوتا ہے —

(۴-۵) پنجاب گورنمنٹ کی ابتدائی تعلیم کی رپورٹ میں ایک اخبار کا ذکر کیا گیا ہے جس کا نام "سرکاری اخبار" ہے — میں اس رپورٹ کی نسبت آگے چل کر پھر ذکر کروںگا — اس میں بتایا گیا ہے کہ پنجاب کے علاقے میں یہ اخبار بہت مقبول ہے — پنجاب کے وسیع صوبے کے دور دراز اضلاع میں اس کے ذریعہ سے سرکاری اعلانات وغیرہ پہنچتے رہتے ہیں — ایک اور ماہوار اخبار ہے جو آگرہ سے نکلتا ہے۔ اس کا نام

منصب رعایا ہے -- مسٹر اے ہیوم کی سربراہی اور دیسی لوگوں کی ادارت میں یہ اخبار نکلتا ہے —

(۹) ان اخبارات کی فہرست کے ساتھہ میں ایک مجموعہ مضامین کا بھی ذکر کئے دیتا ہوں جو حال ہی میں گورنمنٹ کی طرف سے شائع ہونا شروع ہوا ہے -- اس کا نام معلم العملہ ہے -- اس کا مقصد یہ ہے کہ سرکاری عملہ کے لئے ضروری معلومات بہم پہنچائی جائیں -- سدا سکھہ اس کے مولف ہیں - اس کا دوسرا نمبر مجھے ملا ہے - اس میں پان کی کاشت ' سر شتۂ تعلیم کے مسائل ' مالیات ' هندوستان کے جغرافیہ ' رام چندر کی کہانی اور کتبخانے قایم کرنے کے طریقوں پر معلومات درج کی گئی ہیں —

میرے گزشتہ سال کے خطبے کے بعد اس سال کے دوران میں اردو زبان کی متعدد نئی کتابیں شائع ہوئی ہیں - ان سب کے متعلق ذکر کرنے میں طول ہوگا - ان میں جو اہم ہیں ان کا یہاں میں ذکر کرونگا ادبی لحاظ سے ان میں سب سے زیادہ اہم سودا کا انتخاب ہے - ناصر خان نے یہ انتخاب شائع کرکے اردو داں پبلک پر بڑا احسان کیا ہے - سودا جدید اردو کا مشہور شاعر ہوا ہے لیکن باوجود اپنی شہرت کے اس کا کلام کس مپرسی میں پڑا ہوا تھا - ایک اور دوسری کتاب کے متعلق میں پچھلے خطبے میں ذکر کر چکا ہوں - ایچ استورٹ رید نے مجھے اس کا ایک نسخہ بھیجا ہے - * اس کتاب کا نام " منتخبات اردو " ہے - یہ انتخاب کریم الدین نے کیا ہے - موصوف وہی ہیں جنھوں نے میری کتاب " تاریخ ادب اردو" کا ترجمہ کیا ہے -

* مطبوعہ لکھنئو - سنہ ۱۸۶۱ ع - پہلی جلد میں ۱۹۲ صفحے ہیں اور ہر صفحہ پر ۱۵ سطریں ہیں - دوسرا حصہ مجھے اب تک نہیں ملا —

سلتخبات اردو کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب کے لئے لکھی گئی ہے - اس میں الف لیلہ میں سے سندباد جہازی کا دلچسپ قصہ بھی اپناگیا ہے اگرچہ الف لیلہ کے سب نسخوں میں یہ قصہ موجود نہیں ہے * تحفتہ اخوان الصفا کے بعض حصے ہیں - یہ کتاب تمثیلا نہ رنگ میں لکھی گئی ہے - اس کا ترجمہ میں نے فرانسیسی میں کیا ہے جو آج کل " مجلۂ شرقی " (Revued , Orient) میں شائع ہو رہا ہے - فردوسی کے شاہ نامے کا اُسی بحر میں اردو ترجمہ کیا گیا ہے اور اس ترجمے کے ۶۰ صفحے ہیں - درد کی غزلوں کے اقتباسات ہیں - درد اردو زبان کے بہترین شاعروں میں سے ہوا ہے گلستان اور اخلاق جلالی کے بھی اقتباسات ہیں ان کے علاوہ Pazruyiah † کی خود نوشت سوانح کے بعض حصے شائع ہوئے ہیں - اس رسالے میں اخلاقی و فلسفہ کی تعلیم سے بحث کی گئی ہے اور اس میں یونانی خطابت کی جھلک پائی جاتی ہے - اس کا خلاصہ یہ ہے : اس قصہ کے ہیرو نے طبابت کو اپنا پیشہ اختیار کرلیا تاکہ اس کی وساطت سے خلق اللہ کی خدمت کر سکے - وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے جس میں بعض اخلاقی باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے - چنانچہ وہ کہتا ہے - " جو شخص خود اپنی روحانی زندگی کی پروا نہیں کرتا اور اپنی اولاد کی خاطر دولت جمع کرتا ہے اس کی مثال اس عود کی سی ہے جو خود جلکر دوسروں کو جو قریب بیٹھے ہوں خوشبو پہنچاتا ہے یا اس شمع کی سی ہے جو اس لئے جلتی ہے کہ ضیافت کے سب شرکاء تک اس کی روشنی پہنچ سکے - " بیٹے نے باپ کی نصیحت

---

* نسخوں سے میری مراد صرف مطبوعہ نسخے نہیں ہے بلکہ قلمی نسخے بھی -

† یہ لفظ سمجھ میں نہیں آیا (مترجمہ)

پر عمل کیا - بلکہ اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا - اس نے اپنے نفس کو فلسفیانہ غور و فکر کا خوگر کرلیا - اسے یہ معلوم ہوگیا کہ واقعی دنیاوی جاہ و دولت بجلی کی چمک کی طرح بہت جلد غائب ہو جانے والی چیز ہے - اس کی مثال ایسی ہے جیسے ابر کا سایہ یا جیسے ایک خواب - چنانچہ ساری عمر اس نے مذہبی فلسفی کی زندگی بسر کی اور ہمیشہ اس کو اس ابدی مسرت پر اعتقاد رہا جو نیکی کا نتیجہ ہوتی ہے —

ان نئی مطبوعات میں فارسی زبان کے ترجمے بھی شامل ہیں - ہندی میں بھی فارسی سے ایک ترجمہ ہوا ہے - بہاری لال نے گلستان کے آٹھویں باب کو ہندی کا جامہ پہنایا ہے - بعض ترجمے فارسی اور اردو میں ہیں اور بعض ہندی اور سنسکرت میں - آخرالذکر کی مثال " بوج پربندسار" - ہندی میں سنسکرت متن کی شرح دی گئی ہے - اسی طرح " بدھی ودیادیت " کو پیش کیا جا سکتا ہے - شری لال نے سنسکرت اشلوکوں کی ہندی شرح لکھی ہے - ان کے علاوہ " منو دھرم سار " ہے - یہ بھی ہندی اور سنسکرت دونوں میں ہے - اس میں منو کے قوانین کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے - اسی سال کے دوران میں " خلاصہ تواریخ " کا ایڈیشن شائع ہوا ہے - یہ تاریخ غلام علی کی لکھی ہوئی ہے - اس میں ان اسلامی بادشاہوں کا ذکر ہے جو انگریزی حکومت کی ابتدا اور اس کے نشو و نما کے دوران میں ہندوستان میں ہوئے ہیں - اسی مصنف نے سلطان ٹیپو کے عہد کی تاریخ قلمبند کی ہے - وہ خود ٹیپو کے ہاں ملازمت کرچکا تھا - موسیو پال دے گوارتی کے پاس اس تاریخ کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے اور انہوں نے اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے - موصوف پانڈی چری میں جج کے عہدے پر ممتاز رہ چکے ہیں - آج کل ان کا قیام شہر بایون میں ہے صرف و نحو

پر بھی اردو میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کی نسبت معلومات حاصل کرنا مستشرقین یورپ کے لئے از بس ضروری ہے - مثال کے طور پر "اردو مرتند" کو لیجئے - پنڈت بنسی دھر نے اسے ہندی زبان میں تالیف کیا ہے - پنڈت جی اس عہد کے ان مصنفین میں سے ہیں جو ہر قسم کے موضوع پر قلم فرسائی کرسکتے ہیں - انھوں نے 'علم الھیئت' پر ایک کتاب لکھی ہے - ایک جغرافیہ پر لکھی ہے جس کا نام "بھوگول سار" رکھا ہے - ہندی میں جغرافیہ کو بھرت "بھرت کھنڈ" کہتے ہیں - بابو 'شیو پرشاد' نے ہندوستان کا عام جغرافیہ لکھا ہے اور اسے ہندی اور اردو دونوں میں شائع کیا ہے - اس جغرافیہ کا خلاصہ "چھوٹی جام جہاں نما" * رکھا ہے - 'متھرا پرشاد' نے Maun کی کتاب معلومات عامہ (Lessons in General Knowledge) کا ہندی ترجمہ شائع کیا ہے —

'تھامسن کالج' رڑکی کے مطبع کی ہندوستان میں وہی حیثیت سمجھنی چاہئے جو انگلستان میں 'ایٹن' کے مطبع کو حاصل ہے - اس مطبع سے ہندوستانیوں کے واسطے نہایت کارآمد مطبوعات شائع ہوتی رہتی ہیں - یہ سچ ہے کہ یہ مطبوعات ادبی نہیں ہیں - یہاں سے متعدد خطوط کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں جیسے 'دستور الارقام' (؟) - اسے منشی 'میاں جان' نے ترتیب دیا ہے منشی 'میاں جان' کے اشعار کا ذکر تذکروں میں موجود ہے - ان کا تخلص 'انیس' ہے - میں نے ابھی جس بیاض کا ذکر کیا وہ دوسری انشا کی بیاضوں کی طرح نہیں جن میں تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار سے عجب انداز تحریر اختیار کیا جاتا ہے اہل مشرق کو یہ انداز تحریر بہت پسند ہے بلکہ اس کے بالکل برخلاف اس بیاض

---

* اصل میں غالباً چھوٹی کی بجائے چھوٹا ہوگا —

میں ایسے خطوط کے نمونے درج کئے گئے ہیں جو کاروباری خطوط اور عرضداشتوں میں مستعمل ہوتے ہیں - یہ مسٹر اسٹورٹ کی فارسی بیاض سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے —

اسی سلسلہ میں ہم اس جغرافیہ کا بھی ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے جس میں ساگر کے زرخیز ضلع کے نقشے اردو اور دیونا گری دونوں رسوم خط میں درج کئے گئے ہیں - ان نقشوں کی ترتیب بھولی رام نے کی ہے - اس کے علاوہ ایک رسالہ گاؤوں کے خسرے تیار کرنے کے متعلق ہے - اس رسالے کو پنڈت رام پرشاد نے ترتیب دیا ہے اور اس میں کرنل بوالو کی بڑی حد تک تقلید کی ہے - ایک رسالہ سڑکیں تعمیر کرنے کے متعلق اور ایک رسالہ ڈاک بجلی کے نام سے تار برقی کے متعلق شائع ہوا ہے —

ان میں سے بعض کتابیں ایسی ہیں جن کا مطالعہ یورپین لوگوں کے لئے مفید ہوگا - مثلاً ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام آئینۂ اہل ہند ہے - اس میں ہندوستان کے باشندوں کی صنعتوں اور ان کی رسوم سے بحث کی گئی ہے - اس کتاب کے مصنف کا نام کرشن راؤ ہے - اس میں مصنف کی تصویر بھی ہے اور بعض مقامات پر عبارت کو واضح کرنے کے لئے بھی مثال کے طور پر تصاویر مندرج ہیں - یہ تصویریں حسن ذوق پر دال ہیں - میں اس وقت آپ کے سامنے اور دوسرے رسالوں کا ذکر نہیں کروں گا جو علم ریاضی ' تعمیرات اور میکانک کے متعلق شائع ہوئے ہیں -

چند ہفتے ہوئے مجھے اردو اور ہندی کتابوں کا ایک پارسل ہندوستان سے ملا ہے - یہ کتابیں میرے کرمفرما مسٹر آر - کسٹ نے بھیجی ہیں جو لاہور میں جوڈیشل کمشنر ہیں - میں نے ابھی جس شہر کا نام لیا یعنی لاہور

وہ ایک تاریخی شہر ہے - اور مسٹر ایچ تھارنٹن نے اس شہر کی تاریخ پر ایک نہایت دلچسپ مضمون لکھا ہے - مسٹر تھارنٹن سول سروس کے آدمی ہیں - ان کتابوں میں ایک بیتال پچیسی ہے - اسے بکوم ولاس بھی کہتے ہیں - یہ لاہور میں طبع ہوئی ہے اور اس میں نہایت خوبصورت تصاویر بنی ہیں - ایک کتاب جو " سبھاولاس " (لطف معاشرت) ہے - اس قسم کے نام در اصل ہندی میں بہت عام ہیں - مگر یہ کتاب جو مجھے بھیجی گئی ہے ہندی اشعار کے انتخاب پر مشتمل ہے - ایک کتاب " تھریم ظہوری " ہے - اس میں در اصل ملا ظہوری کی " سہ نثر " کو اردو میں پیش کیا ہے - ایک کتاب نورس کے تینوں حصوں پر مشتمل ہے نورس بیجاپور کے سلطان ابراہیم شاہ کی مشہور نظم ہے - ایک تعزیرات ہند کا نسخہ ہے - یہ لاہور کا چھپا ہوا ہے - انگریزی سے یہ ترجمہ نہایت سلیقہ کے ساتھ کیا گیا ہے - اس کا انداز تحریر قریب الفہم اور موضوع کے عین مناسب ہے - مسٹر ایچ ایس ریڈ نے اس ترجمہ میں بڑے اہتمام سے کام لیا ہے - موصوف ہندوستان کی مروج و مقبول زبان اردو کے بڑے پرجوش حامیوں میں ہیں - ایک نسخہ ضابطۂ فوجداری کا اردو ترجمہ ہے - یہ ترجمہ الہ آباد سے سنہ ۱۸۶۲ ع میں شائع کیا گیا - اس میں چھوٹی تقطیع کے ۱۱۴ صفحے ہیں —

ان کتابوں میں جو مجھے بھیجی گئی ہیں بعض فلسفیانہ مباحث سے متعلق ہیں - مثلاً " سدھانتا سنگرھا " جو قدیم نیایا فلسفہ کے اصول پر لکھی گئی ہے : اپدیش پشپوت اردو کی کتاب گلدستہ اخلاق کا ہندی ترجمہ ہے —

ان کتابوں میں ہندی کی ایک کتاب شددرش درپن کو اہمیت حاصل ہے - اس کتاب میں ہندؤں کے فلسفہ کے چھہ ضابطوں کو بیان کیا گیا ہے اس کے مصنف

نہیمیا نیلا کنٹھہ شاستری گور ہیں۔ آپ 'بنارس' کے ایک مشہور پنڈت ہیں اور اب آپ نے مسیحی مذہب قبول کر لیا ہے۔ جیسا کہ ان کے نام کے پہلے جزو سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ ایڈورڈ فٹز ہال جو ہندی علوم کے بڑے ماہر ہیں، اس کتاب کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ موصوف کے نام سے سنسکرت کی متعدد تصنیفات شائع ہوچکی ہیں۔ آج کل آپ 'لندن' کے کنگز 'کالج' میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ مسٹر 'دنکن فوربس' کی علحدگی کے بعد آپ نے اس خدمت کو منظور فرمایا ہے۔ آپ نے اس کتاب کو انگریزی کا جامہ پہنایا ہے اور بعض بعض مقامات پر رد و بدل بھی کیا ہے اور حواشی درج کئے ہیں۔ یہ ترجمہ ایک جلد میں ہے۔ اسی سال کلکتہ میں طبع ہوا ہے اور اس کا نام A Rational Refutation of the Hindu Philosphical Systems (یعنی ہندو نظام فلسفہ کی عقلی تردید) ہے—

انگریزی سے ترجموں کی تعداد آے دن بڑھتی جاتی ہے۔ اس جگہہ میں صرف چند کی نسبت ذکر کروں گا۔ 'ٹاڈ' کی کتاب "Hints of Self-improvement" کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے اور اس کا نام "تعلیم النفس" رکھا گیا ہے۔ ہندی میں بھی اس کتاب کا اصل سے ترجمہ ہوا ہے اور اس ہندی ترجمہ کا نام "سکشا منجری" ہے۔ 'شیو پرشاد' نے 'من بہلاؤ' کے نام سے ایک کتاب ہندی میں شائع کی ہے۔ اس میں انگریزی نثر اور نظم دونوں کے ترجمے ہیں—

'روبنسن کروسو' کے دلچسپ قصے کا اردو ترجمہ پہلے ہی ہوچکا ہے۔ یہ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ دنیا کی تقریباً ساری زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ پنڈت 'بدری لال' نے اس کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے اور حال ہی میں بنارس میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ یہ کتاب

نہایت ضخیم ہے اور اس میں جا بجا تصاویر بھی ہیں —

"دستور المعاش" کا اس سال دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ دہلی کے مہا پادری (arch-bishop) ڈاکٹر 'وھائیلے' جو ہمارے 'انسٹیٹیوٹ' کے ارکان میں سے ہیں ان کی کتاب "معاشی حالات' (money matters) میں تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد جے۔ پی 'ایڈلی' نے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ پنڈت 'بنسی دھر' نے اسی کتاب کو ہندی کا جامہ پہنایا ہے۔ موصوف ان لوگوں میں ہیں جو کام کے آگے تھکنے کا نام نہیں جانتے—

میرے نزدیک ان سب نئی کتابوں میں "سرا پاے سخن" ایک نہایت اہم کتاب ہے۔ مسٹر فنز 'ایڈورڈ ہال' کی عنایت سے مجھے اس کا ایک نسخہ مل گیا ہے۔ یہ ایک تذکرہ ہے۔ اور یہ نہایت وسیع زمانے پر حاوی ہے۔ غالباً اودھ کے آخری تاجدار کے تذکرہ کے بعد اس کا نمبر دوسرا ہے۔ اِس میں بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھہ پانچ ہزار نثر و نظم لکھنے والوں کے حالات قلمبند کئے گئے تھے مگر سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش کے دوران میں معلوم ہوتا ہے اس کے سب نسخے ضائع ہوگئے تھے اور اب وہ ایک نایاب چیزوں میں سے ہے۔ "سرا پاے سخن" میں جو حالات جمع کئے گئے ہیں وہ سنہ ۱۸۵۲ ع تک آکر ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ تذکرہ گزشتہ سال پہلی مرتبہ لکھنؤ میں طبع ہوا اور آٹھہ سو صفحات پر مشتمل ہے اور سات سو سے زائد مصنفوں کے حالات اس میں موجود ہیں۔ جن میں سے اکثر ہم عصر ہیں۔ آپ یہ دیکھیں گے کہ اکثر تذکروں میں ان میں سے بہت سے شعرا کا کوئی حال نہیں ملتا ہے۔ اس تذکرے میں خاص کرکے 'لکھنؤ' اور صوبۂ اودھ کے شعرا کا حال بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ اس واسطے کہ اس کے مصنف کا وطن 'لکھنؤ' ہے اور یہاں کے متعلق اسے کافی واقفیت حاصل ہے۔ اودھ

میں مصنفوں اور بالخصوص شعرا کی بڑی کثرت ہے - اودھ کے آخری تاجدار
واجد علی شاہ کے دربار سے چار سو شعرا کو تنخواہیں ملتی تھیں اور
واجد علی شاہ خود بھی شاعر تھے —

اس تذکرے کے مصنف کا نام 'محسن' ہے - یہ حقیقت کے بیٹے اور وزیر*
کے پوتے ہیں - 'محسن' کے باپ اور دادا دونوں اردو کے مشہور شاعروں
میں سے ہوئے ہیں - محسن کے خاندان کے دو بزرگوں ' 'رشک' اور 'عشقی'
نے ان کی پرورش کی تھی - 'رشک' بھی شعر کہتے تھے اور 'عشقی' نے
شعرائے اردو کا ایک تذکرہ لکھا ہے - 'محسن' نے اپنا تذکرہ دراصل عشقی
ہی کے کہنے پر لکھنا شروع کیا تھا - اس تذکرہ کو لکھتے وقت اس کے
پیش نظر پندرہ دوسرے تذکرے تھے اور جیسا کہ اس نے اپنے تذکرے کے
دیباچہ میں لکھا ہے' اس نے سیکڑوں دیوانوں اور بیاضوں کی مدد سے اپنے
کام کی تکمیل کی - چنانچہ انہیں دیوانوں اور بیاضوں میں سے اس نے
تقریباً ۶ ہزار اشعار اپنے تذکرہ میں نقل کئے ہیں - دوسروں کے اشعار کے
ساتھ ساتھ خود اپنے اشعار بھی نقل کئے ہیں اس واسطے کہ محسن خود
اعلی درجہ کے شاعروں میں ہیں - اپنے تذکرہ کے دیباچہ میں 'محسن' نے
انگریزی حکومت کی بہت کچھ مدح سرای کی ہے جس کے سایۂ عاطفت میں

---

* مصنف کو غلط فہمی ہوی ہے - محسن وزیر کے پوتے نہیں تھے بلکہ ان سے کسی
قسم کا رشتہ نہ تھا - البتہ وہ وزیر کے شاگرد تھے اور اس کا ذکر خود انھوں نے اپنے
تذکرے میں کیا ہے - ان کے دادا کا نام عرب شاہ تھا - رشک اور عشقی ان کے
خاندان کے بزرگ نہ تھے - عشقی ان کے دوست تھے اور رشک سے ان کو تلمذ تھا -
ان کو رشک اور وزیر دونوں کی شاگردی کا فخر تھا - مولف خطبات کو ان صاحبوں
کے تعلقات کے سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے - (اڈیٹر اردو)

پھر سے ہندوستان میں علم و فن اپنی پوری بہار پر ہیں اور ساری مخلوق امن و عافیت کے ساتھہ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف کار ہے —

'محسن' کا تذکرہ اور دوسرے تذکروں کی طرح بے مزہ نہیں ہے۔ اور دوسرے تذکروں کی طرح اس کا ہر باب منتخب کلام کا بے ترتیب انبار نہیں جن میں اگر کوئی ترتیب ہوتی ہے تو وہ محض ردیف کی بلکہ اس میں مختلف مضامین کے اعتبار سے اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اور جس شاعر کے وہ اشعار ہیں اس کی زندگی کے مختصر حالات درج کئے ہیں۔ اس تذکرے میں یہ خوبی ہے کہ مضمون کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہے - چنانچہ سر' بال' چہرہ' پیشانی' آنکھیں' ناک' رخسار' منہ' ہونٹ' دانت' زبان' ٹھڈی' کان' گردن' شانے' ہاتھہ' انگلیاں' ناخن' پاؤں' دل' اور روح وغیرہ پر الگ الگ اشعار نقل کئے گئے ہیں - اگر کسی باب میں سر کا ذکر ہے تو اس باب کا خاتمہ لفظ "سر" پر ہوگا اور اگر کسی باب میں بالوں کا ذکر ہے تو اس کا خاتمہ لفظ "مُو" پر ہوگا - اسی طرح ہر باب میں التزام کیا ہے - یہ سب اشعار غزلوں کے ہیں - غزل میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں ملے جلے ہوتے ہیں - مشرقی شعراء کے ہاں عورت کی شخصیت خدا کا پر تو ہوتی ہے اور کبھی کبھی وہ ان دونوں کو اپنے بے تکے تخیل سے ایک دوسرے میں ضم کردیتے ہیں - ٹینیسن نے جو آج کل انگلستان کا سب سے بڑا شاعر ہے کس خوبی سے اس مضمون کو باندھا ہے - وہ کہتا ہے :

تجھے مشکل ہی سے خاکی کہا جا سکتا ہے اور نہ تو پورے طور پر ملکوتی ہی ہے - تیرے حسن کو الفاظ کے توسط سے نہیں ظاہر کیا جا سکتا'

تیرے عنبرین لہلہاتے ہوئے بال *
اس کنول کے پھول کے مثل ہیں جن میں سے ہوکر سورج غروب ہوتے وقت جھانکتا ہے —

ان سیکڑوں مصنفوں میں جن کا اس تذکرہ میں ذکر ہے سب کے سب شاعر ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ غالباً ان میں بہت تھوڑے ایسے ہیں جنھیں صحیح معنوں میں شاعر کہا جا سکتا ہے - ان میں بیشتر تک بندیاں کرتے ہیں - ان کی شاعری ہمارے لئے زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں - قدیم یونانی شاعر کالی 'ماک' کا قول ہے کہ "خدائے شعر کا دیدار ہر کس و ناکس کو میسر نہیں آ سکتا" —

سراپائے سخن سے مجھے بعض ایسی تصانیف کا علم ہوا ہے جن کے متعلق شاید مجھے کہیں اور معلومات نہ ملتیں - مثلاً بعض ایسے دیوان اور تذکرے ہیں جن کا ذکر اس میں موجود ہے اور مجھے پہلی مرتبہ اس کتاب کے ذریعہ سے ان کا علم ہوا - جب میں نے اپنی کتاب "تاریخ ادب ہندی و اردو" سنہ ۱۸۲۹ ع میں شائع کی تھی تو اس وقت ان دیوانوں اور تذکروں سے میں قطعاً لاعلم تھا - اس وقت صرف سات تذکروں کی مدد سے میں نے اپنی کتاب کی تکمیل کی - آج میرے علم میں ۵۴ تذکرے ہیں اور یقیناً ان کے علاوہ بھی اور ہوں گے جن تک میری دسترس نہیں ہوئی - چنانچہ آج میرے پاس بہت کافی مواد موجود ہے جسے میں اپنی کتاب کی تکمیل کے لئے استعمال کرسکتا ہوں —

---

* میں نے لفظ (flaxen کے بجائے Amber) کردیا ہے اس واسطے کہ اہل مشرق عورت کے بالوں کو عنبر سے تشبیہ دیتے ہیں - اس میں رنگ اور خوشبو دونوں کی مناسبت کا خیال پیش نظر ہوتا ہے —

سراپائے سخن کے علاوہ جس میں ادب اردو کی تاریخ کے لئے بہت مواد موجود ہے میرے پرانے شاگرد مسٹر جے - ان - کارٹر نے ایک اور کتاب بھیجی ہے جو مرہٹی زبان میں ہے -- مگر اس میں ہندی کے چوٹی کے شاعروں کا حال مفصل موجود ہے -- یہ کتاب سنسکرت اور دوسرے ماخذوں کی خوشہ چینی کے بعد لکھی گئی ہے * -- میں افسوس کے ساتھہ آج آپ صاحبوں کو یہ خبر سناتا ہوں کہ مسٹر جے - ان - کارٹر کا حال ہی میں انتقال ہوگیا -- موصوف بمبئی تک کی ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری تھے - موصوف نے ازراہ عنایت جو مرہٹی کی کتاب بھیجی ہے اس میں ۶۵ شعرا کا حال موجود ہے -- ان میں سے ۳۰ شاعر ایسے ہیں جن کی نسبت میرے پاس پہلے کوئی معلومات موجود نہیں تھیں —

یورپین جماعتوں کی طرف سے اردو زبان کی مطبوعات میں " Calcutta Religious Tract Society " کی متعدد شائع کردہ کتابیں قابل ذکر ہیں -- ان میں بعض کی نسبت میں یہاں ذکر کرتا ہوں - (۱) مسیحیت اور اسلام کا موازنہ (۲) بعض اشخاص کے مسیحیت قبول کرنے کا بیان (۳) پھلمنی اور کرن کا قصہ ' و غیرہ —

پادری اون صاحب (Rev, Owen) نے شورش عظیم سے پہلے انجیل مقدس کی تفسیر اردو زبان میں مکمل کرلی تھی - شورش کے دوران میں ان کی اور دوسری کتابوں کے ساتھہ یہ بھی ضائع ہوگئی - چنانچہ موصوف نے اسے پھر از سر نو لکھنا شروع کیا - اب عنقریب وہ شائع ہونے والی ہے-ہمیں یہ سنکرتعجب ہوا کہ ایک مسلمان‌عالم سید ' احمد ' غازی پوری انجیل مقدس کی تفسیر اسلامی نقطۂ نظر سے لکھہ رہے ہیں - انھوں نے اپنے ذاتی مطبع میں اسکی چھپائی کا انتظام بھی کرلیا ہے -- یہ کتاب

* ' کوئی چرتر ' مصنفۂ جنارمن رام‌چندر جی - مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۸۶۰ ع

قسط وار چھپے گی - اور رسالے کی صورت میں صفحہ کے ایک طرف انگریزی ہوگی اور دوسری طرف اردو ترجمہ اور تفسیر -- ہر رسالہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہوگا - ہندوستانیوں کی اس قسم کی کوششیں ہمیں یورپی تاریخ کے اس زمانہ کی یاد دلاتی ہیں جبکہ مسیحیت کے سیلاب کے سامنے یونانی اور رومی مذہبی رسوم پاش پاش ہورہی تھیں اور مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتی تھیں —

مسٹر ڈنکن فوربس نے اپنی اردو لغت کا دوسرا ایڈیشن شائع کردیا ہے اتیشن میں اردو کے الفاظ کو دیوناگری خط میں بھی لکھ دیا ہے۔ انھوں نے یہ کام کمال احتیاط اور دیدہ ریزی کے ساتھ کیا ہے جب ہندی الفاظ فارسی رسم خط میں لکھے جاتے ہیں تو ان کی ہیئت ایسی بدل جاتی ہے کہ انھیں بعض اوقات پہچاننا دشوار ہوجاتا ہے - نیز موصوف نے " باغ و بہار " کا چوتھا ایڈیشن فارسی رسم خط میں نکالا ہے - نسولوس کے مشورے کے مطابق اس کتاب کے بعض ایسے فقروں کو خارج کردیا ہے جو ذوق سلیم کی نظر میں کھٹکتے تھے * —

" باغ و بہار " کے دو ایڈیشن جو لاطینی رسم خط میں شائع ہوئے ہیں ہاتھوں ہاتھ بک رہے ہیں - سنہ ۱۸۳۶ ع میں ایک پرتگالی پو- ایس- ڈی روزاریو نے اس کا ایک

* بہت اچھا ہو اگر موصوف اپنے معاون کار ' چارلس ریو ' کی مدد سے " اخوان الصفا " کا بھی اسی طرح ایک ایڈیشن شائع کریں اور اس میں سے بعض حصوں کو خارج کردیں -- میری رائے میں صفحہ ۱۸ پر جہاں غیر فطری عشق و محبت کا ذکر ہے اسے ضرور خارج کردینا چاہئے -- بدقسمتی سے یہ خیال اہل مشرق کے ہاں بہت عام ہے —

ایڈیشن ہندوستان کے دارالسلطنت کلکتہ میں طبع کرایا تھا ۔۔ موصوف نے ایک لغت بھی لکھی ہے جس میں انگریزی الفاظ کے معنی اردو اور بنگالی میں درج کئے ہیں ۔ افسوس ہے کہ موصوف کا حال ہی میں کلکتہ میں انتقال ہوگیا ۔۔ مونیر ولیمس نے سر چارلس ٹریولین کی فرمائش پر " باغ و بہار " کے اسی ایڈیشن کو تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھہ دوبارہ طبع کرایا ہے ۔۔ مجھے بھی ہندوستانیوں کی طرح بڑی مسرت ہے کہ سر چارلس ٹریولین پھر دوبارہ ہندوستان تشریف لے گئے ہیں ۔۔ ڈنکن فوربس نے بھی لاطینی رسم خط میں اردو کے پہلو بہ پہلو اس کا ایک ایڈیشن نکالا ہے ۔ اس سے پہلے ایڈیشن کی طرح اس میں بھی متن کے مشکل الفاظ کی تشریح کی ہے ۔

" باغ و بہار " کی نسبت میں اپنے سنہ ۱۸۵۳ ع کے خطبے میں ذکر کرچکا ہوں ۔۔ اس جگہ پھر ایک امر کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو پہلے بھی عرض کرچکا ہوں ۔ وہ یہ ہے کہ اسلامی قصوں میں آپ ہمیشہ دیکھیں گے کہ تبلیغ اسلام کی جانب کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور اشارہ کیا جاتا ہے ۔ اور غنائی شاعری ، تصوف ، عشق مجازی اور ہمہ اوست کے مسائل سے آگے نہیں بڑھتی ۔۔ قصوں میں اسلامی عقاید اثباتی نوعیت کیساتھہ پیش کئے جاتے ہیں اور اسلام کی جانب غیر مسلموں کو نہایت موثر انداز میں رجوع کیا جاتا ہے ۔۔ مثلاً باغ و بہار میں جہاں بخارا کے تاجر کا ذکر ہے ، کہ اسے کھوں کر دختر وزیر کی وساطت سے مصائب سے نجات ملتی ہے ، تو وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تاجر دوگانہ شکرانے کا رو بقبلہ ہو کر پڑھنے لگا ۔ وزیر کی لڑکی یہ

حرکات و سکنات دیکھکر متعجب ہوتی ہے اور اس تاجر سے دریافت کرتی ہے کہ وہ یہ کیا کررہا ہے ؟ تاجر جواب دیتا ہے : " جس خالق نے ساری خلقت کو پیدا کیا اور تجھہ سی محبوبہ سے میری خدمت کروائی اور تیرے دل کو مجھہ پر مہربان کیا اور ویسے زندان سے خلاص کروایا ' اس کی ذات لا شریک ہے ' اس کی میں نے عبادت کی اور بندگی بجا لایا اور اداۓ شکر کیا -- یہ بات سنکر کہنے لگی ' تم مسلمان ہو ؟ - میں نے کہا شکر الحمد للہ - بولی میرا دل تمہاری باتوں سے خوش ہوا میرے تئیں بھی سکھاؤ اور کلمہ پڑھاؤ -- میں نے دل میں کہا الحمد للہ کہ یہ ہمارے دین کی شریک ہوئی - غرض میں نے لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھا ' اور اس سے پڑھوایا — "

ایک اور جگہ بصرے کے تاجر کا اسی طرح ذکر ہے جسے اس کے بھائیوں نے قتل کرنے کی نیت کی تھی - وہ جب بیہوشی سے ہشیار ہوا تو سرانديپ کی شہزادی اور اس کی خواصیں اس کے چاروں طرف جمع تھیں -- شہزادی مہربانی سے بولی : " اے عجمی ! خاطر جمع رکھہ ' کڑہ مت ' اگرچہ کسو ظالم نے تیرا یہ احوال کیا لیکن بڑے بت نے مجھہ کو تجھہ پر مہربان کیا ہے -- " اس پر تاجر نے پکے مسلمان کی حیثیت سے کہا :- " قسم اسی خدا کی جو واحد اور لا شریک ہے "- کچھہ دنوں بعد ایسا اتفاق ہوا کہ شہزادی نے تاجر کو نماز پڑھتے دیکھا اور اس سے پوچھنے لگی :— "

اے جاہل ! ہمارے بڑے بت میں کیا برائی دیکھی جو غائب خدا کی پرستش کرنے لگا ؟ میں نے کہا انصاف شرط ہے ' تک غور فرمائیے کہ بندگی کے لائق وہ خدا ہے کہ جس نے ایک قطرے پانی سے تم سار کا

محبوب پیدا کیا ' اور یہ حسن و جمال دیا کہ ایک آن میں ہزاروں انسان کے دل کو دیوانہ کر ڈالو بت کیا چیز ہے کہ کوئی اس کی پوجا کرے ؟ ایک پتھر کو سنگ تراشوں نے گھڑ کر صورت بنائی اور دام احمقوں کے واسطے بچھایا - جن کو شیطان نے ورغلایا ہے وے مصنوع کو صانع جانتے ہیں - جسے اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں اُس کے آگے سر جھکاتے ہیں - اور ہم مسلمان ہیں ' جس نے ہمیں بنایا ہے ہم اسے مانتے ہیں ' اُن کے واسطے دوزخ ' ہمارے لئے بہشت بنایا ہے -- اگر بادشاہزادی ایمان خدا پر لاوے ' تب اس کا مزا پاوے ' اور حق و باطل میں فرق کرے اور اپنے اعتقاد کو غلط سمجھے "ـــ

اس ضمن میں میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلامی کتب عقاید و تفاسیر کے متعلق مسیحی دینیات کے علماء کو پوری واقفیت رکھنی ضرور ہے -- ہمیں چاہئیے کہ ان بیانات کو جو انجیل اور مسیحیت کے متعلق اسلامی عقاید میں ملتے ہیں بیکار سمجھہ کر ٹھکرانہ دیں - در اصل ان میں ہمیں بہت ساری یہودی اور نصرانی روایات ملیں گی - میں اس باب میں مسٹر اوڈول کا ہم خیال ہوں جنھوں نے حال ہی میں قرآن کا انگریزی ترجمہ کیا ہے ' کہ قرآن اور محمد (صلی‌اللہ عیلہ وسلم) کی بدولت جو تغیرات پیدا ہوئے انھیں فی الحقیقت دنیا کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے -- لوگوں کو اس بات کا علم نہیں کہ قرآن کا بیشتر حصہ ان روایات پر مشتمل ہے جو محمد (صلی‌اللہ علیہ‌وسلم) کے زمانے اور ان کے ملک میں مشہور تھیں -- توریت کی تلمودی اور یہودی روایات اور وہ قصے جو عرب و شام کے یہودیوں اور عیسائیوں میں مشہور تھے قرآن میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھہ موجود ہے -- اس کے علاوہ جعلی (Evangiles) کے بیانات محمد (صلی‌اللہ علیہ وسلم) نے قرآن میں شامل کرلئے - بظاہر یہ معلوم ہوتا

ہے کہ ان کو ان جعلی (Evangiles) کا علم تھا - انھیں در اصل مسیحی مذہب کی دیو مالا سے زیادہ وقعت نہ دینی چاہئے تھی مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تخیل کو یہ مبالغہ آمیز قصے ایسے پسند آئے کہ انہوں نے انھیں سچ جان کر قابل قبول سمجھا -- میرا خیال ہے کہ باوجود ان تمام باتوں کے ہمیں قرآن کو قطعی طور پر جھوٹ نہیں سمجھنا چاہئے -- تاریکیوں میں بھی کہیں نہ کہیں روشنی کی جھلک موجود ہوتی ہے -- سیل اور اوروں کی طرح میں بھی سینٹ آگسٹین کے اس مقولہ کا قائل ہوں کہ دنیا میں کوئی ایسا جھوٹا عقیدہ نہیں جس کی تہ میں تھوڑا بہت سچ نہ موجود ہو" — *

قرآن بھی ہمارے (Saints) (حواریوں) کی کتابوں کے مثل آیات پر مشتمل ہے - پھر آیات کی بھی دو قسمیں ہیں: محکمات اور متشابہات - مجھے یہ تقسیم بہت پسند آئی - کیا اچھا ہو اگر توریت و انجیل کے لئے بھی اس تقسیم کو اختیار کر لیا جائے - خاصکر انجیل کے متعلق اگر ہم اس تقسیم کو قبول کرلیں تو بہت آسانی ہو جائے - انجیل میں بعض جملے ایسے ہیں (خوش قسمتی سے ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے) جنہیں انسانی عقل و فہم سمجھنے سے قاصر ہے اور ان کی کوئی معقول تاویل بھی ممکن نہیں - وہ کٹر عیسائی جو انجیل کو الہامی کتاب سمجھتے ہیں ان جملوں کو پڑھکر بڑے ست پٹاتے ہیں - ہمارے نزدیک یہ بہت اچھا ہو اگر ہم کھلم کھلا کہہ دیں کہ ہم ان جملوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے کہ وہ بے معنی ہیں - یا تو یہ ہے کہ ہمارا علم اس قدر محدود ہے کہ ہم ان مخصوص مطالب

---

* Quæstiones Evangelicæ

کو نہیں سمجھہ سکتے یا یہ کہ بعد کے تصرفات یا ابتدائی انجیل نویسوں
کی غلط نقل کی وجہ سے بعض مبہم جملے انجیل کے متن میں شامل ہوگئے
بعد میں آنے والوں نے انجیل کے احترام و تعظیم کی خاطر کوئی تبدیلی
کرنا گوارا نہ کی - میں سمجھتا ہوں یہ بہتر ہوگا اگر ہم صرف آیات
بینات کو شمع ہدایت بنائیں - یہ بھی ضرور نہیں کہ مہمل جملوں کو
خواہ مخواہ معنی پہنائے جائیں - ممکن ہے کہ خدا کو یہی منظور ہوکہ وہ
اسی طرح رہیں - بہر حال ہمیں اس باب میں سینٹ پال کے مقولہ کو
یاد رکھنا چاہئے کہ " لفظ باعث ہلاکت ہوتا ہے مگر لفظ کی روح (یعنی اس
کا اصلی مدعا) زندگی عطا کرتی ہے " —

بہر حال مسیحی مبلغین کے لئے یہ از بس ضروری ہے کہ وہ قرآن کا
مطالعہ کریں اگر واقعی وہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کی طرف راغب کرنا
چاہتے ہیں - ورنہ مسلمانوں کو مسیحی تعلیمات کی جانب متوجہ کرنا
بہت دشوار ہے - قرآن میں انجیل و توریت کے الہامی کتابیں ہونے کے
متعلق بہت ساری آیتیں ملتی ہیں - خود محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) نے
ان دونوں کتابوں کی صداقت کو تسلیم کیا ہے - ولیم میور نے جن کی
کتاب " حیات محمد " (صلی اللہ علیہ و سلم) آج کل بڑی مقبول ہو رہی ہے،
قرآن کی ان سب آیتوں کو ایک جگہ جمع کردیا ہے جن میں انجیل و توریت
کے آسمانی کتابیں ہونے کے متعلق تصدیق ہوتی ہے - * وہ لوگ جو اس مضمون
سے بے خبر ہیں انہیں یہ دیکھکر بہت تعجب ہوگا کہ قرآن نے بارہا توریت

---

* The testimony borne by the Coran on the Jewish and Christian Scriptures. Agra, 1856.

و انجیل کی صداقت تسلیم کی ہے —

اب ہم پھر ہندوستان کی جانب رجوع کرتے ہیں —

مجھے کپتان فلر کی مرتب کردہ رپورٹ کا ایک نسخہ حال ہی میں ملا ہے ۔ اس میں پنجاب کے سرشتہ تعلیم کے متعلق پوری معلومات جمع کردی گئی ہیں ۔ اس رپورٹ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸٦۰ ۔ ٦۱ ع میں ۳۷ ہزار، ۲ سو ۸۰ طالب علم اردو زبان میں تحصیل علم کرنے میں مشغول ہیں ۔ اردو کی صرف و نحو کی تعلیم با قاعدہ دی جاتی ہے ۔ اور فارسی سے زیادہ زور اردو کی صرف و نحو پر دیا جاتا ہے ۔ فارسی زبان کا میں نے مقابلتاً اس لئے ذکر کیا کہ ہندوستانی لوگ اور خصوصاً ہندوستانی مسلمان فارسی زبان کو بہت عزیز رکھتے ہیں اور اسے اپنی کلاسک زبان خیال کرتے ہیں اسی طرح تحصیلی مدارس میں ہندو اور مسلمان طلبا کی کل تعداد چھ ہزار تین سو ہے ۔ اس میں سے ۴ ہزار تین سو طالب علم اردو زبان پڑھتے ہیں اور صرف ۲ ہزار نو سو چونتیس طلبا فارسی پڑھتے ہیں ۔ دیہاتی مدارس کا بھی یہی حال ہے ۔ کل طلبا کی تعداد ۳۲۱٦۵ ہے اس میں سے ۳۱۱٦۰ اردو پڑھنے والے ہیں اور ۱۴۲۳۷ فارسی پڑھنے والے ۔ نارمل اسکولوں میں جہاں استادوں کی تعلیم ہوتی ہے، طالب علموں کی کل تعداد ۴۵۱ ہے ۔ اس میں سے ۴۱٦ اردو پڑھتے ہیں اور صرف ۵۲ ہندی پڑھتے ہیں ۔ اور فارسی پڑھنے والوں کی تعداد ۲٦۳ ہے ۔ اضلاع کے مدارس میں طلبا کی تعداد ۲۳۱۹ ہے ۔ اس میں سے ۱۸۴٦ اردو پڑھنے والے اور ۴۷۲ فارسی پڑھنے والے ہیں —

ہندوستانی مدارس میں انجیل پڑھانے میں اب کوئی دشواری نہیں ہوتی ۔ چنانچہ بنگال کے ایک ہندو اخبار میں اس مسئلہ کی نسبت اس

الفاظ میں اظہار خیال کیا گیا ہے :—

”جس طرح نیشکر کی ہر پور میں جڑ سے چوٹی تک رس بھرا ہوتا ہے اسی طرح انجیل کے ہر صفحے میں تعلیم کے جواہر ریزے پنہاں ہیں —

صوبہ شمال مغربی کی حکومت قابل مبارک باد ہے کہ اس نے دیسی لوگوں کی تعلیم کی طرف خاص شغف ظاہر کیا - اس صوبے کے مدارس میں محض انگریزی زبان اور یورپی علوم ہی کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے بلکہ خود دیسی لوگوں کی زبان اور ان کے علوم کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے - چنانچہ حکومت کی سرپرستی میں سنسکرت کی کتابوں کے ہندی میں ترجمے کرائے گئے ہیں ان ترجمہ کرنے والوں کی یہ کوشش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سنسکرت کے اصلی الفاظ اور محاوروں کو ہندی ترجمے میں کھپایا جائے - اس سے یہ ہوتا ہے کہ ترجمہ کی مدد سے سنسکرت کی عبارت بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے - اس قسم کے ایک ترجمے کی کتاب میرے پاس ہے - جیمس آر بلنٹائن کے مشورہ اور ہدایت کے مطابق یہ ترجمہ کیا گیا ہے - سنسکرت کتاب ہتوپادسا کی یہ پہلی فصل ہے - اور پنڈت بھری لال نے اس ترجمے میں وہ حصے چھوڑ دئے ہیں جنھیں طالب علموں کی کتاب میں رکھنا کسی طرح مناسب نہ تھا —

حال ہی میں کلکتہ میں ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ شام کے وقت علمی اور ادبی مجالس منعقد کرے تاکہ ہندوستانی اور یورپین آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اختلاط بڑھا سکیں - اس میں دونوں کا نفع مد نظر ہے - ہندوستانی یورپین لوگوں کے میل جول

سے بہت سی ایسی باتیں سیکھہ سکتے ہیں جن سے وہ مطلق بے خبر ہیں ۔ یورپین لوگ اگر ہندوستانیوں کے ساتھہ میل جول بڑھائیں تو اس سے انہیں ان کے مزاج اور طبیعت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور ہندوستانی زبان و ادب کا ان میں ذوق پیدا ہوگا —

ہندوستان میں تعلیم نسواں کی طرف بھی توجہ کی جارہی ہے ۔ شہر دہلی میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے چار مدارس کھولے گئے ہیں — لڑکیوں میں بھی علم کا شوق پیدا ہوچلا ہے ۔ ایک پانچواں مدرسہ اور حال ہی میں قائم کیا گیا ہے اس مدرسے میں صرف تیموری خاندان کی شہزادیاں داخل ہوسکتی ہیں اس وقت ۵۰ شہزادیاں تعلیم پارہی ہیں ۔ شہر 'بنارس' میں با حیثیت ہندؤں کی ایک انجمن قایم کی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندو عورتوں میں تعلیم کو رواج دیا جاے ۔ اس کے ساتھہ ساتھہ انجمن کے پیش نظر یہ بھی ہے کہ ہندی زبان میں لڑکیوں کے لئے کتابیں چھاپی جائیں۔ کتاب صرف اس وقت انجمن کی طرف سے چھاپی جاتی ہے جب کہ انجمن کا صدر اور ارکان کی اکثریت اس کتاب کے متعلق اپنی پسند کا اظہار کر دے ۔ * 'بمبئی' میں ایک دولتمند پارسی مانک جی 'کرستجی' نے اپنے خاندان کی لڑکیوں کو یورپی طرز کی تعلیم دینا شروع کی ہے ۔ موصوف نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے مکان کے ایک حصے کو لڑکیوں کے مدرسہ کے لئے وقف کردیں گے ۔ ان کا ارادہ ہے کہ اس میں ایک مدرسہ قایم کریں اور تعلیم دینے کے لئے ایک انگریز استانی کو رکھیں ۔ ان کی دو صاحبزادیاں بھی اپنے ہم وطنوں کی ہمدردی میں اس مدرسہ میں

---

* ملاحظہ ہو Delhi Journal اور Delhi Gazette (Allen,sInd, Mail Nov. 27, 1862.)

کام کریں گی - 'بمبئی' کے گورنر لارڈ 'الفنسٹن' نے اس تجویز کی پورے طور پر ہمت افزائی کی ہے - لارڈ موصوف نے اس مدرسہ کی تجویز کے متعلق فرمایا کہ دنیا میں جہاں کہیں عورتوں کو تعلیم دی گئی ہے وہاں لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت بڑھ گئی ہے اور خود مردوں کے اخلاق پر عورتوں کی تعلیم کا اچھا اثر پڑتا ہے - ہم یورپ میں مشکل ہی سے ان عورتوں کی حالت زار کا اندازہ کر سکتے ہیں جو محلسرا کی زندگی میں بہت جلد اپنا حسن و شباب کھوچکتی ہیں اور ان کے چاہنے والے ان کی طرف سے بے پروائی برتنا شروع کردیتے ہیں بقول ایک شاعر :—

پژمردہ اور ذلیل

گلچیں نے انہیں توڑ کر ایک طرف بے پروائی سے پھینک دیا تازگی فنا ہوگئی اور ان کا حسن کمھلا گیا —

اب وہ قابل نفرت چیزیں ہیں - سبھوں نے انہیں چھوڑ دیا - اب ان کا ہر قدم بربادی کی جانب اُٹھ رہا ہے —

میری طرح جن صاحبوں کو گذشتہ ماہ ستمبر میں ان دونوں پارسنوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ غالباً میرے اس دعوے کی تائید کریں گے کہ مانک جی کو اپنی بیٹیوں کے انگریزی تعلیم دلانے میں پورے طور پر کامیابی ہوئی - یہ 'پارسن' پہلی ہندوستانی عورتیں ہیں جو یورپ آئی ہیں - وہ ہندستانی میں جو ان کی مادری زبان ہے اور انگریزی اور فرانسیسی میں بلا تکلف گفتگو کر سکتی ہیں - مسٹر 'مانک جی' پہلے پہل سنہ ۱۸۴۱ ع میں یورپ آئے تھے - اس دفعہ وہ اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ دوبارہ آئے ہیں تاکہ 'لندن' جاکر ان کے قیام و تعلیم کا انتظام کریں - 'لندن'

میں پہلے سے کئی ایک پارسی موجود ہیں جو نہایت دولتمند ہیں۔ موصوف 'لندن' سے واپسی پر 'پیرس' میں چند روز ٹھہرے تاکہ اپنی صاحبزادیوں کو شہر پیرس کی سیر کرائیں —

حضرات! ہم یہ دعوی کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اردو زبان دن بدن ترقی کر رہی ہے۔ چنانچہ بمبئی گزٹ مورخہ ۲۷ فروری سے مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بنگال اور بہار و اڑیسہ کے زمینداروں اور دوسرے باشندوں نے وائسرائے گورنر جنرل بہادر کو ایک عرضداشت بھیجی ہے جس میں یہ درخواست کی ہے کہ جدید ہائی کورٹ میں اردو زبان میں کاروائی کی جائے —

'اودھ' کے صوبے میں صرف ان وکلاء کو وکالت کی اجازت ملتی ہے جو اور دوسری شرائط کے ساتھ اردو دانی کی شرط بھی پوری کریں۔ ان کا امتحان بول چال اور تحریر دونوں میں لیا جاتا ہے تاکہ ان کی اردو دانی کی پوری تصدیق ہوجائے —

حال میں متعدد اشخاص کو حکومت برطانیہ نے استار آف انڈیا (ستارۂ ہند) کا خطاب عطا کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو تقریبیں ہوئیں ان میں اردو زبان ہی میں تقریریں کی گئیں۔ اسی طرح نومبر سنہ ۱۸۶۱ ع میں مہاراجہ 'کشمیر' کی گدی نشینی کے موقع پر 'جموں' میں جو دربار منعقد ہوا اس میں مسٹر 'ڈیوس' نے اُردو میں تقریر کی۔ مسٹر ڈیوس اس موقع پر گورنمنٹ ہند کے نمایندہ تھے۔ جب موصوف تمغے راجہ کے سینے پر ٹانک چکے تو راجہ نے بھی ان کی تقریر کا جواب اردو میں دیا —

ہندوستان کے ایک دوسرے حصے بنگال میں جس وقت سر جے پی گرانٹ سابق لفٹنٹ گورنر یورپ واپس جا رہے تھے تو 'کلکتہ' کے باشندوں

نے ۱۹ اپریل کو ایک جلسہ منعقد کیا جس میں موصوف کی ہردلعزیزی اور خلوص کا اظہار کیا - جلسہ کی صدارت راجہ ' راد ھا کنت دیو ' بہادر نے کی - موصوف بڑے فاضل آدمی ہیں اور ایک ضخیم سنسکرت کی لغت کے مصنف ہیں - اس موقع پر موصوف نے جو تقریر کی وہ اردو میں تھی - ان کی تقریر کے بعد راجہ ' کالی کرشن ' بہادر کھڑے ہوئے - موصوف بھی مشہور مصنف ہیں اور آپ نے ' گے ' (Gay) کی کہاوتوں کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے - آپ نے بھی حسب موقع اردو میں تقریر کی نہ کہ بنگالی میں - ہندوستان کے اخباروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر جان ' گرانت ' کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا - اس میں تشکر و احترام کے جذبات کا اظہار تھا - اور ان گرانقدر خدمات کا ذکر تھا جو موصوف نے اپنے زمانے میں صوبۂ بنگال کی کیں - یہ سپاس نامہ تجویز کی شکل میں جلسہ میں متفقہ طور پر منظور ہوا - اس کے بعد راجہ اپروا کرشن نے اردو میں تقریر کی اور یہ تجویز پیش کی کہ کلکتہ میں کسی جگہہ سر جان گرانت کا مجسمہ نصب کیا جائے ---

(Haileybury) کی فوجی اکادمی میں (Woolwich کے کالج کی جگہہ) مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا - یہاں مسٹر کاٹن ماتھر ہندوستانی زبان کی تعلیم دیتے تھے - مگر اب لندن کے (King's Collage) کنگس کالج میں مشرقی علوم کا ایک علحدہ شعبہ قایم ہوا ہے - (Haileybury) کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد متعدد اشخاص نے ملکی نظم و نسق اور علم و فضل میں بڑا نام پیدا کیا تھا - امید ہے کہ وہی روایات اب بھی قایم رہیں گی - (King's College) کے مشرقی شعبہ میں مسٹر ڈنکن ایدورڈ ھال اردو زبان کی تعلیم دیتے ہیں اور مسٹر بلنٹائن سنسکرت پڑھاتے ہیں - اس

شعبے میں صرف درس ہی نہیں ہوں گے بلکہ یہیں سے تحریری اور زبانی امتحانوں کے بعد قابلیت کے اعتبار سے سند ملے گی - اس سند کی بدولت ہندوستان میں سرکاری خدمات بآسانی مل سکیں گی —

میں اپنے پچھلے خطبوں میں ذکر کر چکا ہوں کہ آکسفورڈ اور کیمبرج میں بھی اردو کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے - سنہ ۱۸۵۶ ع میں ڈبلن یونیورسٹی میں بھی اردو فارسی اور عربی کی تعلیم شروع ہو گئی ہے - لندن کے یونیورسٹی کالج کی طرح ڈبلن میں بھی ایک ہندوستانی عالم مولوی اولاد علی ان زبانوں کی تعلیم دینے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں —

حضرات ! ہمیں چاہئے کہ اپنے سامنے ایک اعلیٰ علمی نصب‌العین رکھیں - دوسرے ممالک کے لوگ ہم فرانسیسیوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ سارا عالم فرانسیسی بولتا ہے مگر فرانسیسی سوائے اپنی زبان کے اور کوئی زبان نہیں بولتے * ہمارا فرض ہے کہ اس الزام کو اپنے سر سے دور کرنے کی کوشش کریں - ہمیں غیر زبانیں بولنے کی عادت ڈالنی چاہئے - اور غیر زبانوں سے میری مراد صرف یورپی زبانیں ہی نہیں بلکہ مشرقی زبانیں بھی ہیں - ہمیں اپنے پڑوسیوں (انگریزوں) سے اس باب میں سبق لینا چاہئے —

مسٹر جان ' میور ' نے جو مسٹر ڈبلو ' میور ' کے بھائی ہیں ' یہ خوب کیا کہ ۴۰ ہزار روپے کی رقم اپنے شہر ' اڈنبرا ' کی یونیورسٹی میں سنسکرت ادب اور مقابلتی لسانیات کی " چیر " قایم کرنے کے لئے وقف کردی - حکومت کی طرف سے اس رقم میں اور اضافہ کیا جائے گا اور

---

* ' فرانسیسی کا خیال ہے کہ سب لوگوں کو چاہئے کہ اس کی زبان سیکھیں - خود اس کا یہ فرض ہے کہ سوائے اپنی زبان کے اور کوئی دوسری زبان نہ بولے " (The Forgery - G. P. R. James.) —

اس طرح یہ ممکن ہوگا کہ سنسکرت کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو یہاں اردو کی بھی تعلیم شروع ہو جائے ہمیں پوری توقع ہے کہ یہ انتظام جلد مکمل ہو جا ے گا اور علم لسانیات کو ترقی دینے کی ایک شکل پیدا ہو جائے گی - یہ علم کیا بہ اعتبار اپنی دلچسپی اور کیا بہ اعتبار اپنے مفید ہونے کے نہایت اہمیت رکھتا ہے - اس سے فلسفۂ تاریخ اور دینیات دونوں مستفید ہو سکتے ہیں - چنانچہ میرے اس دعوے کا اگر آپ ثبوت تلاش کرنا چاہیں تو وہ 'مکس ملر' کے "لکچروں" میں موجود ہے - موسیو سینٹ ھلیر نے ان لکچروں کا خلاصہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے - لسانیات کے متعلق میں اس وقت صرف ضمناً اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے زمانے کے ماہرین لسانیات نے صرف و نحو کے اعتبار سے زبانوں کو تین خاندانوں میں تقسیم کیا ہے - ایک انفرادی (Monosyllabie) دوسری سلاحقی (Agglutinatine) تیسری تصریفی (Amalgamic)

پہلی قسم کے تحت چینی زبان آتی ہے - دوسری قسم کے تحت ترکی اور دوسری تورانی زبانیں اور تیسری قسم کے تحت آریائی زبان آتی ہیں - ان میں ایرانی اور انڈو آریائی زبانیں سب شامل ہیں - اردو زبان دوسری اور تیسری قسموں کے تحت آتی ہے اس میں تورانی ارر ایرانی عناصر پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں - صرف و نحو کے اعتبار سے اردو زبان ایرانی ہے اور الفاظ کے اعتبار سے سامی * —

* 'گارساں دتا سی' کی اس رائے کو آج ماہرین لسانیات تسلیم نہیں کریں گے - لیکن ہمیں یہ ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جس زمانے میں اس نے اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی اس وقت علم لسانیات کی ابتدا تھی - تقریباً ۸۰ سال کی تحقیق نے پرانے نظریوں کو بالکل درہم برہم کر دیا - مترجم

مسٹر ' دیو پان ' نے جو انسٹیٹیوٹ کے رکن اور سینیٹ کے ممبر ہیں اور ایک فاضل شخص ہیں اپنی کتاب " اقوام کی پیدائشی قوت " میں ہندوستان کے متعلق ایک باب رکھا ہے - اس باب کا عنوان " تصویر ہند " ہے - اس میں وہ کہتے ہیں کہ برطانوی ہند کی مردم شماری سرکاری کاغذات کے مطابق اس وقت ۱۸ کرور ۷۰ لاکھ ہے - آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان تقریباً ۲۰ کرور نفوس کے درمیان جو چیز ایک مشترک رشتے کا کام دیتی ہے وہ اردو زبان ہے - یہ زبان پورے یورپ کے برابر رقبہ زمین میں بولی جاتی ہے - اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر ہے کہ آج یہ بیس کرور انسانی نفوس برطانیہ کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں - اس انتظام میں یقیناً مشیت ایزدی کو دخل ہے —

" گلزار شہادت "

از

غلام ہمدانی مصحفی تصنیف سنہ ۱۲۱۶ ھ

(یہ مثنوی میرے کتب خانے کے دیوان مصحفی کے قلمی نسخے سے نقل کی گئی ہے اور اس کا مقابلہ اور تصحیح جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا بانکی پور پٹنہ نے اپنی مہربانی سے خدابخش خاں لائبریری کے نسخے سے کی ہے - " ن خ " سے مراد نسخہ خدابخش خاں ہے - خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانے میں یہ مثنوی دیوان پنجم مصحفی میں ہے - میرا نسخہ غالباً مصحفی کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا - خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانے کا نسخہ مصحفی کی وفات کے دو ایک برس بعد لکھا گیا ہے - اس میں دو شعر زیادہ ہیں ، باقی ایسے اختلافات جو قابل لحاظ تھے حاشیے میں درج ہیں - یہ مثنوی جیسا کہ خود مصحفی نے لکھا ہے سنہ ۱۲۱۶ ھ میں تصنیف ہوی - مثنوی " بحرالمحبت " کا زمانۂ تصنیف بھی اسی کے قریب ہوگا کیونکہ یہ مثنوی بھی خدا بخش خاں لائبریری کے دیوان پنجم میں موجود ہے) —

اڈیٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مثنوی عشقیہ

(۱) ہے یہ جو نئی سی ایک حکایت   ایک زن سے ہے اسکی یوں روایت

(۲) یعنی کہ ہے مجکو اس قدر یاد   ہمسایہ مری تھی ایک پری زاد

(۳) سن دس کی دوازدہ کی تھی وہ   میں حور جو تھی تو تھی پری وہ

(۴) کھیلیں تھیں ہمیشہ ہو بہم شاد   ہم جولی مری تھی وہ پری زاد (ن)

(۵) باہم یہ رہے تھا عہد و پیماں   یعنی کہ سنو ہو میری بہیناں (ن)

(۶) جس وقت کہ بیاہ ہو تمہارا   ملنا مت چھوڑیو ہمارا

(۷) یا پہلے میں ہی بیاہی جاؤں   جس وقت کہ تم بلاؤ آؤں

(۸) چاہت میں ہماری اور تمہاری   آوے نہ فراق و اضطراری

(۹) ناگاہ بگردش ستارہ   منسوب ہوئی وہ ماہ پارہ

(۱۰) بیاہی گئی ایک مغل کے گھر میں   رہنے لگی قید بام و در میں

(۱۱) اتنے میں بحکم اعتقادی   کچھہ گھر میں اوتھی ہمارے شادی

(۱۲) عورات قبیلہ ہر طرف سے   آئیں کچھہ اپنے ساتھہ لے لے

(۱۳) شادی کی سنی جوہیں ادائی   بن ٹھن کے وہ رشک مہ بھی آئی

(۱۴) اوتری جو محافہ میں سے وہ ماہ   کی دیکھہ کے آسمان نے بھی آہ

(۱۵) چھوٹی بھی اوسکی چشم بددور   یہ حور تو وہ تھی (ن) بچۂ حور

(۱۶) وہ خود بتجمل عروسی   چھوٹی کا لباس سندروسی

(۱۷) نسبت میں وہ ماہ اور یہ ناہید   صورت میں سہا یہ اور وہ خورشید

---

(۴) ن‌خ بہم ہمیشہ دل شاد   (۵) ن‌خ گوئیاں   (۱۵) ن‌خ وہ بھی

(۱۸) پوشاک بلا تو زیور آفت — در تو پہنیں سراسر آفت

(۱۹) کانوں میں جڑاؤ اوس کے بالا — ہو جیسے ستارہ دار ہالہ

(۲۰) بینڈی کی چمک جبیں پہ ایسی — جو ٹانک نہو نگیں پر ایسی

(۲۱) نتھ ناک میں ہالۂ قمر تھی — یا قلزم حسن کے بھنور تھی

(۲۲) کانوں میں وہ بالیاں طلائی — کرتی تھیں ادا سے کج ادائی

(۲۳) بازو پہ کسا ہوا وہ بھوجبند — تھی جس کی پری بھی آرزو مند

(۲۴) الماسی کڑے کلائیوں میں — حل کردہ قمر صفائیوں میں

(۲۵) ہاتھوں میں وہ پور پور چھلے — تھے جن سے بخوں طپاں معلے

(۲۶) جگنو وہ گلے میں ماہ پارہ — جوں ماہ کے پاس ہو ستارہ

(۲۷) الماس کی آرسی وہ سادہ — موتی کوئی ہوئے جو بیادہ (ن ا)

(۲۸) پاوں میں وہ موتیوں کی پازیب — ہو جاوے پری کو جس سے آسیب

(۲۹) پھر تسپہ کڑی غضب وہ جھدار — ہو جس کی صدا (ن) سے فتنہ بیدار

(۳۰) پھر رنگ کفک وہ تشنۂ خون — لیلیٰ ہو جائے جس کی مجنون

(۳۱) با ایں ہمہ شان خود نمائی — جب پردہ اوٹھا وہ باہر آئی

(۳۲) نزدیکی میں اک جوان سادہ — تھا کرسی زر پر ایستادہ

(۳۳) دیکھ اوس کو یہ بادل نظارہ (ن) — کرسی سے گرا وہ جوں ستارہ

(۳۴) ہو کر کے خدنگ خوردۂ عشق — دل اوس کا ہوا فسردۂ عشق

(۳۵) سو جان سے ہو وہ اوس پہ شیدا — لیلیٰ نے کیا ہے قیس پیدا

---

(۲۷) ن خ (بہ جلسہ بہادہ) (۲۹) ن خ کھلک

(۳۳) اغلب یہ ہے کہ "بادل نظارہ" کی جگہ جو دونوں نسخوں میں ہے "بآول نظارہ" ہو اور پہلے مصرعہ میں "یہ" نہ ہو جو غور ضروری ہے -

(۳۶) دل اوس کا بنا تمام (ن) حسرت — کچھہ اوس میں رهی نه تاب و طاقت
(۳۷) هم عهد هوا بناصبوری — مرنا هی پڑا اوسے ضروری
(۳۸) حیرت زده هو نگاه ره گئی — آکر کے لبوں په آه ره گئی
(۳۹) برق ایک دهاک میں اوس په پڑ گئی — تهی طاقت تن سو سب نبڑ گئی
(۴۰) سودے نے کیا مقام سر میں — اوٹهنے لگی سول سی جگر میں
(۴۱) مژگاں هوئیں اشک خوں سے تر آنکهیں — رنگیں بهی (ن) برج عقد پروئیں
(۴۲) وه ساده بعالم جوانی — آیا به بلائے نا گہانی
(۴۳) الفت میں زبس که نو دوس تها — خود وه بمقام شعله حس تها
(۴۴) دیکهی جو یه حسن کی تجلی — بے خود هو گرا بسان موسی
(۴۵) لب خامش و شور و ناله دل میں — ایک طرفه خروش آب و گل میں
(۴۶) اوس شادی کے گهر میں ایک زن تهی — گویا بشگفتگی چمن تهی
(۴۷) گهر کا بس اوسیکی دم سے تها بند — وه زن یه کهیے تهی تهی سری نند
(۴۸) که پردے میں اوس کے حلواسوهن — بهیجا تا کهاویں اوس کو سب زن
(۴۹) که لونگ چڑے باین بهانه — ارسال کئے درون خانه
(۵۰) که پهولوں کے هار مول لیکر — بهیجے پئے نذر آں سمن بر
(۵۱) تا دیکهے وه گل بهی خو ئے الفت — آوے اوسے دل سے (ن) بو ئے الفت
(۵۲) القصه تمام دن وه بیتاب — اوس روز په رها بسان سیماب
(۵۳) وهاں سب کو وه شب کٹی بشادی — دل اوس کے یه داغ نامرادی
(۵۴) انکهیں سو ئے چرخ باز اوس کی — جوں چشم نظاره ساز اوس کی
(۵۵) تاروں سے وه زخم دل نمک سود — لب پر وهی آه حسرت آلود
(۵۶) سرد ے کا سا ایک خیال دل میں — اک دغدغه کمال دل میں
(۵۷) حرماں سے بمرگ دل نهاده — بدنامی کا اوس کی ڈر زیاده

---

(۳۶) ن خ میں " تمام " هی هے لیکن حاشیه پر لفظ " مقام " لکها هوا هے -

(۴۱) ن خ آنکهیں بدهیں — (۵۱) ن خ اون سے

(۵۸) یہ سوچ کہ دیکھوں صبح کیا ہو | تن میں رہے جان یا ہوا ہو
(۵۹) ہے شادی کے گھر وہ آج مہمان | کل ہوویگی اپنے گھر میں پنہان
(۶۰) میں غمزدہ آہ کیا کروں گا | بن آئی اجل ہی مر رہوں گا
(۶۱) کاری ہے خدنگ عشق پرشور | خوننابہ کرے ہے جسم (ن) پر زور
(۶۲) اس خستہ کي آہ کیا کہوں بات | یہ تھااوسي گفتگو میں بس (ن) رات
(۶۳) جو اتنے میں مرغ صبح بولا | سورج نے در فلک کو کھولا
(۶۴) ہوئی روز کی روشنی نمایاں | رخصت لگے ہونے شب کے مہمان
(۶۵) تا چاشت وہ مہمان خانہ | باہم ہوئے پیش و پس روانہ
(۶۶) آیا جو میانہ اوس پری کا | تھا کشتہ یہ جس کی کافری کا
(۶۷) جوں اوس میں ہوئی سوار بہ شنگ | تھے اس میں اور اوس میں لاکھہ فرسنگ
(۶۸) کرکے وہ قہار (ن) اوس کو پامال | روح اوس کی گئی انھوں کے دنبال
(۶۹) لیلی کی گئی اودھر سواری | مجنوں کے لگی ادھر کٹاری
(۷۰) دل خون ہو چشم تر کو آیا | یعنے یہ فراق رنگ لایا
(۷۱) بے ساختہ چاہ کام کر گئی | کیا جانئے جی پہ کیا گزر گئی
(۷۲) بال اوس نے بڑھائے اپنے سر کے | درہم ہوئے لوگ دیکھہ گھر کے
(۷۳) ناخن بھی گئے سب اوس نے ناشی | سودے میں برائے دل خراشی
(۷۴) فوج غم اوس پہ جو پڑی ٹوٹ | کھانا پینا بھی سب گیا چھوٹ
(۷۵) کھائے تن زار نے زبس پیچ | جوں موئے کمر وہ رہ گیا ہیچ
(۷۶) جان ہونٹوں پہ آئی اوس کی سو بار | پر اوس سے کیا نہ اس نے انکار
(۷۷) دیکھے شب و روز عشق کے جور | ایک سال بسر کیا اسی طور
(۷۸) اس حال سے تھی وہ بی بی آگاہ | لے گئی یہ فسانہ پیش آ نماہ

---

(۶۱) ن خ چشم   (۶۲) ن خ اوس   (۶۸) ن خ کہار

(۷۹) کاے رشک پری ہے ایک نوزاد — ہمسر مجنون قیس و فرہاد
(۸۰) مہمانی کے روز تجھہ کو اوس نے — دیکھا تھا محافہ سے اوترتے
(۸۱) اوس دن سے ہوا ہے وہ بد احوال — دو دو انگل کے سر پہ ہیں بال
(۸۲) لب خشک ہیں اور چشم تر ہے — مژگاں پہ چکیدۂ جگر ہے
(۸۳) دشوار ہوا ہے اوس کو جینا — سب بھول گیا ہے کھانا پینا
(۸۴) کچھہ اوس کو نہ تن بدن کا ہے ہوش — جامہ کا نہ پیر ہن کا ہے ہوش
(۸۵) رہتا ہے وہ دل گرفتہ غمناک — عریانی تن ہے اوس کی پوشاک
(۸۶) نہ منھہ سے کبھی کہے ہے کچھہ بات — ہے جذب کی طور اُس کے حالات
(۸۷) رہتا ہے اوسے ملال تیرا — سودا تیرا خیال تیرا
(۸۸) تھی وہ جو صنم بحسن مغرور — اور آپ کو سمجھے تھی بہت دور
(۸۹) کانو سے سنا تو گرچہ قصا — پر کچھہ نہ دیا جواب اس کا
(۹۰) خاموش رہی وہ سن یہ مذکور — پر دل نے کہا ہوا میں ناسور
(۹۱) ہوئی جا کے وہ صاحب تامل — پوشیدہ بقلعۂ تغافل
(۹۲) کچھہ دھیان نہ اوس کا دل پہ لائی — بیگانۂ طور آشنائی
(۹۳) جب اوس کی سنی تو ٹال دی بات — کچھہ اور وہیں نکال دی بات
(۹۴) دلبستۂ عیش و ناز رکھا — رسوائی سے خود کو باز رکھا
(۹۵) مقدور تلک رہی وہ خندان — گھر اوس کا رہا بہ از گلستان
(۹۶) یوں یہاں سے لکھے ہے کلک تحریر — افسانۂ عاشق جوان سیر
(۹۷) اوس کہنہ شراب کا وہ مخمور — یعنی وہ جو تھا کمال (ن) رنجور
(۹۸) جب تنگ ہوا رواق اوس پر — اور ٹوٹ پڑا فراق اوس پر
(۹۹) وہ سال دگر بھی کاٹ اسی طور — کر کر کے وداع عقل فی الفور

---

(۹۷) ن م بحال

(۱۰۰) هو وادئی عشق میں پیاده　　مجنوں سے قدم رکھا زیاده

(۱۰۱) هجراں کی جو دیکھی محنت شاق　　تن سوکھ کر اوس کا هوگیا تاق

(۱۰۲) آنکھیں یرقان گرفته هوگئیں　　پلکیں اوسے خون میں ڈوبو گئیں

(۱۰۳) چهرے په جو رنگ زعفراں تها　　لب خنده میں ابهی (ن) وه جواں تها

(۱۰۴) تها کلفت دل سے جو مکدر　　خاک اوڑتی تهی بهیگتی مسوں پر

(۱۰۵) وه طاقت زور نوجوانی　　تها مصرف چرخ ناتوانی

(۱۰۶) بالوں نے کیا اوسے نهه مو　　تن جیسے بتاب شاخ آهو

(۱۰۷) آنکهیں بهیں سنه په دجله هوکر　　پهر رونے لگا اوتها جو سو کر

(۱۰۸) سونا تو نصیب میں کهاں تها　　ایک خواب غشی کا وه سماں تها

(۱۰۹) دن رات اوسے نصیبوں سے جنگ　　ایک کوچه ره هزار (ن) نوسنگ

(۱۱۰) رنگ اوس کا بهار میں زردی　　حال اوس کے سے جلوهٔ فقیری

(۱۱۱) کپڑے سو وه تیلیا بدن میں　　جیتا هے اجل کے وه دهن میں

(۱۱۲) سو پرده میں یهاں وه رشک خورشید　　یهاں ایک جهلک تلک یه نومید

(۱۱۳) تنهائی میں پاس اوس کے غمخوار　　پاس اوس کے نه غیر چار دیوار

(۱۱۴) اس عرصه میں وه زن وفادار　　آئی گئی درمیان میں سو بار

(۱۱۵) جب خوب یه سوکهکر هوا زار　　گو یمده کهے هے آخر کار

(۱۱۶) با وصف غرور کبر یائی　　اس کی بهی طبیعت ایدهر آئی

(۱۱۷) گهروالوں سے اپنے بیٹهه کر دور　　سننے لگی جیسے اس کا مذکور

(۱۱۸) پایا جو مزاج نازایدهر (ن) کو　　وه زن هوئی اوس سے یوں سخن گو

(۱۱۹) کاے حور نژاد هے وه مهجور　　دوری سے تری کمال رنجور

---

(۱۰۳) ن خ آپهی　　(۱۰۹) ن خ ره و هزار　　(۱۱۸) ن خ اودهر

(۱۲۰) آزردۂ رنج شاق ہے وہ | مدقوق تپ فراق ہے وہ
(۱۲۱) مشتاق نظر وہ جاں بلب ہے | دیدار کی اوس کو بس طلب ہے
(۱۲۲) تب اوس نے کہا یہ بھر دم سرد | میں کیا کروں زن ہوں وہ تو ہے مرد
(۱۲۳) زن پر اگر آے مرد کا دل | پھر کیا کوئی ہو جو پاے در گل
(۱۲۴) افتادہ میان چار دیوار | تم جانتی ہو کہ ہوں میں لاچار
(۱۲۵) ہوں لاکھہ قفس میں اک تو محبوس | اس پر مانع ہے پاس ناموس
(۱۲۶) دن رات ہے اتنی قید مجھہ پر | رکھہ سکتی نہیں میں پاوں بر در (ن)
(۱۲۷) روزن ہے جو گھر کا دیدباں ہے | نظارہ کی جا کہو کہاں ہے
(۱۲۸) ناموس سے سہل تھا گذرنا | مجھہ کو تو پڑا ہے غم میں مرنا
(۱۲۹) چارہ نہیں کچھہ مگر کہ اس سال | ایک شادی ہے گھر میں میرے فی الحال
(۱۳۰) آویں گی قبیلہ کی زناں سب | یعنی مرے رت جگا ہے اس شب
(۱۳۱) پہنا کے اوسے زنانی پوشاک | اور ڈال کے چشم فتنہ میں خاک
(۱۳۲) بھجواونگی یہاں سے میں میانا | ساتھہ اپنے سوار کر لے آنا
(۱۳۳) ٹھہرا جو مدار وصل اس طور | جب آئی وہ رات اس نے فی الفور
(۱۳۴) پوشاک زنانی اور زیور | بھجوا دئیے اوس کو خوان میں دھر
(۱۳۵) جوڑا وہ برنگ زعفرانی | ہو دیکھہ جسے پری دیوانی
(۱۳۶) کمخواب کی وہ ازار گلبدن | تارے کرتے تھے جس کو اسپند
(۱۳۷) معجر وہ برنگ لالہ تر | دیکھا کرے جس کو چشم اختر

---

(۱۲۶) ن خ در پر
ن ع میں شعر نمبر ۱۳۶ کے بعد یہ شعر ہے جو میرے نسخے میں نہیں -
" تسپر وہ ازار بند زریں | جوں دامن کہکشاں میں پرویں "

(۱۳۸) پھر تسپہ وہ سینہ بندگل دروز | جو دل سے فرشتہ کے چلے سوز

(۱۳۹) پھر نہمتنہ وہ دام بابل | کاڑھے ہوے جس میں سیکڑوں گل

(۱۴۰) پھر کفش وہ رشک ماہ و خورشید | ہم پنجہ بتاج فرق جمشید

(۱۴۱) جب گھر میں میں نجی کے یہ پوشاک | آئی ہوئی (ن) دیکھکر (ن) طرب ناک

(۱۴۲) اوس زن نے کہ تھی وہ محرم کار | اور رہتی تھی ہر دم اوسکی غم خوار

(۱۴۳) کنگھی چوٹی کر اوس جوان کی | دی وضع نکال سب زنان کی

(۱۴۴) پوشاک جو اوسکو وہ پہنائی | حورا کے تئیں پری دیکھائی

(۱۴۵) زیور سے کیا جو پھر تزئیں | پڑنے لگی اوسپہ چشم پرویں

(۱۴۶) انکھونمیں دیا یہ وہ اس کے کا جل | جو دیکھے کے اسکو شب گئی جل

(۱۴۷) چوٹی گوندھی وہ بوریا بات | چون مار سیاہ ہو پس قات

(۱۴۸) رکھا وہ ذقن پہ خال میکوں | جو چشم فرشتہ جس سے پر خوں

(۱۴۹) از بس جعلی نہ تھے جو وہ بال | تھی مانگ کی اوس کی تھیک تمثال (ن)

(۱۵۰) سینہ پہ وہ چھاتیاں چکئی سی | تویں تعبیہ کی ہوی روئی کی

(۱۵۱) اون پر وہ مصالحہ (ن) دار انگیا | جلسے عجب ایک بناؤ پیدا

(۱۵۲) پوروںپہ وہ خندقیں بنائیں | جو حور و پری کے جی کو بھائیں

(۱۵۳) وھاں وہ تو دو کوی بال طاؤس | پھار مد نگاہ دست افسوس

(۱۵۴) القصہ بناو اوس کا کر خوب | ہوتا ہے جو بانکی زن کو مطلوب

(۱۵۵) اوس رشک پری کے جب وہ آئی | ایک حور پری کی گھر میں لائی

(۱۵۶) الفت نے جو اوسکی جوش مارا | وھاں سب سے جدا اوسے اتارا

---

(۱۴۱) ن خ ہوا – ن خ دیکھہ وہ

(۱۴۹) ن خ میں شعر نمبر ۱۴۹ کے بعد شعر نمبر ۱۵۲ ہے – ن خ میں شعر ۱۵۲ حاشیہ پر درج ہے – غالباً نسخہ خ کی ترتیب صحیح ہے —

(۱۵۱) ن خ مسالہ

(۱۵۷) ایک حجرہ نفیس وفرش معقول قالیں پہ هزار رنگ کے پھول
(۱۵۸) وہ چاندنی اوسپہ رنگ مہتاب هو آئینہ جسکو (ن) دیکھہ سیماب
(۱۵۹) ایک گوشہ بچھا پلنگ سادہ گل تکیہ سرھانے دونہادہ
(۱۶۰) بے دخل کنار وبوس و آغوش ایک اوسپہ پڑا هوا پلنگ پوش
(۱۶۱) شادیہیں ایدھراودھر وہ پویان یہ تشنہ نظر نظارہ جویاں
(۱۶۲) انکھوں سے سرشک وصل جاری دل پر وهی جوش بیقراری
(۱۶۳) اوس عین خوشی میں هجر کا غم اجزاے نشاط وصل درهم
(۱۶۴) آجانا ایدھر اودھر سے اوسکا پاس اپنے فلک زدے کے تنہا
(۱۶۵) پھروهیں تھر کے ایک دودم کرنا اوسے غم کو غم میں مد غم
(۱۶۶) تھیں عمدہ زنان جو قوم کی وهاں تھکیں میں رهیں وہ اوسکی حیران
(۱۶۷) کہتی تھیں یہ بی بی هے بہت دور دیکھی نهیں همنے ایسی مغرور
(۱۶۸) نہ حجرہ سے باهر آتی هے یہ نہ همکو وهاں بلاتی هے یہ
(۱۶۹) نہ هنستی هے اور نہ بولتی هے نہ عقدۂ دل کو کھولتی هے
(۱۷۰) خجلت نے دیا هے جام اس کو همدم سے هے اپنے کام اسکو
(۱۷۱) کرتی نهیں یہ گھملتی اسپر هم پاس بھی هے لباس و زیور
(۱۷۲) هر ایک کو جواب دے وہ عیار آئی دل شب ادھر بیکبار
(۱۷۳) چوسر کی دو بازی کھیلیں اوس سات بس اس هی میں کی سوکی کوئی یہ بات
(۱۷۴) تہا وصل سے بس کہ وہ نراسا اولٹا پڑتا تھا اوسکا پاسا
(۱۷۵) وهاں عرصۂ تنگ همدمی کو یہاں هارے هوئے یہ اپنے جی کو
(۱۷۶) اس امر محال پر نظر کر اس تنگ وصال پر نظر کر
(۱۷۷) پھر اوٹھہ گئی وهاں سے دے تسلی مجنوں نے کیا وداع لیلی

(۱۵۸) ن خ شکل

(۱۷۸) پھر اس کا کلیجہ منہ کو آیا — خون جگری نے جوش کھایا

(۱۷۹) آنکھوں سے گرے وہ اشک خونیں — جو اون سے ہوا بساط رنگین

(۱۸۰) اتنے میں پیام روز آیا — منہہ صبح وداع نے دیکھایا

(۱۸۱) زایل ہوئی وہ سیاہیٔ شب — تاریک ہوا وہ نور کوکب

(۱۸۲) انجم چھپے آفتاب نکلا — رخصت کا پڑا جو گھر میں غوغا

(۱۸۳) پہلے کر اوسی جواں کو رخصت — اوس نے بھی کیا وداع طاقت

(۱۸۴) ہو بازی چرخ سے مشوش — آپھی وہ جلی مثال آتش

(۱۸۵) بدنامی کا لاکے دل میں وسواس — ناموس کا اپنے یوں رکھا پاس

(۱۸۶) بعد اوس کے زنان قوم ساری — رخصت ہوئیں اوس سے باری باری

(۱۸۷) آشوب جو شب کا تھا ہوا کم — وہ رہ گئی اور گھر کے محرم

(۱۸۸) کر یاد وصال دوست روئی — محرم اوس کا ولے نہ کوئی

(۱۸۹) وہاں جو گیا تھا بادل زار — بستر پہ کراہی ہوکے بیمار

(۱۹۰) آئی جو ہوائے اُنس اوسے راس — بھجوانے لگی اصیل اوس پاس

(۱۹۱) پردہ وہ حجاب کا ہوا دور — موصول ہوے یہ دونو مہجور

(۱۹۲) کہتے ہیں رہا وہ خستہ و زار — اوس سوچ میں نو مہینے بیمار

(۱۹۳) آخر کو گذر گیا جہاں سے — دھو بیٹھا ہی ہاتھہ اپنی جاں سے

(۱۹۴) بے شربت وصل یار جانی — ہوئی اوس کو جو تلخ زندگانی

(۱۹۵) ٹوٹا جو یہ کوہ ہجر اوس پر — صحرائے فراق میں گیا مر

(۱۹۶) پرسش کو اجل جو اوس کے آئی — ماں اوس کی نے سر پہ خاک اوڑائی

(۱۹۷) اوس گھر سے اوٹھی نوائے ماتم — گھر ہوگیا اوس کا خانۂ غم

(۱۹۸) یعنی بفراق روئے دلدار — دنیا سے گیا وہ عاشق زار

(۱۹۹) ہمسایئہو یار اور برادر — آئے جو یہ مرگ تازہ سنکر

(۲۰۰) جوں ابر بہار زار روئے آہستہ (ن) نہ بل پکار روئے

(۲۰۱) ایک یار نے وہاں پچھاڑ کھائی دندان زدہ اک نے کی کلائی

(۲۰۲) سر پیٹ کر ایک غش میں آیا ایک سینہ زنی کا سانگ لا یا

(۲۰۳) ایک خستہ نے پیرھن کیا چاک ایک روتے نے سر پہ ڈال لی خاک

(۲۰۴) جب آہ و فغاں ہوی فلک رس آ صبر نے یوں کہا کہ بس بس

(۲۰۵) نہلا چکے اتنے میں جو غسال پہنا کے کفن بڑی اوس کو فی الحال

(۲۰۶) پھر بوریہ پر سے جو اٹھا یا تابوت میں لاش کو لٹا یا

(۲۰۷) وارث چلے اوس کے بالال زار لے کر وہ جنازہ رو بہ بازار

(۲۰۸) تابوت پہ سبز ایک دوشالا لا کر پئے زیب و شان ڈالا

(۲۰۹) چادر پھولوں کی لہلہاتی پھٹتی تھی صبا کی جس سے چھاتی

(۲۱۰) یوں سبز دوشالہ کی تھی تزئیں جس طرح کہ آسماں پہ پرویں

(۲۱۱) تابوت کہ تختۂ چمن تھا جس تختہ پر جوش نسترن تھا

(۲۱۲) پہونچا جوقریب (ن) کوئی معشوق آئی اوسے وو ہیں بوئے معشوق

(۲۱۳) تابوت کش اورطرف (ن) روار تھے یہاں پاوں میں رسی تواماں تھے

(۲۱۴) جاتے تھے کھچے اوسی گلی کو ٹک دیکھیو جذب رفتگی کو (ن)

(۲۱۵) معشوق کا تھا جہاں در و بام سنگیں محل اوس مکاں کا تھا نام

(۲۱۶) پیش در خانۂ بت چیں جاکر کے ہوا جنازہ سنگیں

(۲۱۷) تا دیر رہا وہ ہو گراں بار حمالوں کی سر پہ بیستوں وار

---

(۲۰۰) ن خ ہوکر کھڑے داڑھیں مار وئے (۲۱۲) ن خ قریں (۲۱۳) ن خ سو

(۲۱۴) ن خ میں اس کے بعد یہ شعر ہے —

تابوت کے ساتھ نوحہ کرتے آخر سب اوسی گلی کوگذرے

(۲۱۸) از بس کہ ہجوم جزو و کل تھا — اوس واقعہ سے گلی میں غل تھا
(۲۱۹) حیران تھے نظارگیٔ بازار — بر وقفۂ مردۂ گرانبار
(۲۲۰) کھلتا ہی نہ تھا سبب کسی پر — ہنگامہ تھا ایک اوس گلی پر
(۲۲۱) ہر گھر کے نظارگی دواں تھے — مرد اور زن(ن) پیش و پس رواں تھے
(۲۲۲) پہونچی یہ خبر اوسے بھی جوہیں — کر غسل وہ رشک ماہ و پرویں
(۲۲۳) پردے پردے کے بیچ رو کر — جان اپنی سے اپنے ہاتھہ دھو کر
(۲۲۴) ہوی از رہ فرط بیقراری — آمادۂ مرگ اختیاری
(۲۲۵) لے ہاتھہ میں پیش قبض شوہر — آئی ایک بار کوٹھے اوپر
(۲۲۶) از بہر طواف کشتۂ خویش — مشتاق تھی بس کہ وہ جگر ریش
(۲۲۷) گردن کو اوٹھا کے جوہیں جھانکا — دیکھا کہ جنازہ ہے جواں کا
(۲۲۸) چلتا نہیں جا سے اڑ رہا ہے — کہرام گلی میں پڑ رہا ہے
(۲۲۹) بس دیکھتے ہی اوسے بہر اک آہ — مارا بشکم وہ دشنہ ناگاہ
(۲۳۰) تھا ہمرقہ جوئے عاشق زار — کیا ہمرقہ مل گیا ہے ایک بار
(۲۳۱) جب خون میں تر ہوا وہ خنجر — تھی رشک چمن وہ لالۂ تر
(۲۳۲) ملبوس جو اوس کا لالہ گوں تھا — بے دشنہ ہی گرچہ غرق خون تھا
(۲۳۳) پر خون نے اور تہ چڑھادی — اور آگ کو آگ سی لگادی
(۲۳۴) عمداً وہ موئی برائے عاشق — روح اوس کی گئی قفائے عاشق
(۲۳۵) تھا گرچہ لباس اوس کا گل گوں — تھی اوس سے زیادہ سرخی خون
(۲۳۶) افتادہ بخون وہ کوٹھے اوپر — خاموش زبان بریدہ خنجر

---

(۲۲۱) ن خ مرد و زن

(۲۳۷) اتنے میں کسی نے جو دیا سرار (ن) جانا که کھلی لہو کی گلزار
(۲۳۸) نا گاہ محل میں پڑ گیا غل یعنی که موئی وہ غیرت گل
(۲۳۹) دیکھا جو اوسے در آب و آتش شوہر بھی بہت ہوا مشوش
(۲۴۰) الفت کا جو راز تھا گیا کھل خم ہو گئے صد سر تا مل
(۲۴۱) یکبار اٹھا جو شور و شیون گئے پردۂ گوش اسمان چھن
(۲۴۲) تھی بام پہ غرق خون وہ گلفام خورشید ہو جیسے بر لب بام
(۲۴۳) ہمسایہ بھی رہ گئے عجب میں باقی تھا کچھ ایک وصول سب (ن) میں
(۲۴۴) ہر ایک وہاں جو پر عجب تھا دندان کے ساتھ ربط لب تھا
(۲۴۵) کہتے تھے که ان میں چاہ ہو گی مدت سے دلوں میں راہ ہو گی
(۲۴۶) دے غسل اوسے ہاتھوں ہاتھ ایکبار اوس کا بھی کیا جنازہ تیار
(۲۴۷) صندوق میں رکھے دفینۂ عشق معلوم کیا قرینۂ عشق
(۲۴۸) بازار میں اوس کو جب نکالا منھ اپنا کیا فلک نے کالا
(۲۴۹) سقوں کی جلو میں آب پاشی تابوتوں په پھر گلاب پاشی
(۲۵۰) معشوق کا تھا جنازۂ در پیش پیچھے وہ جنازۂ جگر ریش
(۲۵۱) دونوں وہ جنازے جب رواں تھے حیرت زدہ پیر اور جوان تھے
(۲۵۲) کہتے تھے یه طرفه ماجرہ ہے کیا مردہ نے زندہ کو لیا ہے
(۲۵۳) عاشق معشوق کا جو ہے سات بس آج کھلی ہے ہم په یه بات
(۲۵۴) آخر کو اونھیں به تکیۂ بھیم جا کرکے (ن) کیا بخاک تسلیم
(۲۵۵) تا شاہ رہیں وہ دونو غمناک یک چند میان خلوت خاک
(۲۵۶) یه عشق عظیم بیگ مرزا رکھتا تھا (ن) جو عشق بیگماں کا

---

(۲۳۷) ن خ خون بالاسرار (۲۴۳) ن خ هب ۴۲۵ ن خ لوتھا کے ن خ تھا کشتهٔ حسن

(۲۵۷) اک طرفہ فسانہ ہے جنوں خیز ہر حرف ہے جس کا وحشت انگیز

(۲۵۸) تھا بس کہ گمان عیب سے پاک مدت سے رہا تھا اس کو میں تاک

(۲۵۹) ماہ رمضاں کی تیرھویں شب کر نظم اسے کیا مرتب

(۲۶۰) تاریخ رقم ہوئی ہے اس کی بارہ سے سولھہ سن ہجری

(۲۶۱) کی ہے جو یہ مثنوی میں ارقام گلزار شہادت اس کا ہے نام

(۲۶۲) یہ صنعت کلک مصحفی ہے ہر حرف میں اس کے ساحری ہے

(۲۶۳) خوانندہ کو چاہیے جو ہو شاد

مجھہ کو بھی بفاتحہ کرے یاد

§ * §

اُردو کے اَن پڑھ شعرا

از

[جناب مرزا فداعلی صاحب ' خنجر ' لکھنوی]

غلامی

" غلامی تخلص - در شاهجهاں آباد بود - از قوم ارذل "

" به پیشۂ خبرداری نوکری داشت لیکن در فن شعر "

" بکمال بے خبری بسر می برد مگر طبع موزونے داشت "

" از تذکرہ میر حسن "

یہ شاعر بھی اُمی تھا اور کسی ادنیٰ طبقے سے متعلق - دھلی میں پیدا ھوا اور وھیں زندگی کے دن گذار دئے - ھرکارہ یا جاسوسی کی خدمت انجام دے کر پیٹ پالتا تھا - شاعری کا عروج اور طبیعتیں ذوق سخن سے آشنا ھورھی تھیں - سچ تو یہ ھے اُن دنوں ھوا نے ذوق پاشی کا اثر پیدا کر لیا تھا - ھندو مسلمان ' یہود و نصارا لیلائے سخن کے والہ و شیدا ھو رھے تھے - گھر گھر ھے نغمہ شعر و سخن بالمد تھا - عالموں کی کون کہے جہلا بھی طبع آزمائی میں ھم عصروں سے پیچھے نہ تھے - اگر امرا کے کاشانوں میں نور سخن جگمگاھٹ اور چکاچوندہ پیدا کر رھا تھا تو غربا کے جھونپڑوں

میں بھی آفتاب شاعری کی شعاعیں ضیا بار دکھائی دیتی تھیں - پھر غلامی کا شوق سخن جائے عجب "کیوں ہو" ؟ اُس نے بھی دور حاضرہ کے بہاؤ میں بہنا شروع کیا -- افسوس ! اِس کے حالات بالکل دریافت نہ ہوئے میر حسن نے اِس کی نسبت بہتر رائے قائم نہیں کی -- اُن کی رائے ہمارے لئے چراغ ہدایت ہے -- پھر بھی اُمی ہونے کی جہت سے اُس کی سعی و کوشش اور ذوق فطری اِس قابل ہے کہ ہم اُسے داد دیں - اِس کے نام سے صرف ایک مطلع دیکھا گیا جو نمونۂ کلام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے —

سرخ لاتی ہیں نشے بیچ جو تورے آنکھیاں
دل زخمی پہ لگاتی ہیں تکورے آنکھیاں

غمگین

میر عبداللہ نام غمگین تخلص - میر حسین تسکین کے فرزند تھے جو سرکار رام پور کے دامن دولت سے وابستہ تھے - حسن مردانہ میں یوسف وقت ولاثانی تھے - عادات و اطوار پسندیدہ - مزاج میں انکسار و تواضع بکثرت - کس و ناکس سے جھک کے ملنا اور خندہ جبینی سے پیش آنا شعار تھا - جس صحبت میں جاتے عزت سے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے -- طبیعت مرنجاں مرنج واقع ہوئی تھی - احباب کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملنے پایا - شرم و حیا کی تو گویا مجسم تصویر تھے —

حب وطن نے دہلی سے کبھی قدم نکالنے کی اجازت نہ دی -

حسین "تسکین" کا قیام رام پور میں تھا جو "غمگین" کی تعلیم علمی کے نقصان کا باعث ٹھہرا اور یہ علم کی طرف سے بالکل کورے رہ گئے لیکن شرافت خاندانی نے ہمیشہ تہذیب و شائستگی کا پابند رکھا - شاعری کا شوق بچپنے ہی سے پیدا ہوا - گویا یہ میر "تسکین" کے خون کا اثر تھا - پہلے بطور خود کہا کئے پھر اپنے والد سے مشورۂ سخن کرنے لگے - فن لطیفہ کے لئے طبیعت مناسب واقع ہوئی تھی - جو شعر نظم کے سانچے میں ڈھلتا فصاحت کی جان معلوم ہوتا - عنفوان شباب کے کیف اثر و ولولوں نے رنگینی پیدا کردی - متانت و سنجیدگی نے جا بجا نمایاں ہو کر لطف شعر کو اور بھی دوبالا کردیا - تھوڑی ہی مشق میں وہ پختگی پیدا ہو گئی جو دوسروں کو سالہا سال کی محنت میں نصیب ہوتی ہے - افسوس! زندگی نے وفا نہ کی اور یہ جواں طبیعت شاعر عالم شباب میں میر حسین "تسکین" کو غم مفارقت سے بے تسکین و غمگین کر گیا - بقول مولوی عبدالغفور خاں "نساخ" ان کا انتقال رام پور میں ہوا - واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ دہلی میں رہتے رہتے طبیعت اچاٹ ہوئی - ہم جلیسوں کی صحبت کا رنگ پھیکا پڑا - خاک رام پور نے کشش کی اور اجل راہبر بنی یعنی "غمگین" وطن (دہلی) سے نکل کر عازم رام پور ہوئے - ان کے حسن صورت و حسن سیرت نے احباب کو گرویدہ کرلیا تھا - سب کو ان کی مفارقت کا قلق ہوا - بعض بے تکلف احباب نے روکنا چاہا لیکن یہاں تو قضا دامن گیر تھی - کسی کی بات نہ سنی اور اپنے والد میر حسین "تسکین" کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو گئے - رام پور کی سکونت کو چند روز گذرے تھے کہ بیمار پڑے - غم نصیب باپ نے تا مقدور دوڑ دھوپ کی لیکن موت سے زور

نہ چلا اور غمگین با دل غم زدہ رام پور میں پیوند زمین ہوگئے - سدا جاتا ہے " غمگین " بڑے پر گو واقع ہوئے تھے - ایک دیوان غزلیات بھی جمع کر لیا تھا جو زمانہ کی نا مہری سے رواج نہ پاسکا - طراوش سخن کا اسلوب ملاحظہ ہو —

شور بختی نے مزہ زور چکھایا دل کو　　نالہ ، سو زخم جگر پر نمک افشاں نکلا

حشر میں فریاد کیا کرتا مجھے یاد آگیا　　قہر آلودہ نگھہ سے دیکھنا جلاد کا
وہ کھڑی جانگزا تھی جس کو سنکر مرگیا　　ورنہ اک تیشہ سے ہوتا کام کیا فرہاد کا

اُمت نوح پہ طوفاں ہی آیا یارو !　　شکر یہ ہے کہ مرا دیدۂ خون بار نہ تھا

ہر چند رشک ہے ، پہ بنی اب تو جان پر　　توہی صبا اُلٹ کہیں گوشہ نقاب کا

آتے زرا نہ اور تو مرہی چلے تھے ہم　　تم نے تو کہہ دیا کہ ہمیں کچھہ خبر نہیں

عدو سے کیوں ہنسے تم جو اُٹھایا اس نے طوفاں کو
بہانا ہوگیا رونے کا مہری چشم گریاں کو

کمی کریں جگر و دل تو کیا کروں یارب !　　کچھہ اور دے مجھے مژگان خون فشاں کے لئے

اب آ - یو نہیں مرے سینے سے لگ جا　　گرہ وا ہو چکی بند قبا کی

چاھئے تھا مرے مرنے کا بہانا دل کو تم چلے روٹھہ کے ، اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

کی مری مٹی عزیزوں نے خراب ھائے ! لاکر خانۂ خمار سے

فصاد

نہو نام فصاد تخلص تھا - ایک حجام تھا جس کی زندگی کا آغاز و انجام دھلی میں ھوا - شاہ نصیر کا زمانہ پایا تھا - اکثر اُن کی خدمت میں حاضر رھتا - شاہ نصیر کے گرداگرد صد ھا شاگردوں کا ھجوم رھتا - ھر وقت شعر و شاعری کا چرچا ھوا کرتا - کوئی نؤ تصنیف غزل سناتا ، کوئی شعرائے وقت کے چیدہ چیدہ اشعار پڑھتا اور شاہ نصیر اُن منتخبات سے ھر ایک کی طبیعت اور ذوق سخن کا اندازہ کرتے - اِس صحبت میں فصاد کو بھی بیشتر نکات شعری سننے کا موقع ملتا اور اکثر باتیں حافظے میں محفوظ ھوتی جاتیں - آخر صحبت شعرا رنگ لائے بغیر نہ رھی - دل میں گدگدی شروع ھوئی - جذبات و حسیات ھمکے اور فصاد نے شعر گوئی کا آغاز کیا - پیشے کی مناسبت سے فصاد تخلص اختیار کیا - اِس فن لطیف کے لئے طبیعت بالکل ھی نا مناسب واقع ھوئی تھی اُس پر بے علمی المضاعف - بہت کچھہ زور لگائے لیکن ذوق صحیح نہ پیدا ھونا تھا نہ ھوا - اس کی شاعری کا زیادہ تر حصہ تک بندی اور مہملات پر دلالت کرتا ھے - اُستاد کی اصلاح سے جو اشعار درست ھو گئے ھیں اُن میں بھی تخیل کی پستی نے پھیکا پن پیدا کر دیا ھے - نمونتاً ایک شعر

درج تذکرہ ہوتا ہے —

بادہ کے ہمیں پینے سے کیا کام ہے ساقی مئے خون جگر، آبلہ ہے جام ہمارا

فضل

فضل مولا خاں نام فضل تخلص — وحید العصر افضل الشعرا خطاب ہے جو ایک مدحیہ قصیدے کے صلے میں حضرت ظل سبحانی ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی المتخلص بہ " شعاع " بن شاہ عالم ثانی " آفتاب " کے دربار فیض آثار سے حاصل کیا تھا - ان کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں کھیل کود کر بچپنے کا زمانہ بسر کیا ارر جوان ہوئے - ان غریب کے خاندان پر اوائل سے کچھ ایسی مصیبتیں نازل ہوئیں کہ یہ لکھ پڑھ نہ سکے - مگر نہایت خلیق و متواضع - پابند وضع اور بھی خواہ خاص و عام واقع ہوئے تھے - کبھی کسی کی برائی مد نظر نہ ہوتی - دوسروں کی امداد و استعانت کے واسطے درمے، قدمے، سخنے موجود رہتے - آفریں عالم کی بارگاہ سے کمال حسن صورت و وجاہت پائی تھی اُس پر جامہ زیبی بلا کی تھی - ہر وضع و ہر لباس غضب کا کھلتا - گویا میر عبدالحیء " تاباں " کی طرح ان کا حسن و جمال بھی مشہور آفاق تھا - ان خوبیوں اور اوصاف کے ساتھ ساتھ مغروالمزاجی کا عیب بھی موجود تھا - ذرا ذرا سی بات میں روٹھ جانا اور غصہ کرنا تو کوئی بات ہي نہ تھی - اپنی ذات کو اول ترین ذات تصور کرتے اور دوسروں سے فخر و مباہات کا اظہار ہوتا - اس نقص نے بیچارے کو ساری عمر

چین نہ لینے دیا - جہاں گئے وہاں والوں سے ان بن رہی اور ایک جگھہ اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا —

انھیں بارہ برس کے سن سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا تھا - اس فن کے لئے دل و دماغ بھی مناسب و موزوں ودیعت ہوا تھا - شعر کہتے اور خوب کہتے تھے - اس فن میں کسی مقامی شاعر کے شاگرد تھے - بہر نوع فضل ان پڑھ شاعر تھے اور اپنے ہم جنس شعرا میں پایہ امتیاز رکھتے تھے - جس طرح اور ان پڑھ شعرا حافظے کے تیز اور زود گو ہوتے ہیں ان میں یہ وصف نہ تھا - کم کم شعر گوئی کا اتفاق ہوتا - جو کچھہ کہتے کسی سے لکھوا لیتے - بعض اوقات ایسے وقت طبیعت حاضر ہوتی جب کوئی لکھنے والا نہ ہوتا تو اشعار حافظے سے اُتر جاتے - ان موقعوں پر ان کی جہلاہت دیکھنے کے قابل ہوتی - ان میں فصاحت کا عنصر بہت کافی تھا - جب باتوں کا لچھا باندھتے تو سننے والے الف لیلہ کی دل چسپ کہانیوں کو بھول جاتے - جس صحبت میں جاتے عزت کے ہاتھوں لئے جاتے - کبھی کبھی طبیعت داری اور مزاج کی شوخی بد اخلاقی کا موجب ہو جاتی اور یہ دوسروں کے چیدہ اشعار بطور تفریح اپنے نام سے پڑھ دیا کرتے —

یہی وجہ ہے کہ تذکرہ نویسوں نے بالاتفاق ان کے اس عیب کو مشتہر کیا ہے —

انھوں نے ایک مرتبہ فکر معاش سے تنگ آکر لکھنؤ کو خیر باد کہا اور سامان سفر سے آراستہ ہوکر " دہلی " کا عزم کیا اُن دنوں شاہان مغلیہ کی حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا - ملک پر انگریزوں کا قبضہ تھا لیکن اوونگ حکمرانی پر ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی برائے نام جلوہ گستر

تھے - قلعہ کے باہر ایسٹ انڈیا کی حکومت اور قلعہ کے اندر بادشاہت کا دور دورا تھا - قدامت پرستی کے اُصول پر معمولاً دربار آراستہ ہوتا ' اراکین جمع ہوتے ' احکام نافذ اور انعامات و خطابات کی تقسیم ہوتی -

اکبر شاہ ثانی کو شاعری کا اتنا شوق تو نہ تھا جو اُن کے والد شاہ عالم ثانی " آفتاب " یا اُن کے خلف دوم بہادر شاہ " ظفر " کو تھا لیکن دستور قدیم کے موافق شاعروں کی قدردانی و حوصلہ افزائی فرماتے - گاہ بگاہ خود بھی مینائے سخن کا جام نوش کرتے - مقطع میں اپنا تخلص " شعاع " جو آفتاب کی مناسبت سے ہے نظم کرتے - اس فن میں فخرالشعرا میر نظام الدین ممنون کو شرف اصلاح عنایت ہوا تھا - شعرائے وقت میں شاہ نصیرالدین ' نصیر ' غالب علی خاں ' سید ' آشفتہ وغیرہم درباری شاعر تھے - اسی زمانے میں فضل بھی وارد دھلی ہوئے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ موزوں کرلیا تھا ' کوشش کرکے دربار میں رسائی پیدا کی - اگرچہ وھاں بھی بعض ان پڑہ شاعر موجود تھے لیکن ان کی شاعری اس حد پر نہ تھی جو فضل کے مقابلے میں لائی جاتی - ھر شاعر کو ان کی بے علمی اور پختہ کلامی پر تعجب تھا - خصوصاً دربار میں جب قصیدہ پڑھا تو لوگ حیرت زدہ ہوگئے ! شاہ اکبر نے ان کا کلام بے حد پسند کیا - قصیدے کے صلے میں خلعت فاخرہ اور وحیدالعصر افضل‌الشعرا خطاب عطا کرکے امتیاز و اعزاز بخشا - اس روز سے فضل بھی شعرائے دربار کے زمرے میں داخل ہوکر وظیفہ خوار ہوگئے لیکن وھی نقص لاف زنی جس کا مذکور ہوچکا ھے باعث بے لطفی ھوا - شعرائے دھلی نے ان کی باتوں کو نا پسند کیا اور آپس میں نزاع پیدا ہوئی جس کا خاتمہ فضل کے اخراج پر ھوا اور انھیں چار و ناچار ملازمت ترک

کرکے مرشدآباد کا طول و طویل سفر اختیار کرنا پڑا جہاں دھلی سے زیادہ قدر و منزلت ھوی - نواب ناظم نے فوراً خلعت و انعام دے کر درباری شعرا میں شامل کرلیا اور رفتہ رفتہ مصاحب خاص ھونے کی عزت حاصل ھوگئی - اطمینان ھوتے ھی انھیں زمین شعر میں مضامین تازہ بتازہ کے باغ لگانے کا کافی موقع ھاتھہ لگا - ھر عید بقر عید میں قصائد کا صلہ پاتے اور سرکار نظامت کے عروج و ترقی کے لئے دست بہ دعا رھتے —

اس زمانے میں جانعالم 'اختر' مٹیا برج (کلکتہ) میں مقیم تھے - بیس ھزار سے زیادہ نمک خوار دامن دولت سے وابستہ تھے - برق' بحر' قلق' اسیر' یاور اور صدھا شعرا کا مجمع تھا - شاھزادوں کے یہاں مشاعرے منعقد ھوتے' شعر و سخن کا چرچا رھتا - مولوی عبدالغفور خاں 'نساخ' بھی کلکتے ھی میں موجود تھے - فضل بھی گئے اور شعرا کے گروہ میں شعر خوانی کرکے داد کلام حاصل کی - وھاں کے اساتذہ سے صحبتیں رھیں بڑے بڑے معرکہ خیز مشاعروں میں شریک ھوئے - مولوی عبدالغفور خاں 'نساخ' سے بھی مراسم دوستانہ پیدا کئے - جب تک کلکتے میں قیام رھا شعر و شاعری کا چرچا رھا - افسوس! اس ان پڑھ و خطاب یافتہ شاعر نے عین عالم شباب میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر عالم ھستی کو وداع کیا - اس سے زیادہ افسوس کے قابل یہ امر ھے کہ ایسے طبیعت دار شاعر کا کلام بھی دستبرد زمانہ سے تلف ھو گیا اور آج اس کی یاد تازہ کرنے کے لئے بجز ان چند بیتوں کے کچھہ نہیں جو ناظرین تذکرہ کی ضیافت طبع کے واسطے درج تذکرہ ھوتی ھیں —

کبھی تو چشم عنایت حضور کی ھوگی   کبھی تو ھم بھی نکالیں گے حوصلہ دل کا

اے 'فضل'! خاک قبر بھی برباد ہو چکی — نکلا نہ اس کے دل سے ابھی تک غبار حیف

اودی و مسی اس کی، کہ مینے پہ حرف ہے — لب وہ، کہ لعل کے بھی نگینے پہ حرف ہے

دل خیال زلف سے اس کی زبس رنجور ہے — صبح محشر بھی مجھے شام شب دیجور ہے

جس جگہ جا بیٹھتا، ناصح کو کچھ کہنا ضرور — کیا کرے عادت سے وہ بیچارہ خود مجبور ہے

چارہ گر کس کو نکالے، کس کو چھوڑے کیا کرے
ہر دہان زخم میں سوفار اک مستور ہے

ترکوں کی اسلامی خدمات

(ایک خطبہ جو جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد میں پڑھا گیا)

نوشتہ ڈاکٹر جولیس جرمانس

مترجمہ

مولوی سید وہاج الدین صاحب ' لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد

(ڈاکٹر جولیس جرمانس بڈاپسٹ یونیورسٹی میں علوم اسلامی کے پروفیسر ہیں - کچھ عرصہ ہوا ریاست حیدر آباد دکن کی طرف سے سر رابندر ناتھ ٹیگور کی درخواست پر ان کی یونیورسٹی شانتی نیکیتن میں اسلامیات کی ایک پروفیسری قائم کی گئی تھی - ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمات تین سال کے لئے سر رابندر ناتھ ٹھکور نے اپنی یونیورسٹی کے لئیے مستعار لیں - ڈاکٹر صاحب ترکی اور عربی زبانوں کے عالم اور اسلامی تہذیب و شائستگی اور مذہب کے ماہر دلدادہ ہیں - بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اچھے خاصے مسلمان ہیں - جامعۂ عثمانیہ کی درخواست پر انھوں نے تین توسیعی لکچر حیدرآباد میں دئے جو نہایت پسند کئے گئے اور بڑے شوق سے سنے گئے پہلے لکچر کو جس کا ترجمہ اس وقت شائع کیا جارہا ہے اگرچہ بظاہر رسالہ "اردو" کے مقاصد سے کوئی تعلق نہیں لیکن کسی قوم کی زبان و ادب کو بخوبی سمجھنے کے لئے اس کی نسلی حقیقت اور اس کے تمدن و تہذیب اور مذہب کا جاننا ضروری ہے - گویا یہ لکچر مقدمہ ہے آیندہ دو لکچروں کا جو ترکی زبان و ادب کے متعلق ہیں —

پروفیسر صاحب موصوف کی نظر اس مبحث میں بہت وسیع

اور قائم ہے اور انھوں نے ترکوں کے تمدن اور ان کی زبان و ادب کی کیفیت اس دلآویزی اور جامعیت کے ساتھہ بیان فرمائی ہے کہ متعدد کتابوں کے پڑھنے کے بعد بھی یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی ۔ یہ گویا ڈاکٹر صاحب کے وسیع مطالعہ اور ایک مدت کے غور و خوض کا نچوڑ ہیں —

ہم ڈاکٹر جرمانس کے نہایت ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنی خاص عنایت سے ان لکچروں کا ترجمہ " اردو " میں شایع کرنے کی اجازت دی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ " اردو " کے ناظرین انھیں بڑے شوق اور غور سے مطالعہ فرمائیں گے اور ان معلومات سے مستفید ہونگے جو انھیں اردو میں تو کیا کسی دوسری زبان میں بھی اس طرح یکجا نہیں ملیں گی —

ان لکچروں کے عمدہ ترجمے کے لئے ناظرین کو مولوی سید وہاج الدین صاحب بی اے بی ٹی کا شکر گزار ہونا چاہئے جو ایسے وقت پر اکثر ہمارے کام آتے ہیں — [اڈیٹر اردو]

وسط ایشیا کا بے آب وگیاہ کوہستان جو ہمیشہ سے خانہ بدوش اقوام کی جولان گاہ رہا ہے ، غالباً ان نسلوں کا بھی اصلی وطن ہے جنھیں اگرچہ ہم عام طور پر 'ترک' کہتے ہیں ، لیکن جو نسلی خد و خال اور عادات زندگی نیز اشتراک زبان کے اعتبار سے منگولوں سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں ، ان ترکوں کی تاریخ تحریری دستاویزات سے بھی قدیم تر ہے - اور انسانیاتی (Anthropological) اور لسانیاتی (Linguistic) حیثیت سے نسلوں کی جو تقسیم اور درجہ بندی کی گئی ہے ، اس سے بھی بہت پہلے ان کا اثر ایشیا کی تاریخ میں نظر آتا ہے ۔ چینی زبان کے تاریخی وقائع میں ، ہیں ان کا ذکر سنہ ۱۲۰۰ قبل مسیح

میں ملتا ہے ' اور دوسری صدی قبل مسیح ہی میں ہمیں ان کے گروہ چین کی شمالی سرحد پر تاخت و تاراج کرتے نظر آتے ہیں 'جو گویا ان کی آیندہ تاریخ کا پیش خیمہ تھا - یہ " ہیونگ نو " (Hiung – Nu) ' جو غالباً آگے چل کر از منہ وسطیٰ میں ہن (Huns) کہلائے ' اور " یوئی یو ئن " (Yuen Yuen) جو غالباً بعد میں " اوار " (Avar) اور تو کیو (Tu-kiu) کے ناموں سے معروف ہوئے ' جنگجو قبیلے تھے ' جو آپس میں متحد ہو کر کسی طاقتور سردار کی ماتحتی میں ' بیگانوں اور یگانوں دونوں کے خلاف لوٹ مار کیا کرتے تھے - اس زمانہ میں ان کے گروہوں میں کسی طرح کا قومی یا نسلی احساس موجود نہ تھا ' بلکہ ان من چلوں کی صفوں میں اکثر غیر ترکی عناصر بھی موجود رہا کرتے تھے ' اور ان کے دوش بدوش لڑتے تھے - چونکہ پاستانیوں کی طرح سے از منہ وسطیٰ کے باشندوں کے کان بھی باریک لسانیاتی فرقوں سے آشنا نہ تھے ' بلکہ وہ صرف دوسروں کے مسلک زندگی اور عادات و خصائل ہی پر توجہ کرتے اور انھی کی بنا پر ان کے نام مقرر کرتے تھے ' اس لئے ' بجائے اس کے کہ وہ لسانیاتی نقطہ نگاہ سے ان قبیلوں کا کوئی نام تجویز کرتے ' انھوں نے انھیں " سی تھی ین " (Scythians) یا " ہیونگ - نو " (Huing - nu) یا " ترک " کہا - ان قبائل کی کوئی مشترک زبان نہ تھی - " یورالی " (Uralian) " ایرانی " " منگولی " تینوں زبانیں ان کے جرگوں میں بولی جاتی تھیں - لیکن ان کی داخلی تنظیم ' اور ان کا ابتدائی مسلک آتش پرستی جس نے رفتہ رفتہ " شامانیت * (Shamanism) " بدہ مت "

---

* ایک مذہبی فرقہ ہے ' جس میں سحر پرستی اور ارواح پرستی کی جاتی ہے ' یہ اب بھی وسطی اور مغربی ایشیا کے بعض حصوں میں پایا جاتا ہے - شامان روح اعلی ہے ' جس کے تابع دوسری ارواح خبیثہ ہوتی ہیں ۱۲ - مترجم

اور بعد کو " مسیحیت " اور اسلام کی شکل اختیار کی ' علاوہ بریں ان کی نسلوں میں نئے خون کی آمیزش اور پھر ان کی مخصوص خانہ بدوشی کی زندگی - یہ سب باتیں ان میں اور ایرانی آباد کاروں ' چین کے چاول بونے والوں ' ھندوؤں ' اور یورپ کے مسیحی آریاؤں کے درمیان مابہ الامتیاز تھیں - ان کی اس داخلی تنظیم کو ' جس کا مرکز ایک ایسا سردار ھوتا تھا جو اپنے ماتحت متعدد قبائل پر مطلق العنانی کے ساتھہ حکومت کرتا تھا ' اور جس کی معاشی اور سیاسی حیثیت صرف یہ تھی کہ یہ لوگ زرخیز خطوں کی رعایا پر تصرف اور غلبہ حاصل کرکے انھیں تو صنعت و حرفت کے پر سکون مشاغل سپرد کر دیتے تھے اور خود اپنی توجہ تمامتر انتظامی امور پر مبذول کرتے تھے ' ھم تورانی تنظیم کہہ سکتے ھیں - واضح رھے کہ یہ لفظ تورانی کسی لسانیاتی مفہوم پر دلالت نہیں کرتا ' اس لئے کہ اس اصطلاح میں اکثر یورل الطائی (Ural - Altain) اور آرین باشندے بھی داخل تھے ' بلکہ ایرانیوں ' اور ان مستقل زندگی بسر کرنے والے شہری باشندوں کے بالمقابل جو اپنا ایک الگ مسلک ' اپنی علیحدہ دینیات اور اپنی ایک مخصوص معاشرتی تنظیم رکھتے تھے ' تورانیوں کی اصطلاح ان خانہ بدوش جرگوں پر حاوی ھے جو ھمیشہ ایک مرکز پر مجتمع ھوتے ' پھر بکھرتے ' پھر جمع ھوتے رھتے تھے ' اور جن کا اپنا کوئی خاص تمدن نہ تھا ' بلکہ جن باشندوں سے ان کا سابقہ رھتا تھا ان کے اجزاے تمدن کا ایک خاصہ معجون مرکب تھا - حکمران طبقہ کی زبان عموماً ترکی ھوتی تھی - گمان غالب یہ ھے کہ اتھلا * (Attila)

---

* ھنوں کی جماعت کا سردار ' پانچویں صدی عیسوی میں گزرا ھے ' یہ لوٹ مار کرتا ھوا جرمنی اور فرانس تک پہونچ گیا تھا - ۱۲ - مترجم

بیان (Bayan) ' بلکہ شاید چنگیز خان کی مادری زبان بھی ترکی ھی تھی - اس کا ایک ثبوت یہ ھے کہ ان کے تمدن کے جو چند تحریری آثار آج تک موجود ھیں ' مثلاً وی اینا (Vienna) کے عجائب خانہ میں ' اٹیلا ' کے سونے کے ظروف وغیرہ ' ان پر ترکی کتبے موجود ھیں ' اس کے علاوہ ' " اور خان " (Orkhan) اور ' ینی سی ' (Yenisey) کے کتبوں کی زبان بھی ترکی ھی ھے —

اپنی اسی حد درجہ بے چین اور سیال معاشرت ھی کی بدولت تورانی حدود چین سے لیکر مشرقی یورپ تک دھاوے مارتے رھتے تھے ' اور چونکہ اثر قبولیت بھی ان کی معاشرتی خصوصیت خاصہ تھی ' اس لئے انھوں نے تمام تمدنوں کا رنگ قبول کیا - نسطوری مسیحیت اور ایرانی مجوسیت کو چین تک پہونچانے والے یہی لوگ تھے ' خشکی کے راستہ چین اور ھندوستان کے درمیان آمد ورفت کا سلسلہ بھی انھی کی بدولت قائم ھوا ' اور آگے چل کر سر زمین یورپ میں اسلام کا بیج بونے والے بھی یہی ھوے —

ولادت مبارک آنحضرت صلعم کے زمانے میں یہ لوگ ' بازنطین ' (Byzantium) کو ' چین ' کے ریشم کی بر آمد کیا کرتے تھے ' اور اسی تجارت کی وجہ سے ان میں اور ایرانیوں میں تصادم ھوا ' انھوں نے ' بازنطین ' اور ' حبش ' کے ساتھہ سمجھوتا کرلیا - کتنی حیرت انگیز بات ھے کہ ' جاپان ' کے قدیم ترین بودھہ مت کے مندر میں ایرانی اشیاء موجود ھیں ' جنھیں ایشیاء پار لانے والے یقیناً یہی ترکی کاروان ھوں گے —

تورانیوں کی ریاستوں کی بنیاد ھمیشہ شخصی نفوذ اور سطوت پر ھوا کرتی تھی - چونکہ ان کے گروھوں میں دو براعظموں کے باشندے داخل تھے ' اس لئے انھوں نے کبھی بھی کوئی قومی شکل اختیار نہیں کی - لیکن اگر

کوئی الوالعزم شخصیت نظر آجاتی تو اس کی اطاعت یہ لوگ دل و جان سے کرتے ' اس کی ماتحتی میں ایک مرکز پر جمع ہوجاتے - اور ایک جری ' اور جوان ' اصول حرب کی ماہر ہستی کا خیمہ ہی سلطنتوں کا محور بن جاتا - ترک اطاعت اور قیادت دونوں کے گروں سے بخوبی واقف تھے ' اور ایک باعزیمت ہستی کی کشش بات کی بات میں لاکھوں ترکوں کو مطیع اور فرمابردار بنادیتی تھی - تورانی سلطنت کے انمل بے جوڑ عناصر کی شیرازہ بندی کرنے والی ہمیشہ کسی ایسے ہی صاحب قوت و ارادہ فرد کی ذات ہوا کرتی تھی ' اور جب کبھی اس شخصیت کا اثر مٹتا ' یا کوئی دوسری قوی تر شخصیت اس کی مد مقابل ہو جاتی ' تو سلطنتیں جس آسانی سے بنی تھیں اسی سرعت کے ساتھ متزلزل ہو جاتیں ' اور ان کی بنیادوں پر دوسری سلطنتیں قائم ہوجاتیں - تورانیوں کے مزاج پر ان کے مخصوص جغرافی طبعی حالات اور ان کی تاریخ کے نقوش اتنے گہرے بیٹھے ہیں کہ آسانی سے مٹ نہیں سکتے - چنانچہ آپ ان کی صدیوں کی تاریخ پڑھ جائیے ' آپ یہی دیکھیں گے کہ تورانی باشندوں کی سیاسی تشکیل ہمیشہ ایک سی رہی ہے ' یعنی مخوت آبادی پر مسلم معسکر کی حکومت ' اور اس حکومت سے ہمیشہ ایک مرکب تمدن پیدا ہوا ہے ' جو بجاے اس کے کہ قوم سے منسوب ہو ' بانی خاندان کے نام سے معروف ہے - واقعہ یہ ہے کہ تورانی اقوام ہمیشہ بڑی بڑی شخصیتوں کے ناموں سے معروف رہی ہیں —

تورانی نوجوان ہمیشہ ایک زبردست " شخصیت " پیدا کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا - واضح رہے کہ شخصیت کا مفہوم ان کے یہاں ہندوؤں کی طرح سے گیان دھیان کرنے والی اور مادی دنیا کو تج کر ذات مطلق میں

ضم ہو جانیوالی ذات کا نہ تھا ' شخصیت سے مراد ان کے یہاں ' جنگجویانہ فعالیت ہوا کرتی تھی : یعنی فتح وتسخیر ' حکومت ' عمل ' اور اگر سیاسیات بھی ایک طرح کی فعالیت ہی ہے ' تو ماننا پڑے گا کہ ترک پیدائشی سیاست داں تھے ' اور ایک اکیلی ان کی قوم نے جتنی سلطنتوں کو مٹایا اور قائم کیا ہے ' اس کی نظیر دنیا کی کوئی اور سلطنت نہیں پیش کرسکتی - مثلاً ' سلجوقوں ہی کو دیکھ لیجئے کہ وہ ایک غیر معروف خاندان کی حیثیت سے منصہ شہود پر آتے ہیں اور اپنی خوش بختی اور جانبازی کی بدولت تین سلطنتوں کو اپنے زیرنگیں کرلیتے ہیں- اور پھر ان کی مثال کو سامنے رکھکر ایک اور ترکی قبیلہ یعنی ' غزنویہ ' ہندوستان میں اپنی سلطنت کا پایہ رکھتا ہے - ترکی سورما ہمیشہ ہر بطل اعظم کی صدا پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہتے تھے ' اور اگرچہ انھوں نے ' ایران ' ' شام ' ' ایشیاے کوچک ' ہندوستان ہر جگہ اپنی سلطنتیں قائم کیں ' لیکن اپنی قومیت کی طرف سے انھوں نے اتنی بیگانہ منشی برتی کہ ایرانی تمدن کو اختیار کرلیا اور ایرانی المذاق بن گئے- کیا بوالعجبی ہے کہ ' شاہ نامہ ' جس میں تورانیوں کے مقابلہ میں ان کے حریف ایرانیوں کے رزمیہ کارناموں کو زندہ جاوید بنایا گیا ہے ' ایک ترکی النسل بادشاہ کی سرپرستی میں لکھا جاتا ہے ' اور ایشیاے کوچک کے سلجوق بادشاہوں کے محلوں میں فارسی کے اشعار آبدار کندہ نظر آتے ہیں !

یہ سلجوق ترکوں ہی کا کارنامہ ہے انھوں نے شام کے صلیبی مبارزوں کے مقابلہ میں عباسیہ کی زوال آمادہ سلطنت کو سنبھالے رکھا ' اور ایشیاے کوچک

میں سلطنت قائم کی ' جس نے دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک اسلامی تمدن کے بیج وهاں بوئے - " قونیہ " میں (جس کا قدیمی نام " آئی کونی" یم تھا) " سینٹ پال کے غاروں سے صرف چند ہی میل کے فاصلہ پر ایک سبز گنبد کے نیچے ' ایران کے بزرگ ترین شاعروں میں سے ایک شاعر - یعنی " مولانا جلال الدین رومی رح " دفن هیں - سلجوقوں کے مدرسے اور محل ' جن کا طرز تعمیر ایرانی ھے ' اور بازنطینی یونانی فن تعمیر کی آمیزش لئے هوے ھے ' آج تک ان کے اعلیٰ اور شستہ مذاق اور علم و فن کی سر پرستی کی یاد تازہ کئے هوے هیں —

بازنطینی سلطنت ' جو مشرق میں مسیحیت کا بعید ترین ناکہ تھی ' فرقہ وارانہ جنگوں کی بلا میں گرفتار اور ایسی بد نظمی کا شکار تھی جس کی نظیر مشکل سے ملے گی جبری محصولوں ' دربار کی عیاشیوں اور سفارش گردیوں * نے اس سلطنت کی ' جس کا شمار کسی زمانے میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں هوتا تھا ' ساری قوتوں کو چوس لیا تھا ' اور اگر یہہ اپنی سخت جانی سے ایک مدت دراز تک سنبھالے لیتی رهی ' تو اس کی وجہ یہہ نہ سمجھنا کہ اس میں اندرونی طور پر کچھہ جان باقی تھی ' بلکہ صرف رعایا کا جمود ' اور بعض جنگ جو قیصروں کی عارضی کوششیں اس کے ڈھچر کو سنبھالے هوے تھیں - اس کا انجام بد یقینی تھا ' اور اس کے زرخیز علاقے اور بد دل باشندے خدا سے چاهتے تھے کہ کوئی فاتح آے اور ملک میں نظم و نسق

---

* هم نے یہہ ترجمہ انگریزی لفظ Favouritism کا کیا ھے ' شاید سند قبول حاصل کرے ۱۲ مترجم —

اور ضبط قائم کرے —

منگولوں کے حملہ کی آندھی نے ' جو اسی قسم کی اور آندھیوں کی طرح ' " چین " کے حدود سے اُٹھی ' اور کوہ " ایلپس " تک بڑھتی چلی گئی ' سارے " ایشیا " کو تہ و بالا کر ڈالا ' کچھہ قومیں تو بالکل ھی نیست و نابود ھوگئیں ' بعضوں کے پاؤں اُکھڑ گئے ' ترکوں کے چھوٹے چھوٹے جرگے بھی ' جن کا تعلق " کے خان " (Kay khan) کے قبیلہ سے تھا ' اسی کی رو میں " کوہ قاف " کے پار ایشیائے کوچک تک پہونچ گئے ' یہاں پہونچکر انھوں نے " علاؤالدین کیقباد " سلجوق کے دربار میں پناہ لی ' جس نے ان کی خدمات کے صلہ میں انھیں " انگورہ " کے پاس متوطن ھونے کی اجازت دیدی - مزید خدمات کے معاوضہ میں ' ان کی جاگیروں میں اضافہ کیا گیا ' جو ایشیائے کوچک کے مغرب رخ واقع تھیں - " اناطولیہ " میں ' سلجوقیوں کی سلطنت کی آخری ساعت آن لگی تھی - جب منگولوں نے تازہ دم ھوکر اس پر دوبارہ تاخت شروع کی ' تو ماتحت امرا اور جاگیرداروں نے سلطنت کا ساتھہ نہ دیا ' بلکہ اس تاک میں رھے کہ موقع ملتے ھی کچھہ علاقہ دبا بیٹھیں - " کے خان لی " ترکوں نے بھی ایشیائے کوچک کے شمال مغربی سواحل پر یونانیوں کے کچھہ قلعے تسخیر کر لئے ' اور کمال ھوشیاری کے ساتھہ بعض مقامی عیسائی جاگیرداروں کے ساتھہ ساز باز کر کے " عین گل " " بلے جیک " اور " یار حصار " پر قبضہ کر لیا - رفتہ رفتہ " کے خان لی " قبیلہ کا شمار زوال آمادہ سلجوقی سلطنت کے زبردست ترین جاگیرداروں میں ھونے لگا —

اپنے پیش رووں کی طرح ' جنھوں نے ایشیائے کوچک میں بود و باش

اختیار کرلی تھی ' " کے خان لي " بھی ترک ھی تھے ' البتہ ان کی بولی ذرا اُن سے مختلف تھی - ایک اور فرق یہہ تھا کہ سلاجقہ تو صدیوں سے اسلام لا چکے تھے ' لیکن یہہ نووارد ھنوز اپنے قدیم ' خانہ بدوشی کے زمانہ کے ' مسلک پر قائم تھے - ان کے سردار " ارطغرل " کے بیتے " عثمان " کی شادی کے متعلق جو روایت مشہور ھے ' اس سے ھمارا یہہ قیاس حق بجانب ھے کہ انھوں نے ایشیاے کوچک کی اسلامی فضا میں داخل ھونے کے بعد اسلام قبول کیا - " عثمان " نے سنہ ۱۳۰۰ ع میں سلجوقی سلطنت کے جوے کو اتار پھینکا ' اور یونانیوں کو پسپا کرتا ھوا آگے بڑھا ' سنہ ۱۳۲۶ ع میں اس کا انتقال ھوا ' اور اس وقت اس کی سلطنت کی حدود جنوب میں " قتیھیہ " شمال میں بحر " مار موره " اور " سقاریہ " اور " ادر انوس " کی وادیوں تک پھیلی ھوئی تھیں ' اور اس کی ساری قلمرو میں نظم و نسق بخوبی قائم ھو چکا تھا —

سلجوقیوں کے زوال کے بعد ' " قرامان اوغلو " ان کی مملکت کا وارث جائز بن بیٹھا تھا ' لیکن متعدد جاگیرداروں نے اس کی شہنشاھیت کو تسلیم نہیں کیا ' اور خود مختار ھوگئے - " اے دین " ، " سارو خاں " " منتشہ " ، " قرمیاں " اور کئی دوسرے باجگزار امیروں نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنے الگ دربار جمالئے تھے ' وادیوں میں ترکمان قبائل گشت کرتے پھرتے تھے - چونکہ " عثمان لی " خاندان نے عروج پاکر شمال مغرب میں اپنی بنیادیں مستحکم کرلی تھیں ' اس لئے جغرافی محل وقوع کے اعتبار سے اسے اپنے دوسرے حریف قبائل پر تفوق حاصل تھا ' جو فوجی قوت کے اعتبار سے اس سے بڑھے ھوے تھے - " قرامان لیون " کا راستہ سمندر کی طرف بند تھا ' اور چونکہ وہ گرد و پیش حریفوں میں گھرے

ہوئے تھے ' اس لئے ان کی حدود میں توسیع کی گنجائش نہ تھی ' باقی رہے ' " اے دین " " منتشہ " اور " قرمیان " کے قبائل ' تو ان کا محل وقوع سمندر کے بالکل نزدیک تھا ' اور اگر وہ ادھر ادھر ہاتھہ بڑھاتے ' توصلیبی مبارزین ان کی تعزیر کے لئے موجود تھے ۔ " عثمانی " یا " عثمان لی " جو دوسرے ترکوں کی طرح سے ' آئندہ اپنے بہادر سردار (عثمان) کے نام سے موسوم ہوئے ' اناطولیہ کے زرخیز ترین علاقوں میں آباد تھے ' اور بازنطینی سلطنت کے دارالسلطنت کے پڑوس ہی میں تھے - یورپ کے صوبجات تک ان کی رسائی بہت آسان تھی ' جہاں کی رعایا حکومت کے جبر و تعدی سے اس حد تک عاجز آگئی تھی کہ اب نہ تو ان میں مقاومت کی تاب ہی تھی ' اور نہ اس کا کوئی خیال - ' عثمان ' اور اس کے جانشین ' اورخان ' اور ' مراد ' اگر چاہتے تو لالچ میں آکر ایشیائے کوچک کو بہت آسانی کے ساتھہ فتح کرلیتے اور سلجوقی سلطنت کے وارث بن سکتے تھے ' لیکن اس پالسی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انہیں اپنے حریفوں کے ساتھہ تباہ کن لڑائیاں لڑنی پڑتیں ' اور چونکہ ان کے پاس مشرق اور جنوب میں فوجی نقل و حرکت کے لئے کوئی مرکز نہ تھا ' اور نہ کوئی بیڑہ تھا ' اس لئے بازو کی طرف سے آکر ایجین (Aegian) ترک انہیں گھیر لیتے ' غرض کہ یہ پالسی عثمانی خاندان کے حق میں پیام مرگ ثابت ہوتی - سلجوقیوں کے دارالسلطنت کا محل و قوع ' یعنی ایک طرف بحیرہ ' مارمورا ' اور دوسری طرف وسط ' اناطولیہ' کا کوہستان - ایسا تھا کہ اگر کوئی اسے فتح کرنا چاہتا تو اسے چکر کاٹ کر آنا پڑتا - غرض کہ مشرق کی طرف کے حریفوں سے بے خدشہ ہوکر ' عثمان لیون نے بلقان کو اپنی تگ وتاز کا مرکز قرار دیا - بہت پہلے ہی ' یعنی سنہ ۱۳۶۶ ع میں ' وہ دھاوے مارتے اور لوٹ مار کرتے ہوئے دریائے ' ڈینیوب ' کے نشیبی حصہ تک پہونچ چکے تھے اور ' لوی آت آن ژو ' کو

اس بری طرح شکست دے چکے تھے کہ وہ بمشکل اپنی جان سلامت لیکر بھاگ سکا تھا - ' فلپا پولس ' اور ' ادرنہ ' اس سے بھی چند سال پہلے * ان کے ھاتھہ میں آچکے تھے —

' بروسا ' صرف چالیس سال تک اس نوخیز سلطنت کا دارالخلافہ رہا ' اور اس کے بعد مرکز ثقل جزیرہ نمائے بلقان کی طرف منتقل کردیا گیا جہاں ' ادرنہ ' ان کا دارالخلافہ قرار پایا - اس کار روائی نے ' یورپ ' کو سراسیمہ کردیا ' اور وہ بدحواس ہوکر عثمانیوں کو نکالنے کے لئے فوجیں جمع کرنے لگا ' لیکن دوسری طرف ان کے ایشیائی حریفوں کو اس کا گمان بھی نہ تھا کہ یہ (ترک) آئندہ چل کر ان کے حق میں کتنے خطرناک ثابت ہوں گے ' اور وہ ان کی طرف سے بالکل مطمئن تھے - یہاں تک کہ سنہ ۱۴۵۳ ع میں ' قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد ' ' سلطان محمد فاتح ' نے اپنی ظفر یاب عساکر کی عنان اناطولی حکمرانوں کی طرف بھی پھیر دی —

عثمانی فتح و ظفر کا یہ سیلاب بے مزاحمت برابر آگے بڑھتا گیا سنہ ۱۴۹۲ ع میں انھوں نے ' استیریا ' + (Styria) کو تاخت و تاراج کیا اور اس طرح اگر ایک طرف ' اندلس میں اسلام کا آخری مرکز ' مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا ' تو دوسری طرف اسی زمانے میں ترکوں نے اپنی فتوحات سے اس کی بخوبی تلافی کر دی - ادھر ' اندلس ' میں مور جنگ ' تورز ' (Tours) میں هزیمت اٹھانے کے بعد ' ھسپانیہ ' کے قصبوں میں منتشر

---

* ' سلطان مراد اول ' نے ' ادرنہ ' سنہ ۱۳۶۱ع میں تسخیر کیا تھا ' اور سنہ ۱۴۵۳ع میں فتح ' قسطنطنیہ ' کے زمانے تک یہی مقام ترکوں کا دارالخلافہ رہا — ۱۲ - مترجم -

+ یہ سلطنت آستریا کا ایک صوبہ تھا - ۱۲ مترجم -

ہوکر اسلامی تعلیم کے فروغ و نشو و نما میں مشغول تھے ' ادھر مشرق میں یورپ کا نیا دشمن ' یلغار کرتا ہوا 'وی اینا (Vienna) کے دروازوں ' بحیرۂ اوقیانوس اور بحیرہ اسود کے شمالی سواحل تک بڑھ گیا تھا ' خصوصاً ' فتح مصر ' کے بعد تو ترکی سلاطین کے کلاہ تفاخر میں " خادم الحرمین الشریفین " کا طرۂ امتیاز بھی لگ چکا تھا - غرض کہ دو صدی کے اندر اندر ' ایک چھوٹے سے دیہاتی قبیلہ نے یہ عروج حاصل کیا کہ اب اس کا شمار دول عالم میں ہونے لگا تھا ' اور اس کی سلطنت اپنی وسعت ' قدرتی وسائل کی مالا مالی اور تمدن کی بوقلمونی کے اعتبار سے تاریخ عالم کی بزرگ ترین سلطنتوں کی ہم پایہ بن چکی تھی - اگرچہ مذہبی اور تمدنی حیثیت سے سلطنت ترکی اسلامی تھی ' لیکن وسط ایشیا کے خانہ بدوش زائروں کی ساری خو بو اس میں موجود تھی - اس کی رعایا میں یونانی ' کرد ' ایرانی ' عرب ' البانی ' سلافی ' ہنگروی ' جرمن غرض کہ سب ہی ملکوں اور ملتوں کے باشندے داخل تھے - ترک کا نام ہی ہیبت پیدا کردینے کے لئے کافی تھا ' اور انھیں شکست دینا یا ان کی قوت کو تباہ کرنا ایک ناممکن امر سمجھا جاتا تھا - لیکن جو چیز انسانی کوششوں کے لئے امر محال تھی ' زمانہ کے ہاتھوں پوری ہوکر رہی ' امتداد زمانہ اور تورانی نظام حکومت کی اندرونی خامیاں ترکوں کی قوت کو توڑ کر رہیں - سنہ ۱۶۰۰ ع وہ زمانہ تھا جب کہ عثمانی شوکت و عظمت کا آفتاب نصف النہار پر تھا ' لیکن ایک صدی بعد ہی اس کا زوال شروع ہوگیا تھا - ' ہنگری ' کے صوبجات ان کے قبضہ سے نکل چکے تھے ' اور اس کے بعد سے جلد جلد اور پے در پے ناکامیوں اور ہزیمتوں کا سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہوا کہ بدنصیب ترکی مدبروں کی نالائقی کو موردالزام ٹھہرانا ' یا دشمنوں کی اعلیٰ قابلیت

اور حسن تدبیر کو اس کا سبب قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا ' بلکہ ماننا پڑتا ہے کہ اصل میں یہ مرض نظم سلطنت کا تھا ' جس کی معاشرت ' طرز حکومت ' اور اصلی روح کو گھن لگ گیا تھا - چونکہ ہم ایک ایسی سلطنت سے بحث کر رہے ہیں جو یورپ کی دشمن تھی ' اس لئے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کون سے اسباب تھے ' جنھوں نے عثمانیوں کے مقابلہ میں یورپ کو ضعیف کردیا تھا ' اور پھر کون سے اسباب اٹھارویں انیسویں صدی عیسوی میں اس کے (یورپ) از سر نو عروج کے محرک ہوے —

یورپ کے ضعف کے اسباب کچھہ داخلی تھے ' اور کچھہ خارجی - اپنے عروج کے زمانہ میں ترکوں نے جن قوموں سے لڑائیاں لڑیں ' ان کے مقابلہ میں خود ان کا (ترکوں کا) معدل وقوع حربی نقطہ نگاہ سے بہت بہتر اور مفید مطلب تھا ' اور پھر ان قوموں کی سلطنت کے کل پرزے بالکل فرسودہ ہو چکے تھے ' اور وہ مساوی تعداد کی فوجوں سے بھی ' ترکوں کی زیادہ مسلح اور زیادہ جوشیلی سپاہ کا مقابلہ نہ کرسکتے تھے - مسیحی یورپ آپس کے نفاق کا شکار بنا ہوا تھا - بلقان کی چھوٹی چھوٹی ہمسایہ سلطنتیں ایک دوسرے پر خار کھاتی تھیں ' اور جب کبھی ان کی متحدہ فوجیں میدان جنگ میں ترکوں کے مقابلہ کے لئے اتریں ' تو کئی مرتبہ بری طرح سے شکست کھائی - حد تھی کہ سارا یورپ چالیس ہزار باقاعدہ فوج بھی ترکوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں نہ لاسکتا تھا ' جن کی جانثاری افواج کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ان سے بڑھکر میدان کا دھنی یورپ میں اور کوئی نہیں ہے - یورپ کے جاگیری نظام نے سلطنتوں کی مرکزیت کو توڑ کر ' ان میں ضعف پیدا کردیا تھا ' مغرور اور سرکش امرا قوت پکڑ چکے تھے ' اور سلطنتوں کی پالیسی ' اور حربی کارروائیوں کا انحصار

صرف انھیں امرا کے رحم و کرم پر رہ گیا تھا، جو لڑائی کو قوموں کی زیست و موت کا سوال نہیں، بلکہ صرف جھوٹ دکھانے کا ایک مشغلہ سمجھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ترکی عساکر کی جان، "جانثاری" تھے، جو فطرتاً جیالے، فوجی ضبط کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، سخت مزاج اور بہادر افسروں کے سدھائے ہوئے کار آزمودہ سپاہی تھے، اور کٹھ پتلیوں کی طرح ترکی سلطان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ تورانی تہذیب جتنی پچکلیاں تھی اتنی ہی ان کی فوجی قابلیت اور فنون جنگ بر محل اور مناسب موقع ہوا کرتے تھے۔ اگرچہ وسط ایشیا کے گیارہ زاروں کے حربی اصول اصل میں قدیم ایرانی حربیات سے ماخوذ تھے، لیکن ترک، چونکہ پیدائشی سپاہی تھے، اس لئے ان کی تیز نگاہیں بدلے ہوئے حالات کو فوراً تاڑ لیتی تھیں، اور نئی نئی ایجادوں، یا نئے نئے حالات کے اقتضاء سے وہ فوراً اپنے فنون جنگ میں بھی رد و بدل کردیا کرتے تھے۔ ترکی فوج کے پاس سارے یورپ کے مقابلے میں جدید ترین اسلحہ موجود تھے، حالانکہ جس واحد یورپی سلطنت پر انہوں نے حملہ کیا، اس کا ساز و سامان صرف تھوڑا بہت جدید تھا۔ انھوں نے توپ خانے کی اہمیت اور ضرورت کو بھی بہت جلد سمجھ لیا تھا، اور مختلف دہانے کی توپیں ڈھالنے میں ایسا کمال دکھلایا تھا کہ کوئی قلعہ ان کی تباہ کن گولے باری کی تاب نہ لاسکتا تھا۔ قسطنطنیہ کے محاصرے میں انھوں نے ۴۵ سنٹی میٹر دہانے کی برنجی توپیں استعمال کی تھیں۔ مشرقی یورپ کے تمام قلعے صرف سواروں کے حملے اور ہلکی توپوں کی گولہ باری کی رعایت سے بنائے گئے تھے، اور اسی غرض سے ان کی دیواریں سیدھی اور اونچی رکھی گئی تھیں، لیکن ترکوں کی بھاری توپوں کو دیکھکر، سولھویں صدی کے آخر زمانے میں نئے اصولوں پر قلعوں کی تعمیر

ہونے لگی، یعنی ان کی فصیلیں ڈھلواں اور نیچی بنائی جانے لگیں۔ ان فنی حیثیتوں سے بڑھے ہوئے ہونے کے علاوہ، ترک جوش شجاعت میں بھی یورپ والوں سے بمراتب زیادہ تھے، ہر فتح کے بعد ان کی ہمتیں بلند تر ہو جاتی تھیں، مال غنیمت ان کے ہاتھ آتا تھا، اور جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ ان میں جوش زن ہو جاتا تھا۔ ترکوں کی پے در پے فتوحات میں، اسلام اور اس کی مجاہدانہ تاثیر کا بہت کچھ دخل تھا۔ پہلے وہ بت پرستوں کی حیثیت سے محض غارت گری اور نام آوری کے خیال سے لڑا کرتے تھے، لیکن اسلامی تبلیغ و اشاعت کے بعد جوہر ایمان کی آمیزش سے ان کی شجاعت کا ایک اخلاقی نصب‌العین پیدا ہو گیا تھا، اور اس سے ان کی جنگ جوی کے جوہر اور کھلتے تھے۔ ان کے شروع زمانے کے سلاطین کی تربیت بھی معسکر کی سادہ اور صحت بخش فضا میں ہوئی تھی، ان کے خمیر میں بھی، اپنے سپاہیوں کی طرح، شجاعت اور بسالت کے جوہر موجود تھے، اور ان کی حربی قابلیت بھی اپنے تمام ہم عصر بادشاہوں سے کہیں زیادہ تھی —

جب ترکوں نے اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا، تو انہیں صرف زوال پذیر بازنطینی سلطنت اور ریاست ہائے بلقان ہی سے مقابلہ کرنا پڑا تھا، لیکن جب وسعت حدود کے اعتبار سے عثمانی قوت اپنے پورے عروج پر پہونچی، تو اب اسے متعدد قوی تر دشمنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حربی نقطہ نظر سے اب اس کا محل وقوع بھی کمزور ہو گیا تھا، اس لئے کہ جیسے جیسے حدود سلطنت "اناطولیہ" سے دور ہوتی گئیں سلسلۂ رسل و رسائل طویل ہوتا گیا۔ اُدھر، سترویں صدی میں یورپ بھی ایک نیا جنم لے چکا تھا۔ نئی نئی ایجادیں اور اکتشافات ہو چکے تھے، تحقیق کے علمی

اصول بن چکے تھے ' جنگ ہائے اصلاح (Wars of Reformation) ختم ہوچکیں تھیں ' قومی احساسات رکھنے والی مستقل قومی سلطنتیں مستحکم ہوچکی تھیں ' اور از منہ وسطی کے دور جاگیریت کے کم مایہ اور نیم علم افراد کی بجائے ' اب یورپ والوں کی ایک قابل نسل پیدا ہوچکی تھی - سلطنتوں کے آپس کے سمجھوتوں اور صلح ناموں نے لشکر آرائی کا راستہ کھول دیا تھا ' اور اب باقاعدہ یورپی فوجیں ' جو فنی حیثیت سے اعلی درجہ کی اور روحانی اعتبار سے ترقی یافتہ ہو چکی تھیں ' ترکوں کے حق میں خطر ناک اور نا قابل تسخیر دشمن بن گئی تھیں - سترھویں صدی میں امریکہ کی دریافت ' اور اس کی پیداوار کی خرید و فروخت نے بحیرہ قلزم کی بجائے بحر اوقیانوس کو دنیا کی تجارت کا راستہ بنا دیا تھا - افریقہ کا چکر کاٹ کر جانے ' اور دنیا کی تجارتی گزرگاہوں میں تبدیلی ہو جانے کی وجہ سے ترکی کی ترقی میں بہت کچھ خلل واقع ہوا ' اس لئے کہ اب وہ ' ایک اعتبار سے ' ترقی یافتہ قوموں کے ربط و اختلاط سے محروم ہو گیا - مذکورۂ بالا اسباب نے ترکی کی طرح ' اٹلی کو بھی اقتصادی حیثیت سے نقصان پہونچا یا ' لیکن اس نے پھر بھی اپنی تہذیب اور تمدن کے سرمایہ کو محفوظ رکھا ' بلکہ اس کی توقیر بھی کی ' لیکن ترکی میں ' جیسے ہی فتوحات کا سلسلہ بند ہوا ' ویسے ہی وہ اپنی مفتوحہ طباع قوموں کے تہذیبی سرمایہ سے بھی محروم ہو گیا ' اور اس کا تمدنی ارتقاء رک گیا -- وہ دنیا سے الگ تھلگ اور نئے ترقی یافتہ خیالات سے محروم ہو گیا ' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کو تو ان جدید خیالات نے ہمیشہ نئی زندگی بخشی ' اور اسے مشرقی تہذیبوں

کے تقابلی مطالعہ پر آمادہ رکھا ' لیکن ترکی انہیں فرسودہ نظامات کا پا بند ' اور انہیں بوسیدہ اداروں کو سنبھالے رہا - یورپ نے تو اصلاح کے بعد سے توھمانہ اور ملا یانہ خیالات کو بالائے طاق رکھہ دیا ' لیکن ترکی ایک ایسے مخصوص مراعات رکھنے والے طبقہ کا شکار بن گیا ' جس نے اسلام سے ارتقاء کی روح کو سلب کرنے کی کوشش کی —

جن داخلی اسباب نے ترکی کو کمزور بنایا ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جیسے جیسے اس کی حدود میں توسیع ہوتی گئی ' ویسے ویسے رسل و رسائل کے طویل سلسلوں کی کماحقہ نگرانی ناممکن ہوتی گئی ' اور سرحدی مقامات کے ساتھہ سلسلہ اخبار و اطلاعات برقرار رکھنے کے لئے بعض درمیانی علاقوں کو ایک طرح کی نیم خود مختاری دیدی گئی ' مثلاً "گریمیا" "والیشیا" اور "ھنگری" ان کے علاوہ ' "عرب" شمالی "افریقہ" "مصر" "طرابلس" اور الجزائر ' نیم خود مختار صوبجات تھے - ان صوبجات کا علاقہ وطنی حکومت ' یعنی ایشیائے کوچک کے ساتھہ کچھہ زیادہ استوار نہ تھا - جیسے جیسے سلطنت بڑھتی گئی ' اس کے باشندوں کی قومیتوں اور مذھبوں کی بو قلمونی بھی زیادہ ہوتی گئی ' جن میں اور حکمران قوم میں کوئی وجہ اشتراک نہ تھی ' اور اندرونی ناچاقیوں اور شورشوں نے ھیئت سیاسیہ کو کمزور کرنا شروع کردیا — '

سلطنت ترکیہ کے اختلال کا خاص الخاص سبب اس حس حکمرانی یا ملکہ بادشاہی کا زوال تھا ' جو پہلے حکمران کی شخصیت میں مجسم بن کر ظاہر ہوا کرتا تھا - ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ تورانی سلطنت کا مدار تمام و کمال شخصیت پر ہوتا تھا ' اور اس قسم کا نظام حکومت ' بہت آسانی

کے ساتھہ مذہب اسلام سے میل کھا سکتا تھا' اس لئے کہ اگرچہ اسلام کی اصلی روح جمہوریت ہی ہے' لیکن ساتھہ ہی ساتھہ مطلق العنان بادشاہوں کا ریاست کے جملہ عاملانہ اختیارات کو اپنی ذات واحد میں جمع کر لینا بھی اسلامی اصول کے منافی نہیں ہے - خلیفہ بحیثیت اعلی ترین محافظ شریعت کے - اور سلطان بحیثیت ترکوں کے ارضی حکمران کے' ان دونوں فرائض کے ایک ذات میں جمع ہو جانے کی وجہ سے ترکی سلطان کی شخصیت بمراتب زیادہ ہو گئی تھی' وہ سلطنت کا مالک تھا اور ساری رعایا اس کی حلقہ بگوش تھی - ہیئت سیاسیہ کی تنظیم سے تو ہم بعد میں بحث کریں گے - سردست اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ حکمران کی قوت میں ضعف کے نمودار ہوتے ہی یہ سارا ڈھچر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگا - سلطان سلیم " مست ". کے زمانہ تک جتنے بڑے بڑے سلاطین گزرے' وہ سب کے سب جوان اور جنگ جو بادشاہ تھے' جو نظم و نسق مملکت کی باگ اپنے ہاتھہ میں مضبوطی سے لئے رہتے تھے اور بہ نفس نفیس جنگی کار روائیاں کیا کرتے تھے -- لیکن " سلیم " کے بعد جو آتھہ سلاطین یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے' ان میں سے پانچ تو کسی فوجی مہم میں شریک تک نہ ہوے' بلکہ رعایا سے روپوش ہوکر حرم سرا کے اندر رہنے لگے -- ان کے ولی عہدوں اور شہزادوں کو شروع میں تو سازش کے ڈر سے قتل کر دیا جاتا تھا' لیکن بعد کو انھیں عمر قید دی جانے لگی -- ان میں سے بعض' آئندہ چل کر تخت نشین ہوے' لیکن چونکہ ان کی ساری زندگی خواجہ سراؤں اور دوسرے غیر ذمہ دار جلیسوں کی صحبت میں گزری تھی' اس لئے ان میں سلطنت کا بار گراں اٹھانے کی اہلیت مطلق باقی نہ رہی تھی - سلاطین' خانگی عہدہ داروں کے ہاتھہ میں نری کٹھہ پتلیاں تھے -

رشوت، سازش، غیبت ۰ ان سب کا اثر محل سرا تک پہونچنے لگا تھا، اور صوبجات کے والیوں نے مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر، ہر ناجائز طریقہ سے دونوں ھاتوں سے دولت سمیتنی شروع کردی تھی - غرض باز نطینی سلطنت کی ساری شامتیں اور عیاشیاں اس لاجواب ہیئت سیاسیہ پر مسلط ہوگئیں جسے ابتدائی سلاطین نے اپنی قابلیت سے قائم کیا تھا ، اور ترکی قوم نے جس سلطنت کو اپنے خون سے سینچا تھا، اس کی بنیادیں کھوکھلی ہوگئیں - نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کی توسیع یک لخت بند ہوگئی ، علاقوں پر علاقے ھاتھ سے نکلنے لگے، جس سے خزانہ شاھی میں تشویش انگیز کمی واقع ہونے لگی، لیکن نا عاقبت اندیش اور رنگین مزاج عمال سرکاری کے حلقوں میں بدستور رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں- بغاوتوں، شکستوں، اور تاوانوں کی گرانباری نے غریب رعایا کو، جس کی مصیبتیں دن بدن بڑھتی جاتی تھیں، پیس ڈالا - جان نثاری افواج بھی، جو ھمیشہ سے فوج کی جان اور ترکوں کی فتح کی ضامن تھیں، بکتا شیوں اور دوسرے شورہ پشت عناصر کے ساتھ جا ملیں، اور ملک کے امن و امان کے حق میں دشمن ثابت ہونے لگیں، یہاں تک سلطان محمود ثانی نے جو ایک مصلح اعظم تھا، انھیں نیست و نا بود کر ڈالا - سلطنت کا نظم و نسق، خواہ بہتر سے بہتر طریقہ ھی پر کیوں نہ کیا جاتا لیکن فرسودہ اور از کار رفتہ ہوچکا تھا ، اور تنگ نظر اور قدامت پرست رعایا اور خائن عمال کی مخالفت کی وجہ سے اسے توڑنا اور اس کی جگہ بہتر اور مفید تر نظام قائم کرنا ممکن نہ تھا —

معاشرت کے اعلیٰ طبقوں سے ہوتا ہوا یہ اندرونی مرض آہستہ آہستہ ادنیٰ طبقوں میں سرایت کرتا گیا - اور صدیوں تک ترکی سوسائٹی نے اخلاقی کش مکش کی وہ سختیاں اٹھائیں کہ کوئی اور قوم اس طرح ٹھنڈے دل سے اسے گوارا نہ کرتی، نظم و نسق نے بد سے بدتر صورت اختیار کی، ترکی جنرلوں کے دامن تک رشوت ستانی کے دھبہ سے آلودہ ہوگئے، لیکن آفریں ھے ترکی قوم کو کہ ان کی معصوم سادگی اور اور دیانت میں آج تک فرق نہیں آیا ! —

عثمانی تہذیب کی خصوصیت خاصہ اور اس کے اجزا کیا تھے؟ ہم دیکھہ چکے ہیں کہ جیسے جیسے وہ وسط ایشیا سے مغرب کی طرف بڑھتے گئے' جن جن باشندوں سے ان کا سابقہ پڑا' ان کی تہذیب انھوں نے اختیار کی - اسلام کی عجمی شکل' نیز شیعیت اور "صوفیت" نے' جن کے گروہ اسی زمانے میں منظم ہوچکے تھے' ترکوں کے تخیلات کو اپنی طرف کھینچا - ایشیاے کوچک صدیوں سے مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کا سنگم رہ چکا تھا - تو ہم پرستی کے زمانہ کے باقیات' بازنطینی' یونانی' اور سلجوقی ایرانی تہذیبوں کے اجزا خلط ملط ہوکر ایک ایسا طرفہ معجون بن گئے تھے' جس کے اجزاے ترکیبی کی تحلیل تو ممکن ہے' لیکن جو خود محض ان مفرد اجزا کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک دوسری ہی چیز ہوکر رہ گیا ہے - ایشیاے کوچک سلجوقیوں ہی کے زمانہ میں ترکی رنگ میں رنگا جاچکا تھا' اور کے خاں لی' نو واردوں کو جن کی کل تعداد بمشکل دو ہزار سواروں سے زیادہ ہوگی' اپنی فوجی مہموں اور نئے مفتوحہ علاقوں کو بسانے کے لئے ہمیشہ کافی تعداد میں ترک مل سکتے تھے - تعداد ازدواج کے دستور نے بھی ترکوں کو بڑا فائدہ پہونچایا' اس لئے کہ مسلسل جنگوں میں انسانی جانوں کی جو زبردست قربانیاں انھیں دینی پڑیں' اس کی تلافی اضافہ آبادی سے ہوجاتی تھی - لیکن اس کے باوجود ترکی قوم آج تک یہ نہ کرسکی کہ اپنے علاقوں کو اپنے ہم قوموں سے آباد کردے' یا وہاں کی رعایا کو اپنی قومیت کے اندر جذب کرلے —

ترکی ہیئت سیاسیہ کا شروع ہی سے یہ خاصہ رہا ہے کہ حکمران طبقہ جمہور سے بالکل الگ تھلگ رہتا ہے- قومیت کے جدید تصور کی رسائی ترکی جمہور کے ذہنوں تک آج تک نہیں ہوئي ہے' اور عربی اسلام کے بر خلاف جس نے مذہبی تبلیغ کے ذریعہ غیر اقوام کو معرب بنا دیا' ترک نہ تو بلقان کو "ترکا" سکے اور نہ اناطولیہ کو بلکہ محض آباد کاروں کی حیثیت سے رہے اور کسی قسم کی قومی یک جہتی نہ پیدا کرسکے- ترکی

تشکیل سیاسی میں ہمیں ایک عجیب دو رنگی نظر آتی ہے، جو صرف اس حد تک کہ سلطان کی اطاعت شعاری کا تعلق ہے نسلی رشتوں کو منقطع کرکے سب کو ایک اسلامی شیرازہ میں منسلک کردیتی ہے - غیر ملکی اور غیر وطنی لوگ بھی اسلام قبول کرکے، سلطان کی ملازمت میں داخل ہوسکتے تھے - یہ گویا نسلی انضمام کی ایک ترغیب تھی، اور عثمانیوں کی تاریخ میں ہمیں اس کی مثالیں بکثرت نظر آتی ہیں کہ لوگ برضا و رغبت اسلام لاکر، حکمران طبقہ کی تعداد میں اضافہ کا باعث ہوئے ہیں - عیسائیوں پر مسلمانوں کے مقابلہ میں محاصل کا بار زیادہ تھا، اور شاید اس کی وجہ سے بھی اسامی اور کاشتکار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوے - وسط اناطولیہ میں قراامانی، اور مغربی اناطولیہ کے باشندے نسلی حیثیت سے ترک نہیں ہیں بلکہ مذہب اور بعد کو زبان کے اثر سے ترکی بن گئے ہیں - جب ترکوں نے اپنی سلطنت کا پایہ رکھا، تو اس وقت بھی ان کا نظم و نسق وہی قدیمی پیچکلیان قسم کا تھا، اور انتظام ملکی تقریباً تمامتر نو مسلموں کے ہاتھوں میں تھا - اس سے ایک نیا اور مصنوعی طبقہ پیدا ہو گیا، یعنی حکمران طبقہ، جو با وصف نسلی اختلاف کے، ملازمت سلطانی میں آکر مسلمان ہوگیا تھا - مرور ایام سے اور جیسے جیسے فتوحات کا سلسلہ بڑھتا گیا، یہ طبقہ دن بدن کثیرالتعداد اور جمہور سے الگ تھلگ ہوتا گیا - یہ ایک عجیب و غریب تاریخی معما ہے کہ ترکی جمہور نے، جو قدیم‌الایام سے فتح و تسخیر کی قوت اور نظم و نسق کی صلاحیت میں بڑھی چڑھی تھی، غیر ترکی اجزا کی ایک ایسی فاتح فوج اور ایسی انتظامی جماعت پیدا کردی، جو اپنے کو خود ترکوں سے الگ اور بڑھا ہوا سمجھتی تھی - یہ لوگ خود کو' عثمان لی' کہتے تھے' جس کے معنی ہیں خاندان عثمان کے حلیف' اور جمہور کو جنھیں وہ 'ترک' کہتے تھے' نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے - 'عثمان لی' کے اس حکمران طبقہ کا صدر اعلیٰ سلطان ہوتا تھا' جو اپنی رعایا کے جان و

مال کا حاکم مالی الا طلاق تھا - اس استبدادیت کا اصول یہہ تھا کہ عوام الناس کے نفع کو مد نظر رکھتے ہوے ' ان کے ساتھہ پدری شفقت برتی جاے ' اور جمہور کی قوتوں پر اقتدار کامل حاصل رهے - اس هیئت سیاسیہ کی مثال بالکل لشکر گاہ کی سی تھی ' جہاں سالار عسکر اپنی افواج کی ضروریات زندگی مہیا کرتا اور جس طرح چاهتا ان سے کام لیتا هے - رعایا سلطان کی غلام تھی - شروع میں " عثمان " اور " اور خان " جیسے سردار اپنے لئے قدیم ترکی لقب " بے " استعمال کرتے تھے ' سب سے پہلے " سلطان " اور " خان " کے القاب " یلدرم " نے اختیار کئے - رعایا کے حال پر ترکی سلاطین کی پدری شفقت کی مثالیں همیں شروع کے سلاطین میں نظر آتی هیں ' جن کی زندگیاں بہت سادہ هوتی تھیں ' اور جو جمہور کے قدیم مراسم و رواج پر کار بند تھے - جیسے جیسے ممالک محروسہ میں توسیع هوئی ' اور محل کے عہدہ داروں کی تعداد بڑھی ' ویسے ویسے نمائش اور تصنعات بھی بڑھنے لگے ' اور سلطان اپنے مشیروں سے دور دور رهنے لگا - " سلطان محمد ثانی " اپنے وزیروں کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا - ایک مرتبہ ایک دهقان کچھہ فریاد لیکر ایوان میں آیا ' اور پوچھنے لگا کہ " تم میں سے سلطان کون هے ؟ " اس واقعہ کے بعد سے سلطان دریچہ کے پیچھے بیٹھکر اپنے وزراء کی بحثوں کو سننے لگا - " سلیمان " کے زمانے سے یہہ دستور هوگیا کہ اب سلطان مجلس وزراء میں شرکت کی زحمت گوارا نہ کرتا تھا ' بلکہ وزیر اعظم تخلیہ میں مجلس وزراء کے تصفئے گوش گزار کیا کرتا تھا اور سلطان کا حکم آخری اور قطعی هوتا تھا - تعجب کی بات هے کہ جیسے جیسے سلطنت میں زوال آنے لگا اور صوبجات یکے بعد دیگرے هاتھہ سے نکلنے لگے ' ویسے ویسے

سلطانوں کا غرور اور تمکنت بڑھتے گئے اور ان تک باریابی دشوار ہوتی گئی ' اور ساتھ ہی محل سرا کے نا عاقبت اندیشانہ اور بد تر اثرات ان کی مرضی پر حاوی ہوتے گئے - شروع کے جنگ جو سلاطین اپنے بیٹوں کے اندر اپنی جنگی روح پھونکا کرتے اور ان میں سے اپنا جانشین نامزد کرتے تھے - " سلطان احمد اول " کے عہد سے قانون وراثت بدل دیا گیا اور اب تخت کی جانشینی خاندان کے بزرگ ترین رکن کے حصہ میں آنے لگی —

باب حکومت ' جو سلطان کی مجلس شوریٰ تھی ' ان ارکان پر مشتمل تھی - صدر اعظم ' دو قاضی عسکر ' قاضی قسطنطنیہ ' جانثاریوں کا افسر اعلیٰ ' نشانچی (مہر بردار شاہی) ' خزانچی اور سالار عساکر - باب حکومت کے اجلاس روزانہ صبح میں ہوتے تھے ' اور اس کی کارروائیاں اس طرح شروع ہوتی تھیں کہ رئیس الکتاب تجویزیں اور کاغذات پڑھکر سناتا تھا - " خوجگیان " احکامات قلم بند کر کے مختلف عہدہ داروں کے پاس روانہ کرتا تھا - اہم قانونی معاملات میں ' باب حکومت ہی اعلیٰ ترین مجلس مرافعہ ہوتی تھی - اجلاس کے بعد سلطان تخلیہ میں صدر اعظم اور دوسرے وزراء کو طلب کرتا ' اور ان کی تجاویز سنتا تھا - نئے تقررات اور مختلف عہدوں کی خلعت بخشی بھی اسی موقع پر ہوتی تھی - سترھویں صدی عیسوی میں یہہ دستور العمل متروک ہوگیا ' اور اب باب حکومت کے جلسے گاہ گاہ صدر اعظم یا شیخ الاسلام کے محل میں منعقد ہونے لگے - جب " محمود ثانی " نے نظام و نسق کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور وزیروں کا تقرر کیا تو اس نے یہہ قاعدہ بنایا کہ صدر اعظم کی صدارت میں ہفتہ میں دو مرتبہ اجلاس ہوا کرے - وزیروں کو ' ان کے منصب کے

اعتبار سے سہ اسپ (*) دمہ نشان عطا ہوتا تھا اور صدر اعظم کو چہار اسپ دمہ - سلطان کے خیمہ کے سامنے سات دموں کے نشانات نصب کئے جاتے تھے - وزیر کے خیل و خدم میں بعض اوقات کئی کئی ہزار آدمی ہوتے تھے —

اصطلاحی حیثیت سے ' عثمانی نظم و نسق کے اہم شعبے ' یعنی دیوانی ' فوجی اور عدالتی آپس میں بہت کچھہ میں غلط ملط تھے 'لیکن ایک حد تک درجہ بندی کی کوشش بھی کی گئی تھی - ساری سلطنت کو ولایتوں ' سنجقوں اور قضاۃ میں منقسم کیا گیا تھا - ولایتوں اور سنجقوں کے والی فوجی افسر بھی ہوا کرتے تھے ' فوجیں ان کے جلو میں رہا کرتی تھیں اور لڑائی کے زمانے میں جاگیردار اور امرا جو فوجی دستے بھیجتے تھے ' ان کی سرداری بھی یہی والی کیا کرتے تھے - سنجق کے افسر اعلی کو ایک اور ولایت کے والی کو دو نشان عطا ہوتے تھے - " انا طولیہ " اور " رومیلیا " (یعنی یوروپین ترکی) کے " بے " ان کے اوپر دو بگلر بے مقرر ہوتے تھے ' جو فوجی دستوں کی کمان بھی کیا کرتے تھے - اگر میمنہ اور میسرہ کی کمان پر کوئی شہزادہ نہ ہوتا ' یہی دونوں ' بے ' میدان جنگ میں ان کی کمان پر مقرر کئے جاتے - ان اہم خدمات پر تقررات ایک خاص طریقہ پر ہوتے تھے ' جیسے " دوشرمہ " کہتے تھے ' یعنی بلقان اور دوسرے مقامات سے عیسائی بچوں کو اتھالے جانا ' اور انہیں مسلمان بناکر ان مخصوص خدمات کے لئے تیار کرنا - یہہ لوگ سلطان کے خاص محافظ ہوتے تھے —

دوسری اہم خدمات یہہ تھیں : دفتر دیوانی ' جو مجلس وزراء کے

(*) یہہ ترکی نشان تھا ' گھوڑے کی دم نیزے کے سرے پر باندھی جاتی تھی ' دموں کی تعداد کی مناسبت سے ' پاشاے دو نشان پاشاے سہ نشان وغیرہ کہلاتے تھے - ۱۲ - مترجم —

فیصلوں کو ضبط تحریر میں لاتا اور دوسرے دفتروں کو بھیجتا تھا ' دفتر حقانی ' جس میں اراضیات کے متعلق کاغذات رہا کرتے تھے ' اور خزانہ دیوانی دفتر کا صدر اعلیٰ رئیس الکتاب ہوتا تھا ' جو سفارت خانوں کے ساتھہ مراسلت کرتا ' اور غیر قوموں کے ساتھہ امور سلطنت کی گفت و شنید کرتا تھا —

ایک اور اہم عہدہ ' نشانجی یا رجسٹرار کا ہوتا ' جو زمینات کی تقسیم کرتا ' سلطانی فرامین پر مہر لگاتا اور نئے مفتوحہ علاقوں کے متعلق اندراجات کرتا تھا - ' دفتر دار ' کا عہدہ وہی تھا جو آج کل صدر المہام فنانس کا ہوتا ہے - ابتداء میں صرف ایک ' دفتر دار ' ہوتا تھا ' لیکن بعد کو یورپی اور ایشیائی مقبوضات کے لئے علیحدہ علیحدہ دفتر دار ہوتے تھے - وہ محاصل کی جمع بندی اور اخراجات کی نگرانی کیا کرتے تھے -

علماء کا طبقہ ' جو اسلامی ممالک کے سیاہ و سفید میں بہت کچھہ دخیل تھا ' ترکی میں محمد ثانی کے زمانہ میں وجود میں آیا - شروع میں ان کے فرائض قاضی عسکر کی حیثیت سے صرف فوج تک محدود تھے اور پندرویں صدی کے ختم تک مفتی اعظم کی کوئی علیحدہ خدمت نہ ہوتی تھی ' بلکہ قاضی بروسا ' یا قسطنطنیہ کا قاضی یا کوئی اور عالم جو پادشاہ کے اشاروں پر چلتا ' اس خدمت پر مقرر کیا جاتا - اس طریقہ تقرر سے ' اس اعلیٰ عدالتی عہدہ کی اہمیت بہت کچھہ کم ہوگئی تھی ' اور اگرچہ بعض قوی الارادہ شیخ الاسلام کبھی کبھی اپنے خاص اختیار کو کام میں لاکر سلاطین کی فضول خرچیوں کو روک دیا کرتے تھے ' لیکن عموماً ان میں سے اکثر سلاطین کے ہاتھوں میں محض بے جان آلہ کی حیثیت رکھتے تھے اور خلاف احکام شریعت ' فتاوے صادر کیا کرتے تھے —

ترکی حکمران طبقہ میں علماء کا طبقہ ہی خالص اسلامی عنصر تھا ' یعنی اس میں وہ عیسائی بچے شامل نہ کئے جاتے ' جو ترکی مقبوضات سے پکڑ کر لائے جاتے تھے ' بلکہ اس طبقہ کے افراد ترکوں اور عربوں کی اولاد ہوا کرتے تھے ' اور ان کی جماعت ' بعد میں غیر ملکی نسل کے عہدہ داروں کے خلاف بڑی ہو گئی تھی - اس ڈر سے کہ سلطان ' یا فوج ان کے اقتدارات میں مداخلت نہ کر سکے ' انھوں نے اپنے پیشہ کی حیثیت خاندانی اور موروثی بنادی تھی ' اور گود کے بچے بھی " علماء " (بشک علمائی غی) کہلاتے تھے - اس مذموم طریقہ نے جس کی ابتداء محض حفاظت خود اختیاری کے طور پر اور عمال سلطنت کی مداخلت بیجا کو روکنے کے لئے کی گئی تھی ' آگے چل کر علماء کی علمیت اور اعزاز کو بہت کچھہ نقصان پہنچایا —

عثمانی سلطنت کی مخصوص ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے اس کا اہم ترین طبقہ ' اور اس کی ساری قوت فوج تھی - اس زمانہ میں بھی جب کہ اس سلطنت کی حیثیت محض ایک دیہاتی جماعت کی سی تھی ' اس کا دار و مدار اپنے جاگیری نظام اور فوجی تنظیم پر تھا ' مغربی ملکوں کی طرح سے ' ترکی کے جاگیر داروں کے فرائض میں بھی فوجی خدمت داخل تھی - پندرہویں صدی کے اوائل میں ' اورخاں ' اور مراد نے جاگیرداروں کی متلون المزاجی سے محفوظ رہنے اور شورشوں کو فرو کرنے کے لئے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جس نے تھوڑی ہی مدت میں ترکوں کو دنیا کی بہتر سے بہتر جنگی دول کے دوش بدوش کھڑا کردیا ' انھوں نے ایک نئی فوج " ینی چری " بھرتی کی - عام روایت کے بموجب یہ سپاہ قلندروں کی جماعت بکتاشی سے بھرتی کی گئی ' لیکن زمانہ حال کی تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ بکتاشیوں کی جماعتیں جانثاریوں کی بارکوں میں سولہویں صدی میں داخل ہوئیں ' اور

وہ بھی اس خیال سے کہ ان پر الحاد کا جو شبہ کیا جاتا تھا، وہ مٹ جائے - جانثاری فوج، طبعاً اور اخلاقاً، ایک زبردست اور ناقابل تسخیر اور ہر حیثیت سے قابل اعتماد فوج تھی، اس میں زیادہ تر ایسے بد نصیب افراد شریک تھے، جنھیں بچپن ہی میں گھروں سے پکڑ کر ایسی جکڑ بند اور ایسے ماحول میں رکھا گیا تھا کہ ان کے دل والدین کی محبت یا حب وطن کے جذبات سے قطعاً نا آشنا تھے - انھیں صرف ایک ہی اخلاق کی تعلیم دی گئی تھی، یعنی آقا کی اطاعت، اور ان کے دل میں صرف ایک ہی امنگ اور آرزو تھی، یعنی ترقی پانا، اور روپیہ کمانا - ظاہر ہے کہ فتوحات ملکی کے لئے اس بے جگر گروہ سے زیادہ اور کون موزوں ہو سکتا تھا - یہ نئی فوج سات طبقوں پر مشتمل تھی جو سب کے سب محل شاہی کے غلام (قاپو قلعہ) تھے، بارکوں میں رہتے اور شاہی خزانہ سے مقررہ مشاہرہ اور روزانہ بھتا پاتے تھے - اس باقاعدہ فوج کا بہت بڑا حصہ پیدل سپاہ پر مشتمل تھا - اس کے ۱۹۶ دستے تھے اور ہر دستہ میں مختلف اوقات میں ۶۰ سے لیکر ۲۰۰۰ آدمی تک ہوتے تھے - 'محمد ثانی' کے زمانہ میں جانثاریوں کی جنگی جمعیت بارہ ہزار کی تھی، 'محمد ثالث' کے زمانہ میں چالیس ہزار اور 'سلیم ثالث' کے عہد میں ان کی تعداد ہر زمانہ سے زیادہ یعنی ایک لاکھ دس ہزار تھی - ہر دستہ کی وردی، اس کی مخصوص خدمت کے اعتبار سے الگ رنگ کی ہوتی تھی، اور ہر دستہ کا اپنا الگ معرکہ تھا، کسی کا معرکہ کنجی تھا، تو کسی کا مچھلی اور کسی کا جہاز کا لنگر - یہ معرکے ان کے اپنے جھنڈوں پر بنے رہتے اور اکثر سپاہیوں کے بازووں اور پنڈلیوں پر گودنے سے گدے ہوتے - ہر دستہ کے مغنی اس کے ساتھ رہتے، اور جانثاری افواج کے روایتی فوجی مراسم ہمیشہ پابندی

کے ساتھہ پورے کئے جاتے - 'اور خان' کے عہد میں ہر جا نثاری کی روز کی تنخواہ ایک اقچہ تھی' جس میں ایک ثلث درہم کے برابر چاندی ہوتی تھی- بعد کو روزانہ تنخواہ پانچ یا چھہ اقچہ ہو گئی تھی - اور خاص خاص افراد کو اگر کوئی کار نمایاں کریں تو آٹھہ اقچہ تک دئے جاتے تھے - بعد کو جب مالیات ملکی کی بد نظمی کی وجہ سے ' چاندی کے سکوں میں میل ہونے لگا اور ان کی قیمت میں فرق آگیا ' تو تنخواہ بھی بڑھا کر بیس اقچہ کردی گئی - اس تنخواہ کے علاوہ ' ہر دستے کو باقاعدہ روٹی ' روغن ' دال ' موم بتی اور وردی کی رسد ملا کرتی تھی - رسد کی تقسیم سہ ماہی ہوتی تھي اور ہر سہ ماہی کا نام اس کے مہینوں کے پہلے حروف ملا کر رکھا گیا تھا ' مثلاً "مصر" (محرم ' صفر ' ربیع الاول) ' " رجج (ربیع الآخر ' جمادی الاول ' جمادی الثانی) وغیرہ —

رسد کی تقسیم ایوان باب حکومت کے سامنے ہوتی تھی ' اور اس کے لئے منگل کا دن مقرر تھا - تمام دستے فوجی ترتیب کے ساتھہ آگے بڑھتے ' صدر اعظم اور اس کے مقربین کو آداب بجا لاتے ' اور پھر اپنے سردار کا اشارہ پاکر کھانے بیٹھہ جاتے - کھانے میں شوربہ ' چاول ' اور گوشت ہوتا ' جو محل سرا کے مطبخ میں پکایا جاتا - کھانے پر بیٹھنا گویا اس کی علامت تھا کہ وہ اپنے آقا کے نمک حلال ہیں - کھانے سے فراغت پاکر پھر سب ایوان کے سامنے جمع ہوتے ' یہاں ان کے کپتان دونوں ہاتھہ سینے پر باندھ کر " گلبانگ " (جانثاریوں کا نعرۂ جنگ) پڑھتے —

" لااله الاالله باش ہر یاں ' سینه پریاں "

" قیلیچ آل قان - ہو میدانده نیجه باشلر "

" کسیلیر ہیچ اولماں صوران - ایوالله "

" ایواللہ قہر مُز قیلیجمز دشمانہ زیاں - "
" قوللغمز باد شاہہ عیاں - اوچلر یدیلر "
" قیر قلر گلبانگ محمدی ' نور نبی کرم علی "
" پیرمز خدا وندکار مُز حاجی بکتا شی ولی "
" دمنہ ' دو راننہ هُو ' د یبہ لم هو ! "
(ترجمہ : لاالہ الاالله ' برهنہ سر اور سینہ صاف هوکر اے میری تلوار خون پی : یہاں هزاروں سر دهڑ سے جدا هوتے هیں'اور کوئی نہیں پوچھتا کہ کیوں ؛ والله ' باللہ هماری فوج اور هماری تلوار دشمنوں کے حق میں زیاں ہے - هم بادشاہ کے نمک خوار هیں' تین سات اور اکتالیس نعرہ لگاؤ نور نبی ' کرم علی اپنے پیر و مرشد حاجی بکتاش ولی کے لئے - نعرہ لگاؤ اس کے نام کے")

اس کے بعد ایک مقررہ اشارہ پاکر اپنی اپنی مقررہ جگہ کی طرف جھپٹ کر سکوں کی تھیلیاں اٹھا لیتے اور بارکوں میں جاکر انھیں تقسیم کرتے - پیستھویں دستے کو اس رسم میں شرکت کی اجازت نہ تھی ' اس لئے کہ ان پر شہزادہ عثمان کے قتل میں حصہ لینے کا شبہ تھا - چونکہ خود سلطان بھی جانثاریوں کے پہلے دستہ کا رکن سمجھا جاتا تھا ' اس لئے اس رسم کے چند روز بعد وہ جانثاری کی وردی پہن کر بارکوں میں جاتا اور تنخواہ لیتا تھا ' اور بارک کے دروازہ پر - گھوڑا ٹھیرا کر جانثاریوں کے افسر کا دیا هوا شربت کا پیالہ پیتا ' جس کا مطلب یہ هوتا کہ اسے ان کی وفاداری پر

پورا پورا اعتماد ہے —

اس مخصوص فوج میں کسی باہر والے کو، الا اس صورت کے جب کہ اس میں کوئی خاص خصوصیت ہو، شرکت کی اجازت نہ تھی۔ اگرچہ جانثاری افواج، اپنی ترکیب کے لحاظ سے مخلوط تھیں، لیکن ان کی حلقہ بندی اور رشتہ اتحاد مستحکم تھا، البتہ سولھویں صدی کے آخر میں وہ بازیگر اور مسخرے بھی، جو اپنے کرتبوں سے شاہی محفلوں میں سلطان کی خوشنودی حاصل کر لیتے، اس میں بھرتی کئے جانے لگے۔ اس کے بعد سے تو جانثاریوں کی بارکوں میں ہر قسم کے غیر معتبر بیرونی لوگ داخل ہونے لگے، جس نے اس فوج کی روایتی یک جہتی اور شیرازہ بندی کو صدمہ پہونچایا، اور ان کی جو خاص شان تھی اسے مٹا دیا۔ اب یہ لوگ شادیاں کرکے بارکوں کے باہر رہنے اور امن و امان کے زمانہ میں کوئی نہ کوئی کاروبار بھی کرنے لگے۔ غرض کہ وہی فوج جس کی بسالت اور ہیبت کی کسی زمانہ میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اب اس کی حیثیت صرف ایک شورش پسند اور شورہ پشت انبوہ کثیر کی سی ہو گئی، جس سے ملک کے امن و امان کے لئے اندیشہ پیدا ہو چلا۔ لڑائی کے کام کے تو یہ لوگ بالکل رہے ہی نہیں، اور جب کئی مرتبہ ان کی جدید تنظیم کی کوشش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی تو آخر کار سنہ ۱۸۲۶ م میں اس فوج کو بالکل ہی توڑ ڈالا گیا —

مذکورہ بالا باقاعدہ اور مستقل افواج کے علاوہ، جاگیری امرا، "تمار" "زیامت" اور "خاص" کی اپنی اپنی منتظم فوجیں بھی تھیں، اور ان میں سے ہر ایک اپنی جاگیر کے شایان شان مسلح اور تربیت یافتہ سپاہ، پیدل اور سوار، معسکر سلطانی کو بھیجتا تھا۔ اپنے زمانۂ عروج میں، سلطنت عثمانی، بے خرخشہ اور صرف ایک لاکھ چالیس ہزار سوار میدان جنگ

میں لا سکتی تھی - نپولین کی جنگوں کے زمانہ تک یورپ کی کوئی سلطنت اتنا ٹڈی دل لشکر جمع نہ کر سکتی تھی - امرا کو جاگیریں خدمات سلطانی کے صلے کے طور پر عطا ہوتی تھیں، جن میں سے بعض تو حین حیات کے لئے ہوتیں' اور بعض ہمیشہ کے لئے اور موروثی - یورپ میں تو جاگیری نظام اپنے غیر منفک موروثی حقوق کی وجہ سے مرکزی حکومت کے لئے خطرناک بن گیا تھا' لیکن ترکی کے امرا اور جاگیردار ہمیشہ اپنے بادشاہ کے پابند اور ماتحت رہا کرتے تھے - لیکن عثمانی سلطنت کو اپنے جاگیری نظام کی وجہ سے جو قوت حاصل ہوئی تھی' اس میں عام اخلاقی زوال اور بد ضبطی کی وجہ سے ضعف پیدا ہو گیا - بیگمات کے اثر اور رسوخ کی وجہ سے اکثر غیر مستحق لوگوں کو جاگیریں ملنے لگیں اور اکثر امرا اپنی جاگیروں سے دور بیٹھکر مزے کرنے لگے - جاگیروں کو پٹہ پر دینے کا دستور عام ہو گیا' اور اس نے اکثر جاگیرداروں کو تباہ کر دیا - کھیتوں سے کمال بے پروائی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انتفاع کیاجانے لگا' نتیجہ یہ ہوا کہ اراضی بنجر اور مردہ ہو گئی اور سارے ملک میں غلہ کی قلت ہو گئی - ترکی فوج کا بیشتر حصہ جانثاری اور جاگیری سپاہ پر مشتمل تھا - طلایہ یا دوسری معمولی خدمات کے لئے بے قاعدہ اور عارضی سپاہ استعمال کی جاتی تھی' ان کے پاس بندوقیں ہوتی تھیں' یا پھر سرنگیں بچھانے یا لشکر گاہ یا قلعوں میں خندقیں کھودنے کا کام ان کے تفویض ہوتا تھا - چونکہ بلقان کے مفتوحہ علاقوں کو بھی امدادی فوجیں بھیجنی پڑتی تھیں' اس لئے ان میں سے اکثر عیسائی ہوتے تھے -

چونکہ سولھویں صدی میں سارا " بحرقلزم " ترکوں ھی کے زیر اثر تھا' اس لئے ان میں بحری فاتحین اور امیرالبحروں کا بھی ایک لا جواب جھگڑا پیدا ہوا' مثلاً " خیر الدین بار بروسا " اور اس کا بیٹا " حسن " ' پیالہ تورغد'

' صالم رئیس ' اور ' پیری رئیس ' سب سے پہلا جہازی کارخانہ (ترسانہ) ' گیلی پولی ' میں کھولا گیا تھا ' جو ' سلیمان ' کے عہد میں ' شاخ زرین ' کو منتقل کر دیا گیا - ' قاپودان پاشا ' یعنی امیرالبحر کا منصب صدراعظم کے بعد ھی ھوتا تھا - ترکی کے تمام بحری افسر اور ملاح عیسائی والدین کی اولاد تھے - یہ تو ھر شخص جانتا ھے کہ ان لوگوں نے اپنے بہادرانہ کارناموں سے یورپ کو کس قدر سراسیمہ کر دیا تھا ' لیکن اس کے علاوہ ان میں بعض بہت قابل ھوئے ھیں اور سائنس داں مصنفین کی حیثیت سے بھی مشہور ھیں' مثلاًپیری رئیس نے بحیرہ ایجین اور بحیرہ روم کا ایک بحری نقشہ (بحریہ) تیار کیا تھا - وہ ان دونوں سمندروں کا چپہ چپہ چھانے ھوا تھا' اور اپنے نقشہ میں اس نے بحری رووں' مختلف مقامات کی گہرائیوں' اترنے کی جگہوں اور بندرگاھوں کے متعلق جملہ معلومات فراھم کی ھیں - اسی طرح سے ایک اور علمی ذوق رکھنے والا امیر البحر سیدی علی تھا' جس کا جہاز باد مخالف کی وجہ سے ھندوستان کے ساحل پر آن لگا تھا' وہ خشکی کے راستہ' یعنی سندھ' خراسان' بلوچستان اور ایران ھوتا ھوا ترکی واپس گیا تھا - اس نے اپنے اس رسالہ سفر کی واردات لکھی ھے اور ساتھہ ھی اصطرلاب کے استعمال پر ایک ھندسہ کی کتاب' اور ھندوستان کے سمندروں پر ایک کتاب " محیط" کا مصنف بھی ھے —

ترکی نے اپنے اعلیٰ درجہ کے منظم جہازی کارخانوں کی مدد سے ایک ایسا بیڑا تیار کرلیا تھا جس میں ھر خدمت کے لئے خاص طور پر تربیت یافتہ ملاح اور سپاھی' مامور تھے' ان کی ایک جماعت کو جاگیری حقیت اراضی کے طریقہ کی رو سے بحری خدمات انجام دینی پڑتی تھیں - غلاموں' قیدیوں اور سزا یافتہ مجرموں سے جہازوں کی مرمت اور دیکھہ بھال کا کام لیا جاتا تھا' اور ان سے غلاموں کا سا سلوک کیا جاتا تھا - دوسری اقوام کی فوجوں کے بر خلاف' ترکی

فوج کی وردیاں شوخ رنگ کی ہوا کرتی تھیں - چونکہ اس زمانہ میں لڑائیاں دست بدست ہوا کرتی تھیں' اس لئے خاکی وردی سے غنیم کو دھوکا دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی - وردی میں سر کا لباس خاص طور پر نمایاں ہوتا تھا۔ شلواریں' جن کی پنڈلیوں کے اوپر مختلف رنگوں کے تسمے بندھے رہتے تھے اور بے ایڑی کے پنڈلیوں تک کے جوتے جن کے ادھر ادھر بٹن ٹکے رہتے تھے - ان سے لمبے دھاوے مارنے میں سہولت ہوتی تھی - کوچ کی حالت میں لبادے کے دامن کمر پیٹی میں اٹکا لئے جاتے تھے تاکہ چلنے میں آسانی ہو—

عثمانیوں کے اسلحہ میں ایشیائی اسلحہ جیسے گرز' بسولے' تلواریں اور یورپی آتشیں اسلحہ دونوں مستعمل تھے - آتشیں اسلحہ میں سب سے پہلے توپوں کا استعمال شروع ہوا - اس کے بعد رائفلیں' جن کو سب سے پہلے جنگ کوسوو (Kossowo) سنہ ۱۳۸۹ ع میں استعمال کیا گیا تھا - لیکن عثمانی' جو اپنی فوج کی اصلاح کے لئے غیر ملکیوں کو ملازم رکھتے تھے' بھاری بھاری توپیں ڈھالنے میں اپنے دشمنوں سے بہت آگے تھے سوار فوج کے حملہ کی مدافعت کے لئے وہ گھومنے والی توپیں اور ایک قسم کی مشین گنیں استعمال کرتے تھے —

جب اعلان جنگ ہوتا' تو مختلف پلٹنیں مقررہ مقامات پر جمع ہوتیں۔ مغرب کی طرف جو لڑائیاں ہوتیں' ان کے لئے کوچ کا راستہ ادرنہ' سوفیا' نش اور بلغراد تھا - روس کی طرف ادرنہ' سوفیا' بداداغی' عراقچی اور دریاے نیس تر (Dniester) کے کنارے کنارے کوچ کیا جاتا - فوج کے لئے غلہ اور رسد کے ذخائر مہیا کرنے کے لئے بعض شاہراہوں کو اختیار کیا جاتا - ان سب راستوں کے پہلے ہی سے متعین ہونے کی وجہ سے اس کا اندازہ ہوجاتا تھا کہ معرکہ کہاں ہوگا'

یہ میدان جنگ عموماً ایسے وسیع میدان ہوا کرتے تھے جن کے چاروں طرف پہاڑیاں ہوتیں اور ہر فریق ان پر پہلے قابض ہونے کی کوشش کرتا تھا - ترکی فوجیں زمین پر لیٹ کر پیٹ کے بل چلتی تھیں اور اس لئے انھیں بعض مقررہ راستوں پر رہنا پڑتا تھا - جب فوج جنگ کے لئے روانہ ہوتی تو اس کے ساتھ رسد پہونچانے والوں، مزدوروں، مغنیوں اور بازیگروں کا ایک جم غفیر ہوتا تھا - ترکی لشکر گاہ میں عجب رونق اور چہل پہل ہوتی تھی - دنیا کے ہر حصہ کی نسلیں اور لباس وہاں نظر آتے، اور ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کسی مشرقی شہر کا سارا بازار اپنے طرح طرح کے سامان اور تماشوں کے ساتھ، فوج کے ہمراہ جارہا ہے- مشرق نے بلقان کے راستہ سے وی اینا (Vienna) کے کئی چکر اس طرح لگائے ہیں —

ترکوں کے حربی اصول، قدرتی طور پر، ان کے مخصوص فوجی نظام پر مبنی ہوتے تھے، اور ابھی زمانۂ حال تک ان میں وسط ایشیا کے میدانوں کی زندگی کے چربے نظر آتے تھے - شروع شروع میں تورانی اقوام نے قدیم ایرانیوں سے، جنھوں نے پیادہ اور سوار فوج میں اتحاد عمل کا ایک مخصوص طریقہ نکالا تھا، یہ حربی اصول سیکھا تھا کہ فوجوں کو کھڑی قطاروں کی بجائے صف میں پھیلا دیا جائے- ترکوں کی صف بندی اس طریقہ پر ہوتی کہ قلب میں تو پیدل سپاہ کا ایک مستحکم مرکز ہوتا جس کے آگے توپخانہ ہوتا اور میمنہ اور میسرہ میں سواروں کے دستے رکھے جاتے - لڑائی اس طرح شروع ہوتی کہ پہلے سامنے کی طرف سے بے قاعدہ رسالہ (آقنجی) چھاپے مارنا شروع کرتا، اور پھر جنگ مغلوبہ کے اصول پر اپنے کو شکست خوردہ ظاہر کرکے بے تحاشا بھاگتا - غنیم زعم میں آکر اس کا تعاقب کرتا، یہاں تک کہ توپخانہ کے اہم دائرہ کی زد میں آجاتا، اب بے قاعدہ سواروں کے دستے (جنھوں نے چھاپہ مارا تھا) تو دائیں بائیں پھیل جاتے اور دفعتاً توپخانہ غنیم پر باڑھیں مارنا شروع کرتا - ساتھ ہی میمنہ اور میسرہ کے رسالے کے دستے چکر کاٹ کر اسے منتشر کردیتے اور دوسری طرف سے جانباز

جانثاری پیدل فوج شکست خوردہ غنیم پر ٹوٹ کر اور تعاقب کرکے ان کا کام تمام کردیتی - اگر یہ حربی چالیں کارگر ہوتیں' تو پوری طرح سے فتح حاصل ہو تی اور میدان جنگ ہی میں غنیم کا کام تمام ہو جاتا - ترکوں نے اس طرح سے ایک ایک معرکہ میں سلطنتوں کی قسمت کے فیصلے کردئے ہیں - ترک پیدائشی سپاہی ہیں' اور جب انیسویں صدی میں یورپی تہذیب نے لمبی مار کے آتشیں اسلحہ تیار کئے اور پرانی حربی چالیں بے کار ہوگئیں' تو ترکوں نے نئے اصولوں کو بھی نہایت مستعدی کے ساتھ سیکھ لیا' اور ان میں بھی اگر دوسری قوموں کے آگے نہیں' تو کم از کم ان کے برابر وہ ضرور ہوگئے - ترک ہی اسلام کے بہترین مجاہد اور مبارز ہیں' اور ان میں آج بھی اعلیٰ درجہ کی خدا داد فوجی قابلیت رکھنے والے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں —

عثمانی سلطنت کا اگر کوئی کمزور ترین رخ تھا' تو وہ مالیات کا انتظام تھا' گویا کہ فطرت کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ سپاہی اقتصادیات سے بے بہرہ ہو' وہ کبھی سلطنت کے محاصل اور مخارج کی میزان برابر نہ کر سکے - ان کے یہاں کوئی باضابطہ میزانیہ تیار نہیں کیا جاتا تھا' اور سلطان کی طبیعت کی لہر مالیات کی مستحکم ترین بنیادوں کو متزلزل کردیتی تھی - شریعت اسلامی کے بموجب ریاست کی آمدنی کی مدیں عشر' نمک کے محصول' جزیہ' مفتوحہ یا ماتحت دول کے خراج اور مال غنیمت کا خمس ہوتی تھیں' سلطنت کے عروج کے زمانہ میں محاصل مخارج سے کہیں زیادہ ہوا کرتے تھے' اس کے بعد یہ دستور ہو گیا کہ ہر سلطان تخت نشینی کے وقت جانثاری فوجوں کو بڑی بڑی رقمیں تقسیم کرنے لگا اور حرم سرا کے اخراجات بے تکان بڑھنے لگے - آمد و خرچ کا کھاتہ رکھنے کا تو کوئی طریقہ تھا ہی نہیں' صوبجات کا پیسہ پیسہ کھینچ لیا گیا اور

وہ مفلس ہو گئے، اور جب نیا دور تمدن شروع ہوا تو چونکہ ترکی زراعتی ملک تھا، اس لئے اسے اپنی مصنوعات باہر والوں سے خریدنی پڑیں۔ اگرچہ 'سلیمان' "ذی شان" کے زمانہ میں ترکی اوج کمال پر تھا، لیکن مالی مشکلات اسی زمانہ میں شروع ہو گئی تھیں۔ جاگیری حقیت کو وقف میں منتقل کر دیا گیا تھا اور زمین کو پٹہ پر دینے کا طریقہ شروع کر دیا گیا تھا۔ باضابطہ میزانیہ تیار کرنے کی کوشش پہلی مرتبہ سنہ ۱۶۰۹ ع میں کی گئی، پھر سنہ ۱۶۵۳ ع میں اور اس کے بعد سنہ ۱۶۶۰ ع میں —

اس زمانہ میں دو 'قوپ رولو' * کے حسن انتظام سے مالیہ کی حالت کچھ سنبھلی، میزانیہ شکل سنہ ۱۸۶۲ ع تک رہی رہی، اس سال البتہ 'فواد پاشا' نے ملک کی مالی حالت کے متعلق جو رپورٹ پیش کی، اس کے ساتھ ایک باضابطہ میزانیہ بھی شریک کیا۔ یہ میزانئے کبھی صحیح نہیں ہوتے تھے اور کم عیار سکوں کی گردش اور سرکاری طور پر ضبطی جائداد کی کارروائیوں نے حکومت پر سے رعایا کا اعتبار بالکل اٹھا لیا تھا۔

لیکن جب ہم ترکوں کے علوم و فنون اور خالص اسلامی تہذیب کی ترقی میں ان کا جو کچھ حصہ تھا، اس پر نظر ڈالتے ہیں، تو مذکورہ بالا ابتری کی کسی قدر تلافی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ترکوں کی طبیعت میں، کسی طرح کی جدت طرازی نہ تھی، تاہم ماننا پڑتا ہے کہ وہ ہمیشہ علم کے شیدائی اور دوسری اقوام کے ہونہار شاگرد رہے ہیں۔ ترکی علماء عجمی اور عربی تمدن پر گہری نظر رکھتے تھے، اور چونکہ

---

* یعنی ایک تو 'قوپرولی محمد' جو سنہ ۱۶۵۶ ع میں صدر اعظم ہوا تھا، اور دوسرا اس کا بیٹا 'قوپرولی زادہ احمد' جو سنہ ۱۶۶۱ ع میں وزیر ہوا۔ یہ دونوں البانی الاصل تھے۔ ۱۲ — مترجم

ازمنہ وسطیٰ میں علم کا مطلب ہی "علم دین" ہوتا تھا، اس لئے اسلامی دینیات کے مطالعہ کا شوق بہت جلد ترکوں میں پیدا ہو گیا - ان کے ابتدائی زمانہ کے سلاطین مسجدیں اور ان کے قریب مدرسہ تعمیر کراتے تھے، جہاں ستونوں کے سامنے زمین پر دو زانو بیٹھکر، ترکی شاگرد عربی کا نصاب پڑھا کرتے تھے - جنھیں اعلیٰ تر تعلیم مطلوب ہوتی وہ 'مصر' کے مشہور زمانہ مدارس میں جا کر تعلیم حاصل کرتے تھے - جس طرح سے اس زمانہ میں یورپ میں درس و تدریس لاطینی میں ہوتی تھی، اسی طرح ممالک اسلامی کی علمی زبان عربی تھی، اس کی وجہ سے مختلف تمدنوں کے درمیان ایک طرح کا بین الاقوامی رشتہ اتحاد پیدا ہو جاتا تھا، جو آج کل اس وجہ سے نہیں پیدا ہوتا کہ "قومی زبان" کے شوق نے ہر ایک کی حد الگ الگ کردی ہے - شروع زمانہ کے ترکی علماء میں 'شیخ اودے بلی' جو سلطان 'عثمان' کا خسر تھا، 'درسون فاقی'، 'چندرالی قارا خلیل' وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس کے بعد 'ازنک' کے مدرسہ نے شہرت حاصل کی، جو سلطان 'اور خان' کا قائم کیا ہوا تھا - ادرنہ اور 'قسطنطنیہ' کی تسخیر کے بعد مختلف سلاطین نے ان دونوں مقامات میں لا جواب مسجدیں اور مدرسے بنائے، جن میں 'ادرنہ' میں سلیم کے بنائے ہوے مدرسہ کو اور 'قسطنطنیہ' کے مدرسہ 'سلیمانی' کو خصوصیت کے ساتھہ علمی مرجعیت حاصل تھی، اور دور دور کے طلبہ وہاں تحصیل علم کے لئے آتے تھے - اساتذہ میں 'عسکرے لی جمال الدین' اور 'سعدالدین تفتازانی' بہت مشہور تھے، جن کی تفاسیر آج تک اسلامی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں - 'شیخ بدرالدین' نے تصوف پر کئی قابل قدر کتابیں تصنیف کیں، وہ اپنے ہم عصروں میں اپنے آزادانہ فلسفیانہ رجحانات و خیالات کی وجہ سے ممتاز ہیں - 'محمد فاتح' کے عہد

میں ' ملا خسرو ' نے کتب فقہ کے مصنف کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی -
فقہ میں ان کی کتاب " غرر " اور اس کی شرح " درر " بہت معروف
ھے - " سلیم اول " کے زمانہ میں " زمبلی علی جمالی " اور مفتی اعظم
" کمال پاشا زادہ " علم و فضل کا مرجع تھے اور علماء جوق جوق آکر
ان کے آگے زانوے شاگردی تہ کرتے تھے - اسی طرح " سلطان سلیمان " کا
عہد بھی " ابو سعود آفندی " اور " ابن کمال " جیسے صاحبان علم و فضل
پر بجا طور پر فخر کرسکتا ھے - " ابن کمال " نے تفسیر اور کمالیات
میں خاص شہرت حاصل کی تھی ' انھوں نے تاریخ پر بھی قلم اٹھایا ھے
اور شاعر بھی تھے - ان کی ذات جامع العلوم تھی اور وہ اپنے زمانہ
کے بزرگ ترین عالم سمجھے جاتے تھے - " ابن سعود " اپنے زمانہ
میں شریعت کے سب سے بڑے عالم تھے اور اسی حیثیت سے معروف
ھیں - عربی میں انھوں نے وہ زور قلم پیدا کیا تھا کہ کوئی اور
ترک ان کی برابری نہ کرسکتا تھا - یہ دونوں علماء یعنی ' ابوسعود ' اور
' ابن کمال ' آج تک بزم علم و فضل کے مسند نشیں ھیں - عثمانی سلطنت کے زوال کے
ساتھہ ساتھہ ترکوں کے قواے روحانیہ میں بھی انحطاط نمودار ھوگیا ' اور اگرچہ ابھی
کچھہ زمانہ اُدھر تک ترکی کے مدارس میں ' کمالیات ' کا چرچا تھا ' لیکن فکر وخیال
کی کوئی جدت ' یا فلسفہ ' کے میدان میں کوئی تازہ خیالی ھمیں نظر نہیں آتی -
دینیات اور فلسفہ کی ترقی آج بالکل رک گئی ھے —

سائنس کے شعبہ میں ' ترکوں نے سب سے پہلے فن طب میں ترقی کی -
قاموس المشاھیر میں ھزاروں نام ترکی النسل اطباء کے نظر آتے ھیں - سنگی تعمیر کا
سب سے پہلا شفاخانہ ' برو سامیں ' بایزید ' نے سنہ ۱۴۰۱ ع میں بنوایا تھا - اس کے
ساتھہ ایک مطب بھی تھا - ' مدرسہ سلیمانی ' اور مدرسہ مسجد فاتح '

میں بھی طب ونانی کی تحصیل ذوق و شوق سے کی جاتی تھی یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اگرچہ علوم دینیہ و فلسفہ کی تحصیل کا ذریعہ عربی زبان ہی تھی ' لیکن کتب طب ترکی زبان میں لکھی جاتی تھیں - ترکوں نے دماغی امراض ' اور ارثی بیماریوں کے قوانین کی دریافت اور تحقیق کرکے فن طب کی خاص خدمت کی ہے - ان کے مشہور اطباء میں سے اسحاق اور حاجی پاشا (جنھوں نے بعض بلند پایہ علمی رسالے لکھے) " بایزید " کے زمانہ میں ہوے - اور محمد ' فاتح ' کے عہد میں ' التنجی زادہ ' ' خاویجی زادہ '' احمد' ' علی احمد چلبی ' ' وسیم عباس ' و غیر ہم مشہور ہوے - فن جراحی میں ' خصوصاً کحل کی حیثیت سے ان لوگوں کی شہرت وسطی یورپ تک پہونچی ہوی تھی - دینیات اور طب کے علاوہ ' وقائع نویسی اور فن تاریخ میں بھی ترکی نے خاص مرتبہ پیدا کیا تھا - یہ صحیح ہے کہ ترکوں کے شعری سرمایہ کے مقابلہ میں ان کا سرمایۂ نثر نظر میں نہیں ' جچتا ' لیکن جہاں تک نثر کا تعلق ہے ان کا تاریخی سرمایہ ہی بہترین اور علمی حیثیت سے سب سے زیادہ قابل قدر ہے - شروع میں وہ ایرانی طرز تاریخ نویسی کی تقلید کرتے تھے ' لیکن بعد میں لفاظی اور عبارت آرائی کا شوق پیدا ہوگیا ' اور حسن الفاظ حجاب معنی بن گیا - یہ عیب آج تک باقی ہے - سلاطین بھی وقائع نویسی کی قدردانی کرتے تھے ' اس لئے کہ اس سے ان کے کار ناموں کو حیات جارید ملتی تھی ' اور اگرچہ اکثر ترکی تاریخیں اسی یک طرفہ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں ' لیکن اگر ان کے متن کی تحقیق اور تنقید کی جاے تو آج بھی ان سے بہت قابل قدر معلومات حاصل ہوسکتی ہے —

'عاشق پاشا زادہ' سب سے پہلا ترکی مورخ تھا - وہ 'با یزید ثانی' کے عہد میں

گزرا ہے' اور اپنے ہم عصر "نشری' کی "جہاں نما" کی طرح' اس کی تصانیف میں بھی ترکوں کی لڑائیوں کا حال نہایت سلیس اور صاف زبان میں بیان کیا گیا ہے ۔ ' ادریس بطلیسی ' نے بھی ' ھشت بہشت ' کے عنواں سے فارسی میں ایک تاریخ لکھی ہے ' جس میں ادبی رنگ موجود ہے - پندرویں اور سولھویں صدی عیسوی کے ترکی مورخین نے فتح ' قسطنطنیہ سے پہلے کے جو حالات لکھے ہیں ' وہ دشمانی شاھنشاھیت کے نقطہ نظر سے لکھے ہیں ' وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ترکوں کی ابتدا ایک دیہاتی جماعت سے ھوئی تھی ' اور وہ اناطولیہ میں اپنے حریفوں کو صرف اس وقت زیر کر سکے تھے جب " قسطنطنیہ " کی فتح کے بعد ان کا شمار دول عالم میں ھونے لگا تھا - " سلیمان" کے زمانے سے ھمیں ترکی تاریخوں میں مقفی عبارت نظر آتی ہے ' جس سے ان کا مطلب مبہم ھو جاتا ہے - ان میں سے اکثر تو نرے قصیدے ھیں - سرکاری وقائع نویسوں کا سلسلہ " خوجہ سعدالدین صاحب تاج التواریخ" سے شروع ھوتا ہے ' انھوں نے " سلیم ثانی" کے عہد کی تاریخ لکھی ہے ' لیکن ان کا طرز تحریر نہایت مغلق اور بھونڈا ہے - ترکی تاریخوں میں نائمہ کی کتاب سب سے زیادہ مستند ہے ' اگرچہ اس کا طرز بیان بھی عیب سے خالی نہیں - دوسرے مورخین ' رشید محمد ' ' اسمعیل عاصم ' ' عزی سلیمان ' ' واصف احمد ' ' پچوی ' ' سلانیک لی مصطفی ' " علی آفندی ' ' کاتب چلپی ' ' اور منجم باشی ' گزرے ھیں - ان سب نے تاریخ ترکی کے انقلاب آفریں واقعات پر نظر ڈالی ہے - ان کی جامع اور مبسوط تاریخوں کے علاوہ ' سیرت ' ادبیات ' حرم سرا کی زندگی وغیرہ پر علحدہ علحدہ رسائل بھی موجود ھیں ' مثلاً مصطفی پاشا کی ' نتائج الوقوعات ' ' عطا بے ' کی ' اندرون تاریخی ' ' علی آفندی ' کی ' مناقب ھنروران ' وغیرہ ' نتائج الوقوعات

میں صرف واقعہ نگاری ہی پر اکتفا نہیں کی گئی ہے بلکہ سلطنت کے نظم ونسق کی تصویر بھی کھینچی گئی ہے - ' اندرون تاریخی ' حرم سرا کی زندگی کا سچا خاکہ ہے ' اگرچہ اس کے طرز تحریر میں تصنع بہت زیادہ ہے - اور اکثر مقامات پر تو ادبیات کے درجہ سے گر کر اس کی حیثیت صرف تک بندی کی سی رہ جاتی ہے قوچی بے کی تاریخی اور نقادانہ تصنیف میں زوال سلطنت عثمانی کے اسباب نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں —

اس مختصر تبصرے میں ترکی جغرافیہ دانوں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہو گا - حدود سلطنت کی وسعت خود جغرافیہ دانی اور جغرافی معلومات کی محرک تھی - اور سولہویں صدی کے بعد سے ہمیں ترکی زبان میں متعدد کتابیں جغرافیہ اور فن جہاز رانی پر نظر آتی ہیں - ان مصنفوں کے علاوہ جن کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے ' ' سپاہ زادہ محمد ' اور " امیر محمد ابن حسن " نے سولہویں صدی میں امریکہ کے حالات پہلی مرتبہ ترکی زبان میں لکھے ہیں -

لیکن جو شخص بلاتفاق رائے ترکی کے باکمالوں کی بزم کا صدر ہے ' وہ ' کیاتب چلبی ' المعروف به ' حاجی خلیفه ہے ' جس نے ' کشف الظنون ' کے عنوان سے ایک قاموس لکھی ہے - اس کے علاوہ فن جغرافیہ پر ایک کتاب ' جہاں نما ' بھی اسی کی تصنیف ہے - اطلاس خورد (Atlas minor) کا ترکی ترجمہ بھی اس نے کیا ہے ' نیز بحری جنگ پر کئی تالیفوں کا سہرا بھی اس کے سر ہے - ' رئیف محمد ' نے سلیم کے عہد میں (سنه ۱۷۸۹ ع - سنه ۱۸۰۷ ع) انگریزی زبان میں ایک جغرافیہ کی کتاب لکھی اور ایک اطلس (Atlas) مرتب کیا تھا —

ترکی ادبیات شروع ہی سے ترکی قوم کی دورخی زندگی کا عکس رہی ہے - حکمران اور تعلیم یافتہ طبقہ کو جمہور کی سادہ اور صاف زبان سے

نفرت تھی، اس لئے رفتہ رفتہ ایک مصنوعی زبان پیدا ہو گئی، جس میں فارسی اور عربی کے لغات کی اتنی بھرمار تھی کہ اس کا سمجھنا عوام کی قدرت سے باہر تھا - عثمانیوں کی نظر میں ادبیات کی اصطلاح سے یہی بھرتی کا اور مصنوعی طرز تحریر مراد لیا جاتا تھا جس میں فارسی کی بہت زیادہ تقلید کی جاتی تھی، اور عوام کے جذبات کا سچا اظہار اگر کہیں نظر آتا تھا، تو اوریون یا " مدہ " کی کہانیوں میں، یا پھر " اوتا اوا ے نو " کے سوانگ میں، جو اس میں شک نہیں کہ بازنطینی سوانگوں سے ماخوذ تھا، لیکن ترکی جمہور کی زندگی اور ذھنیت کا سچا خاکہ تھا - چین سے کٹھ پتلیوں کا ناچ ایشیا ھوتا ھوا ترکی بھی پہونچ گیا تھا، اور اپنی اسلامی شکل میں بہت مقبول ھوتا تھا - تاریک راتوں میں، باغوں کی بھینی بھینی خوشبوؤں، حقہ کی گڑگڑاھٹ اور اعلیٰ سے اعلیٰ ترکی قہوہ کی سوندھی خوشبو کا مزہ لیتے ھوے، لوگ " مدہ " کی باتوں کو بڑے شوق سے سنتے اور اس کے ھاتھوں کے کرتب سے، نیز اس کی دلچسپ یا مضحک کہانیوں سے بہت کچھہ لطف اندوز ھوتے تھے - حرم سرا کی خواتین چو بولے بناتیں اور تہوار کے موقعوں پر مذاقیہ طرز میں انھیں پڑھتیں - پرانی ترکی بحروں کے عام پسند گیت بھی صدیوں تک لوگوں کے دماغوں میں محفوظ اور زبانوں پر چڑھے رھے، اور بعض حلقے، مثلاً لیسویون یا بکتاشیوں کے، اپنے پر معنے گیت ترکی زبان میں بناتے تھے —

لیکن ان چند باقیات کو چھوڑ کر، تعلیم یافتہ ترکی طبقہ کی ادبیات عروض اور جذبات دونوں حیثیتوں سے غیر ملکی تھی - جیسے جیسے جمہور کی سیاسی اھمیت بڑھتی گئی اور وہ اپنے حقوق کے لئے جد و جہد کرنے

لگے ' ویسے ویسے ' ادبیات نے بھی آھستہ آھستہ عوام کے جذبات کا رنگ قبول کیا - ترکی سر زمین پر سب سے پہلے ' اور سب سے بہتر تصنیف جو ادبیات پر ھوئی وہ " جلال الدین " رومی رح کی فارسی مثنوی تھی ' جس کے صرف دو ترکی شعر شاعر کی ترکی قومیت کا پتہ دیتے ھیں - ان کے فرزند " سلطان ولید " ترکی میں شعر کہتے تھے ' لیکن عروض عجمی تھی - سلطنت عثمانیہ کے قیام و استحکام کے بعد ' " عاشق پاشا " نے " غریب نامہ " اور " سلیمان چلبی " نے " مولودی " خالص ترکی زبان میں لکھے ' لیکن فارسی ادبیات نے بہت جلد ان سر سری کوششوں پر غلبہ پالیا ' اور " سلطان محمد فاتح " ھی کے عہد میں ھم ترکی زبان کو مفرس اور ترکی ادبیات کو فارسی اصل کی نقل پاتے ھیں - بحیثیت مجموعی یہہ کہا جاسکتا ھے کہ افق ایران پر جب کبھی کوئی درخشاں ستارہ طلوع ھوا تو اس کی کرنیں ترکی ادبیات پر ضرور پڑیں - مدرسوں کی عربی تعلیم کا اثر بھی تعلیم یافتہ طبقہ کے ادبی ذوق پر بہت کچھ پڑا - ترکی ادبیات گویا مسلم ایران کے خیالات کا ذخیرہ ھے - حرمسرائے سلطانی میں ایک خاص قسم کی ادبیات پیدا ھوئی ' جس کا موضوع تمامتر تصوف تھا اور جس میں پروانہ کی داستان عشق و سوز بیان کی جاتی تھی - دیوان مرتب کرنے کا عام طور پر دستور تھا ' جن میں قصائد ' مدحیہ اشعار ' مناجات اور غزلیات ھوتی تھیں - " سلیمان ذی شان " کے عہد میں اس مذھب ادبیات کا سب سے پہلا اور مشہور نمائندہ " فضولی بغدادی " ھوا ' جس کی زبان اگرچہ غیر شستہ دیہاتی ترکی ھے ' لیکن اس کا دیوان اور " لیلی مجنوں " اس کے شاعرانہ کمال کا ثبوت ھیں " فضولی " سے زیادہ مشہور شاعر اور (وہ بھی صرف شستگی زبان کے اعتبار سے) " باقی " ھوا '

جس کا زمانہ سترھویں صدی کا ہے اور جسے ترکی غزل گو شعرا کا سر تاج کہا جاتا ہے ' لیکن جدت طبع کے اعتبار سے " فضولی " کا رتبہ " باقی " سے بڑھا ہوا ہے - " باقی " کے ہم عصروں میں حسب ذیل مشہور ہیں - " ذاتی " (صاحب " شمع و پروانہ ") " لامعی " " روحی " اور " یحییٰ بے " (صاحب " شاہ و گدا ") - ترکی ادبیات کا طرز اور عام مذاق ہوبہو ایرانی اصل کی نقل تھا - تقلید اور تصنع کا یہہ رجحان سترھویں صدی میں بہت زیادہ بڑھ گیا تھا - " نفعی " اور اس کے معاصرین صرف صنائع لفظی پر جان دیتے تھے اور جذبات نگاری کی مطلق فکر نہ کرتے تھے - خصوصاً " نرگسی ' نے تو اس بارہ میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ اس کا سارا کلام شاعری نہیں بلکہ محض رعایت لفظی ہے —

اٹھارویں صدی میں طرز ادا اتنا پیچ در پیچ ہوگیا تھا کہ بغیر مبسوط شرحوں کے شعر پڑھنا اور سمجھنا ممکن نہ تھا " ندیم " کا طرز ' جو غزل گو شعرا میں سب سے زیادہ رنگین بیان ہے ' البتہ کسي قدر صاف اور سادہ ہے - " راغب پاشا " فلسفیانہ شاعري کے نمائندے ہیں ' اور " فطنت خانم " اس عصر کے نسائی جذبات کي آئینہ دار ہیں - انیسویں صدی سے صاف اور سادہ شاعری کا دور شروع ہوتا ہے ' اور شیخ " غالب " (" محمد اسد ") کی مثنوی " حسن و عشق " اور ان کا دیوان متقدمین کی لفاظی اور لفظ بازیوں سے پاک نظر آتا ہے - دیوان مرتب کرنے کا مذاق بھی اسی زمانہ سے گھٹنا شروع ہوتا ہے ' اور " سنبل زادہ " - " وہبی " " سروری " اور " کے چی زادہ عزت ملا " اس رنگ کی ادبیات کے آخری نمائندہ ہیں - مصلح اعظم " سلطان محمود ثانی " کے زمانہ سے یہہ محسوس ہونا شروع ہوگیا کہ سلطنت عثمانی ' ذہني اور مادي دونوں حیثیتوں سے زوال پذیر ہوتي جارہي ہے -

هم دیکھتے هیں که اس زمانه کے مشہور مدبرین سلطنت ، مثلاً " پرتو " اور " عاکف پاشا " اور ان کے بعد ، " عبدالمجید " " رفعت " اور " رشید پاشا " سرکاری مراسلات کی مقفیٰ اور مرصع عبارتوں سے بہت بد دماغ هوتے تھے ، اور سلاست کی کوشش کرتے تھے - ادبیات میں بھی اسی قسم کا رجحان نظر آتا هے - ایک اور چیز جس نے ادبیات کے رخ اور مذاق کو دوسری طرف پھیر دیا ، ' یورپ ' کا اثر تھا ، جس کے ساتھه ترکوں کے براہ راست تعلقات ' نپولین ' کے زمانے سے پیدا هوچکے تھے - اس اثر سے ادبیات میں ایک امیدافزا نشاۃ ثانیه نمودار هوگئی -—

جیسا که میں اس سے پہلے عرض کرچکا هوں ، ترکوں میں قدرت کی طرف سے تقلید اور اخاذیت کا ایک عجیب و غریب ملکه ودیعت کیا گیا هے ، جس کی وجه سے وہ دوسری اقوام کی روح اور کارناموں کو اپنے اندر جذب کرکے ان سے اپنے حسب مطلب کام لے سکتے هیں - ترکوں کی اس اخاذیت کی عظیم ترین یادگار ان کا فن تعمیر هے - سلجوقی ترک ایران اور شام هوکر آے تو اپنے ساتھه ' اناطولیه میں عربی ' ایرانی طرز تعمیر بھی لاے اور یہاں بازنطینی طرز سے مدد لیکر اس میں مزید ترقی کی - ترکوں نے ان مختلف نمونوں اور طرزوں کی محض کورانه تقلید هی نہیں کی ، بلکه ان کی طباعی نے ان اجزا سے ایک مخصوص ترکی فن تعمیر پیدا کردیا ، جو بذات خود عربی ، ایرانی اور یونانی فن تعمیر کی تمام حسین اور دلکش خصوصیات اپنے اندر رکھتا هے —

ترکی فن تعمیر کی سب سے پہلی یادگاریں ' ازنک ' اور ' بروسا ' میں ملتی هیں جو هونہار سلطنت عثمانی کا پہلا دارالخلافه تھا - یه زیادہ تر سلجوقی طرز کی پبلک عمارتیں هیں ، مثلاً مسجد ، مدرسے ، مقبرے وغیرہ -

مسجدوں کی دیواروں اور گنبد میں سبز پتھر دیا گیا ہے ' جس کی وجہ سے وہ " اخضر " کہلاتی ہیں - سلجوقی تعمیر میں دروازوں پر کھدائی اور آرائش کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا - یاد رکھنا چاہئے کہ ایشیائے کوچک کی نسبتاً سرد آب و ہوا کی وجہ سے کھلے صحنوں میں محلے نہ بنائے جاسکتے تھے ' اس لئے بند دالانوں کی ضرورت پڑی اور دروازوں کی اہمیت زیادہ ہوگئی - مسجدوں کی دیواروں پر اعلیٰ درجے کے رنگین پتھر لگانے کا طریقہ ایرانی ہے اور ' بروسا ' اور ' ازنک ' کی مسجدوں میں بھی یہی استعمال کیاگیا ہے - مسجدوں کی مکانیت کسی قدر کم ہوتی تھی اور چھتیں بغیر ستون کے بنائی جاتی تھیں - چونکہ ترک بڑی جگہ کے اوپر ایک گنبد نہ بناسکتے تھے ' اس لئے انھوں نے گنبد کی تعداد زیادہ کرکے ان کا دور کم کردیا' لیکن چونکہ یہ سب گنبد ایک ہی سطح پر ہوتے تھے جس سے بلندی کا اندازہ نہ ہوتا تھا ' اس لئے بہت جلد یہ ترمیم کردی گئی کے بیچ کا گنبد ادھر ادھر کے گنبد سے اونچا بنایا جانے لگا —

ویسے تو بازنطینی طرز تعمیر کا اثر پہلے ہی سے بالواسطہ ترکوں پر پڑچکا تھا ' لیکن فتح ' قسطنطنیہ کے بعد وہ اور نمایاں ہوگیا - چونکہ سلطنت بہت وسیع تھی اس لئے پبلک عمارات کی تعمیر کے لئے روپیہ کی کمی نہ تھی ' اور پھر معاشرتی ضروریات کے روز افزوں اضافہ ' سے مسجدوں اور مقبروں کے علاوہ دوسری عمارتوں کی بھی ضرورت پڑی مثلاً کنوے ' کاروان سرائیں ' بازار ' محلات وغیرہ - ' اہا صوفیہ کا یونانی گرجا ترکی مساجد کے لئے نمونہ قرار پایا اور ' مسجد بایزید ' ' مسجد شہزادہ ' ' مسجد سلیمانی ' ' مسجد سلطان احمد ' اور ' یلی جامع ' سب اسی نمونہ پر بنائیں گئیں ۔ ان سب عمارتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ بیچ میں ایک بڑا بلند گنبد ہوتا ہے جس کے گردوپیش چھوٹے چھوٹے گنبد ہوتے ہیں اور یہ سب کے سب نہایت پائدار گول

ستونوں پر قائم ہوتے ہیں - دیواریں اتنی موٹی اور بھاری نہیں ہوتیں جتنی
کہ بازنطینی عمارتوں کی - محرابیں یا گول ہوتی تھیں یا نوکدار لیکن کشادہ
بہت ہوتی تھیں ستونوں کی کارنس پر خوشہ نما کام ہوتا تھا - اندرون مسجد
دالان در دالان ہوتے تھے اور اس کے پیچھے چھوٹی چھوٹی گمجیوں کے نیچے
' عمارت خانہ ' یعنی طالب علموں کے حجرے ہوتے تھے —

بازنطینی گرجوں کے سنہری بتوں اور مقدس تصویروں کی بجائے' مسجد
کی اندرونی دیواروں پر عربی عبارتیں اور چاروں خلفاء کے نام کندہ ہوتے تھے -
ایک ترمیم ترکوں نے ایسی کی جس سے بازنطینی طرز کی عمارتوں کا حسن
دو بالا ہوگیا' یعنی مینار کی تعمیر - عربی اور ایرانی طرز تعمیر میں میناروں
کی شکلیں مختلف ہیں' مگر ترکوں نے اس میں اس طرح سادگی کی شان
پیدا کی کہ انھوں نے چکنے' سڈول اور بلند مینار بنائے جن کی چھت بہت
سادہ ہوتی تھی' البتہ برآمدوں پر گندھے ہوئے ہاروں کی طرح نقش و
نگار بناکر ان کی شان دو بالا کردی جاتی تھی - جزیرہ نمائے ' استامبول '
کے اس حصہ پر جو آگے کی طرف نکلا ہوا ہے اور جو اپنے محل وقوع کے
اعتبار سے دنیا کی بہترین جگہوں میں ہے' ترکوں نے قدیمی بازنطینی محل
کے موقع پر ایک محل تعمیر کیا تھا - اس محل کی تاریخ خاصی طویل
ہے' اس لئے کہ ہر سلطان نے اس میں متعدد عمارات کا اضافہ کیا ہے -
اس کے سب سے زیادہ قابل توجہ حصوں میں ایک تو حرم ہے جس کی
دیواروں پر پتھر کا کام لاجواب ہے' اور دوسرا بغداد کوشک ہے جسے
' مراد چہارم ' نے دوبارہ بغداد فتح کرنے کے بعد تعمیر کیا تھا - ان عمارتوں
کے معمار زیادہ تر نو مسلم یونانی تھے - انھیں میں سے ایک مشہور معمار ' صنعان '
تھا جس کی تخلیقی قوت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنی عمر میں کم و بیش

آسی ۸۰ مشہور پبلک عمارتیں بنائیں!

دنیائے اسلام میں ایک جامع مسجد ایسی بھی ہے جس کے چھ مینار ہیں - اسے سلطان احمد نے ' مشہور تاریخی رومی میدان پر ' تھیوڈوسیس ' (Thodosius) کے مخروطی مینار (Obelisk) اور ' پلے ٹائیا ' (Plataia) کے میدان جنگ کے سامنے تعمیر کرایا تھا - اس کا معمار ' صنعان ' ہی کا ایک شاگرد ' محمد آغا ' تھا —

اٹھارویں صدی سے طرز تعمیر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے: اس زمانے میں چاہات اور محلات بکثرت تعمیر ہوئے 'لیکن ان میں سے اکثر یا تو نذر آتش ہوگئے' یا زلزلوں سے مسمار ہوگئے - 'احمد ثالث' کا بنوایا ہوا خوبصورت کنواں' اور مسجد نور عثمانی ' اور 'لالیلی جامع' جو دونوں حسین عمارتیں ہیں اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں -ان معماروں کے کام میں ہمیں یورپی طرز تعمیر کا 'جس کی خصوصیت یہ تھی کہ حد سے زیادہ نقش و نگار بنا دیے جاتے تھے — خفیف سا اثر نظر آتا ہے ' بعد کو نقش و نگار کی اس افراط ہی کی وجہ سے فن تعمیر میں زوال پیدا ہوگیا - انیسویں صدی کی عمارتیں تو بالکل ہی یورپی نمونوں کی نقل ہیں —

قسطنطنیہ' جس سے زیادہ خوبصورت موقع دنیا کے کسی اور شہر کو نصیب نہیں ہوا' بہت جلد 'شاخ زرین' کے دونوں کناروں پر پھیلنے اور بڑھنے لگا - لکڑی کی عمارتوں بننے لگیں جن کے منقش بالا خانے آگے کی طرف نکلے ہوتے تھے' اگرچہ یہ مکانات انسانی مسکن کی بجائے پرندوں کی کابکیں معلوم ہوتی تھیں' تاہم ان سے شہر میں ایک خاص شان اور بوقلمونی پیدا ہوگئی - جالی دار جھروکوں سے' جن کے پیچھے نازنینان حرم رہا کرتی تھیں' خاموش اور پر سکون گلیوں میں ایک خاص پر اسرار کیفیت پیدا ہوتی تھی - امرا کے 'قونق' (محل) میں تو خیر بیش بہا قالین اور آرائش کی چیزیں ہوتی ہی تھیں' لیکن غریب سے غریب ترک بھی اپنے گھر کو صاف ستھرا اور قالین کے فرش سے آراستہ رکھتا تھا —

ہر اسلامی ملک کی طرح، ترکی میں بھی خاندانی معاشرت کی یہ خصوصیت تھی کہ عورت اور مرد الگ الگ رہتے تھے - جب سلاطین کا اقتدار بہت بڑھ گیا تو امرا کے گھرانوں میں شادیاں کرنے کی بجاے وہ اکثر لونڈیوں کو اپنے حبالہ عقد میں لاتے تھے، اور ان سے اولادیں پیدا ہوتی تھیں - لیکن یہ رسم امراے سلطنت نے اختیار نہیں کی، وہ حسب دستور، شادی بیاہ کے قدیم طریقوں پر قائم رہے، اگرچہ غلاموں اور لونڈیوں کی کثیر تعداد کا رکھنا ان کے یہاں بھی فیشن میں داخل ہوگیا تھا —

ترکوں کی معاشرتی زندگی کے دو رخ ہوگئے تھے - مرد قہوہ خانوں میں بیٹھکر شعر شاعری یا قصہ خوانی سے اپنا دل بہلاتے تھے، عورتیں جمعہ کے روز کشتیوں میں بیٹھکر باغوں اور پھلواریوں میں تفریح کے لئے جایا کرتیں - شعر خوانی، موسیقی، اور ریشم اور سمور کے قیمتی لباسوں کی نمائش سے ان سیروں کا لطف اور دو بالا ہوجاتا تھا —

ترکی معاشرت کی اقتصادی بنیاد زمین اور اس کی پیداوار تھی - جاگیریں اسامیوں کو پٹہ پر دی جاتیں اور ان کی نگرانی بہت مشقت سے کی جاتی - یہی آبادی کی خوراک کا ذریعہ تھیں - زراعت کے علاوہ، صنعت و حرفت میں بھی، خصوصاً ایسی صنعتیں جن سے فوجی اغراض اور مشرقی زندگی کی ضروریات پوری ہوتیں، بہت جلد ترقی ہوئی، اور یہی شہری باشندوں کا وسیلہ معاش تھیں - ہر قسم کے صناعوں کی اپنی علحدہ علحدہ پنچائتیں تھیں، اور مختلف اہل حرفہ خود کو خاص خاص پیروں سے منسوب کرتے تھے - اولیاے چلبی نے جو سترویں صدی میں ترکوں کا سب سے بڑا سیاح ہوا ہے، پنچائتوں کے ایک جلوس کا نہایت مفصل حال لکھا ہے، اس میں ہمیں بعض ایسے پیشے بھی نظر آتے ہیں جو آج معدوم ہیں - بازار میں چمڑے، ٹین، تانبے، اون اور ریشم کا ہمہ قسم کا مشرقی سامان موجود رہتا، جو یا تو خود ترکی کا بنا ہوا ہوتا، یا پھر کاروانوں کے ذریعہ دنیا کے ہر

حصہ سے لایا جاتا - جنووا (Genoa) اور وینس (Venice) کے تجارتی بیڑے ایشیا اور یورپ کے سامان کی تجارت کرتے تھے - ترک بحری تجارت کی طرف سے غافل تھے انھوں نے اسے غیر ملکیوں یا اپنی عیسائی رعایا کے اوپر چھوڑ دیا تھا —

ترک بالطبع سپاہی اور منتظم، منصف مزاج، اور امن و امان کا محافظ تھا - اس کی ساری دولت، یا تو اس کی اپنی املاک ہوتی، یا پھر ذاتی تنخواہ - عیسائی رعایا تجارت کے تمام منافع اور شعبوں پر قبضہ کرکے اتنی متمول ہوگئی تھی کہ مسلمان، رعایا جن کی اولادیں سلطنت کی حفاظت کے لئے میدان جنگ میں سر کٹاتی تھیں ان کو رشک اور حسد کی نظروں سے دیکھنے لگی تھی - عیسائی فوجی خدمات سے مستثنی تھے، جس کا بار سب سے زیادہ مسلمان ترکوں ہی کے اوپر تھا - اور جس شجاعت، اور حکم الہی کی سچی اطاعت کے ساتھ یہ مسلمان ترک اس بار کو اٹھاتے، تھے، وہ مستحق صد ہزار آفریں ہے - یہی لوگ اسلام کے بہادر ترین مجاہد تھے اور ایسے زمانہ میں جب کوئی اور مسلمان قوم یورپ کی چیرہ دستیوں کی تاب نہ لاسکتی تھی، اسلامی تہذیب، اسلامی علوم و فنون، اسلامی ادبیات، اور اسلامی زندگی کی خدمت کرنے والے اور اسے زندہ رکھنے والے یہی ترک تھے - اپنے کارناموں سے انھوں نے ثبات عزم اور قوت ارادی کی ایسی مثال دنیا کے سامنے پیش کردی ہے کہ اگر دوسری مسلمان قومیں اسے سمجھیں اور تہذیب اور تمدن کے شعبوں میں اس سے کام لیں، تو ان میں خودی کا احساس اور خود اعتمادی کی صفت پیدا ہو جائے -

ادبیات کی تعریف

از

(ترجمۂ مضمون ڈاکٹر رابندر ناتھہ ٹیگور مترجمۂ جناب پنڈت

ونھی دھر صاحب ودیا النکار لکچرار اورنگ آباد کالج

بیرونی دنیا ھمارے دل کے اندر داخل ھو کر ایک دوسری دنیا بن جاتی ھے - اس اندرونی دنیا میں بیرونی دنیا کی صرف شکلیں ' رنگ ' آواز وغیرہ ھی نہیں ھوتے بلکہ ان کے ساتھہ ھماری پسند اور نا پسندیدگی ' ھمارا خوف اور حیرت اور ھمارا رنج و راحت بھی شریک رھتے ھیں - یہ بیرونی دنیا ھمارے دل کی مختلف حالتوں کے عجیب اور لطیف احساسات میں طرح طرح سے اپنا عکس دکھاتی ھے —

اِس دل کے احساسات کے رس میں ھم اس بیرونی دنیا کو تحلیل کر کے خاص طور پر اپنا بنا لیتے ھیں - جس طرح جن کے معدے میں عرق ھاضم کافی مقدار میں نہیں ھوتا وہ بیرونی اغذیہ کو جز و بدن نہیں بنا سکتے اُسی طرح دنیا میں جو لوگ دل کے احساسات کے عرق ھاضم کا استعمال کافی مقدار میں نہیں کر سکتے وہ بیرونی دنیا کو اندرونی دنیا اپنی دنیا یعنی انسانی دنیا نہیں بنا سکتے —

بعض لوگ اس طرح کی غیر حساس طبیعت رکھتے ھیں جن کے دلوں

میں دنیا کی چیزیں بہت ھی کم کشش رکھتی ھیں وہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے سے محروم رھتے ھیں - اُن کے دل کی کھڑکیاں تعداد میں کم اور وسعت میں تنگ ھوتی ھیں اور اسی لئے وہ دنیا میں رہ کر بھی اس دنیا سے الگ سے رھتے ھیں —

بعض اس طرح کے خوش قسمت اول بھی ھیں جن کی محبت، حیرت اور تخیل ھر جگہ بیدار رھتا ھے - قدرت کے گوشے گوشے سے انھیں ایک پیغام ملتا ھے - دنیا کی طرح طرح کی تحریکات اُن کے دل کی بین کے تاروں کو طرح طرح کی راگنیوں میں متحرک کر دیتی ھیں —

بیرونی دنیا ان کے دلوں میں احساسات کے مختلف رسوں، مختلف رنگوں اور مختلف سانچوں میں ڈھل کر کئی طرح کی شکلیں اختیار کر لیتی ھے —

حساس دل رکھنے والوں کی یہ دنیا بیرونی دنیا کی بہ نسبت انسان کی زیادہ اپنی ھے یہ دنیا دل کی مدد سے انسان کے دل کے لئے زیادہ قابل فہم بن جاتی ھے - یہ دنیا دل کے اثرات سے جو خصوصیت حاصل کرتی ھے انسان کے لئے وھی سب سے زیادہ قابل قبول ھوتی ھے —

اسی لئے دیکھا جاتا ھے کہ بیرونی دنیا میں اور انسانی دنیا میں بہت فرق پایا جاتا ھے - کونسی چیز سفید ھے کونسی سیاہ ھے، کونسی بڑی ھے، کونسی چھوٹی ھے انسانی دنیا صرف ان کی اطلاع ھی نہیں دیتی بلکہ کونسی چیز پسند ھے کونسی چیز ناپسند، کونسی اچھی اور کونسی بری اسی بات کو مختلف سروں میں کہتی ھے

یہی انسانی دنیا ھر انسانی دل میں سے بہتی ھوئی آتی ھے - اس کی یہ روانی گو ھمیشہ قدیم لیکن نت نئی ھے - نئے نئے حواس اور

نئے نئے داؤں کے اندر ہوکر یہ ازلی سوتا ہمیشہ سے دنیا ہوکر بہ رہا ہے —

لیکن اسے کس طرح حاصل کیا جائے اور کس طرح اس پر قابو کیا جائے - اس عجیب و غریب و حسین دل کی اندرونی دنیا کو شکل دے کر دوبارہ ظاہر نہ کرسکنے پر یہ ہمیشہ پیدا ہوکر معدوم ہوتی رہتی ہے —

لیکن یہ چیز معدوم نہیں ہونا چاہتی بلکہ یہ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے بے چین رہتی ہے - اسی وجہ سے ازل سے انسان کے اندر ادبیات کی آمد کا تانتا بندھا رہتا ہے —

ادبیات کا خیال کرتے وقت دو باتوں پر غور کرنا پڑتا ہے - ایک تو یہ کہ مصنف کا دل دنیا پر کس قدر محیط ہے دوسرا یہ کہ وہ کس حد تک دوام کی شکل میں ظاہر ہوا ہے —

ہمیشہ ان دونوں کے بیچ میں اتحاد نہیں ہوتا اور جہاں ہوتا ہے وہاں سونے پر سہاگا ہوتا ہے - شاعر کا زندہ تخیل رکھنے والا دل جتنا بسیط ہوتا ہے اس کی تحریر کی گہرائی میں اُسی قدر ہمارا سکون بڑھ جاتا ہے' انکی ہی انسانی دنیا کے وسیع ہوجانے سے ہماری دواسی مسرت کا جولانگاہ وسعت حاصل کرلیتا ہے —

لیکن شاعرانہ استعداد بھی ادبیات میں بہت قیمتی چیز ہے کیونکہ جس کا سہارا لے کر یہ استعداد ظاہر ہوتی ہے اُس کی بہ نسبت اس کے بے حقیقت ہونے پر بھی یہ استعداد بالکل ضائع نہیں ہوتی' بہ زبان اور ادبیات میں جمع ہوتی رہتی ہے - اس کے ذریعے سے انسان کی قوت اظہار بڑھ جاتی ہے - اس قوت کو حاصل کرنے کے لئے انسان ہمیشہ سے کوشاں رہا ہے - جن مصنفوں کی مدد سے انسان کی یہ قوت تقویت حاصل کرتی ہے انسان اُن

کی عظمت کو بتا کر اُن کے احسان سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے —

جو دلی دنیا دلی جذبات کے ساز و سامان سے پیدا ہوتی ہے اُسے باہر نمودار کرنے کا کونسا طریقہ ہے ؟ اس کو اس طرح نمودار کرنا ہو کا جس سے دلی جذبات صاف طور پر ظاہر ہو جائیں - دلی جذبات کو صاف طور پر ظاہر کرنے کے لئے بہت سے ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے —

مرد کے دفتر جانے کا لباس سیدھا سادھا ہوتا ہے - وہ جتنا کم ہو اتنا ہی کام کرنے میں آسانی ہوتی ہے - صنف نازک کے لباس کی سج دھج، شرم و حیا، ناز و انداز یہ تمام چیزیں مہذب طبقوں میں مروج ہیں —

اس صنف کا کام دل کا کام ہے - اُن کو دل دینا پڑتا ہے اور دل کو اپنی طرف کھینچنا پڑتا ہے - اس لئے اُن کے بالکل سیدھے سادے اور نپے تلے ہونے سے اُن کا کام نہیں چل سکتا —

مردوں کو حتی الامکان مناسب و موزوں ہونا چاہئے لیکن عورتوں کا خوبصورت ہونا ضروری ہے - مردوں کا طرز عمل صاف اور سیدھا ہونا چاہئے لیکن صنف نازک کے طرز عمل بہت سے اشاروں اور کنایوں سے لبریز ہونا چاہئے —

ادبیات بھی دل پر اثر انداز ہونے کے لئے صنعتوں، تشبیہوں، بحروں اور اشاروں کنایوں کا سہارا لیتی ہے - فلسفہ اور سائنس کی طرح سیدھا اور صاف ہونے سے اس کا گزارا نہیں ہو سکتا —

اگر ہم کسی عجیب و غریب خوبصورت تصور کو باہر مشکل کریں تو زبان کے اندر اس کے اظہار کی ناممکنیت کی جھلک دکھائی پڑتی ہے - جس طرح صنف نازک کا حسن اور حیا ہوتی ہے ادبیات کے اظہار کی ناقابلیت بھی ویسی ہی ہوتی ہے - وہ تشکیل کی حد سے باہر ہے اور تمام صنعتوں سے بالا تر ہو جاتی ہے - صنعتوں کے ذریعے سے اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا

ادبیات اس بیان سے بالا تر چیز کو احاطہ کرنے کے لئے زبان میں خصوصیت کے ساتھہ دو چیزوں کو ملایا کرتا ہے - ایک شبیہہ کو اور دوسرے موسیقی کو —

زبان کے ذریعے جو چیز بیان نہیں کی جا سکتی اُسے تصویر کے ذریعے بتلانا پڑتا ہے - ادبیات میں اس طرح کی مصوری کی کوئی حد نہیں - جذبات ' تشبیہہ ' مقابلہ اور صنائع بدائع کے ذریعے سے پیش نظر ہونا چاہئیے ہیں - " دیکھوں بارے آنکھوں پانکھوں دھائے " یعنی دیکھنے کے لئے آنکھہ یہ پرندہ (آنکھہ کا پرندہ) دوڑتا ہے - اس ایک بات میں شاعر بلرام داس نے کیا کچھہ نہیں کہہ دیا - صرف بیان کرنے میں بے چین آنکھوں کے اضطراب کا اظہار کس طرح کیا جا سکتا ہے - نظر پرندے کی طرح اڑ کر دوڑی ہے اور پل بھر میں اس تصویر سے اس کے بیان کی بے چینی کو بڑی حد تک اطمینان ہو گیا ہے —

اس کے علاوہ بحروں میں ' لفظوں میں اور فقرہ بندی میں ادبیات کو موسیقی کا سہارا تو لینا ہی پڑتا ہے - جس چیز کو کسی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا اُسے موسیقی کے ذریعے کہنا پڑتا ہے - جو چیز معنی کی تشریح کرنے پر بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے وہی موسیقی میں آ کر غیر معمولی بن جاتی ہے - یہ موسیقی ہی الفاظ میں درد پیدا کر دیتی ہے —

اس لئے مصوری اور موسیقی ہی ادبیات کے اصل اسباب ہیں -- مصوری جذبات کو مشکّل کرتی ہے اور موسیقی ان میں تحریک پیدا کرتی ہے - تصویر جسم ہے اور موسیقی روح ہے —

لیکن صرف انسان کا دل ہی ادبیات میں محصور کرنے کے قابل نہیں ہے بلکہ انسان کی فطرت بھی ایک اس طرح کی تخلیق ہے جو بے جان مخلوق کی طرح ہمارے احساسات کے ذریعے ہمارے قابو میں نہیں آتی - وہ صرف

" کھڑے " ہوجاؤ کہنے سے کھڑی نہیں ہو جاتی ' وہ انسان کے لئے بے انتہا حیرت پیدا کرنے والی چیز ہے - لیکن اُس کو (باڑے) کے جانور کی طرح باندھ کر ایک بڑے پنجرے میں بند کرکے ٹکٹکی لگا کر دیکھنے کا کوئی آسان طریقہ نہیں ہے انھیں سخت قانونوں سے بالاتر عجیب و غریب انسانی فطرت ہے - ادبیات اسی کو اندر کی دنیا سے باہر لاکر قیام کی شکل دیتا ہے - یہ بے انتہا نا قابل فہم کام ہے کیونکہ انسانی فطرت دوامی اور یکساں رہنے والی نہیں ہے - اُس کے بہت سے حصے اور طبقے ہیں - اس کے اندر باہر بے روک ٹوک آمد و رفت کرنا آسان نہیں ہے - اس کے علاوہ اس کی نمود و نمائش (لیلا) اتنی باریک اتنی نا قابل فہم اور ایسی دفعتاً ہونے والی ہوتی ہے کہ اُسے پورے طور پر ہمارے دل میں بٹھا دینا غیر معمولی قوت کا کام ہے - ویاس ' والمیکی ' کالیداس وغیرہ یہی کام کرتے آئے ہیں —

اگر ہمارے اس سارے مضمون متذکرہ کو مختصر طور پر کہا جائے تو یہی کہنا پڑے گا کہ ادبیات کا مضمون انسانی دل اور انسانی فطرت ہے —

لیکن انسانی فطرت کہنا بھی گویا ضرورت سے زیادہ ہے در اصل باہر کی قدرت اور انسانی فطرت انسان کے دل کے اندر ہر لمحہ جو شکل اختیار کرتے ہیں ' جس نغمے کو بلند کرتے ہیں زبان میں احاطہ کی ہوئی وہی تصویر اور وہی نغمہ ادبیات ہے —

خدا کی مسرت قدرت اور انسانی فطرت میں اپنے آپ کو پیدا کر رہی ہے - انسان کا دل بھی ادبیات میں اپنے آپ کو پیدا کرنا اور نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے - اس کوشش کی کوئی حد نہیں ہے یہی ایک عجیب بات ہے - شاعر انسانی دل کی اس دوامی کوشش کا صرف ایک معمولی توسط ہے —

خدا کی مسرت کا وجود اپنے اندر سے خود بخود نکل رہا ہے - انسانی

دل کی مسرت کا وجود اسی کی صدائے بازگشت ہے - اسی دنیاوی وجود کے نغمۂ مسرت کی جھنکار ہمارے دل کی بین کے تاروں کو آئے دن مرتعش کرتی رہتی ہے - یہی جو دلی نغمہ ہے ' خدا کی قدرت کے جواب میں ہمارے اندر جو قدرت نمایاں ہوتی ہے ' اس کا ارتقا ادبیات ہے - دنیا کی سانس ہمارے دل کی بانسری میں کس راگنی کو بجا رہی ہے ادبیات اُسی کو صاف طور پر ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے - ادبیات کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہے اور نہ اُس کی ملکیت ہے جو اُسے بناتا ہے وہ تو خدائی زبان ہے - باہر کی دنیا جس طرح اپنی اچھائی برائی اپنی غیر تکمیل یافتگی کو لے کر ازل سے نمایاں ہونے کی کوشش کر رہی ہے اسی طرح یہ خدائی زبان بھی ملک ملک میں زبان زبان میں ہمارے دل کی اندرونی لہروں سے باہر آنے کے لئے لگا تار کوشش کر رہی ہے —

———— ‡*‡ ————
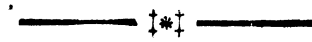
آزاد بدایونی کے متعلق غلطی کی اصلاح اور بعض آن پڑھ شاعروں کے حالات

از

" قمر " بدایونی

(ہم جناب قمرالحسن صاحب قمر بدایونی کا ممنون ہیں کہ انھوں نے آزاد بدایونی کے حالات کے متعلق مصنف سے جو بعض غلطیاں ناواقفیت کی وجہ سے ہوگئی تھیں اُن کی اصلاح اس مضمون میں فرمادی ہے اور اسی ضمن میں بعض ان پڑھ شعرا کے دلچسپ حالات بھی درج فرما دئیے ہیں جو شکر گزاری کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں ۔ اڈیٹر)

رسالہ " اردو " مطبوعہ جولائی سنہ ۲۹ ع میں " اردو کے آن پڑھ شاعروں " کا تذکرہ شروع کیا گیا ہے ۔ اس میں " آزاد بدایونی کے متعلق فقرات مندرجہ ذیل قابل تصحیح ہیں —

(۱) " یہ اسی شاعر قصبۂ بدایوں میں پیدا ہوا نہایت وا رستہ طبیعت و آزاد مزاج تھا "

(۲) " خاندان میں لوہاری کا کام چلا آتا تھا اسے بھی یہی پیشہ تعلیم کیا گیا "

(۳) " مسلم هوستل اله اباد میں صحبت مشاعرہ تهی ... جناب " آسی '' بهی بغرض شرکت مشاعرہ گئے تهے وهاں جناب قمر بدایونی سے ملاقات هوئی اور آزاد کا تذکرہ چهڑا ... ''

تصحیح

(۱) آزاد مرحوم زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے -- لیکن اپنی غزل اپنے هاتهه سے لکهه سکتے تهے -- ایک کتاب (غالباً زهر عشق) ان کے هاتهه کی لکهی هوئی ان کے صاحبزادہ خان بہادر منشی احمد علی خاں صاحب " میکش " کے پاس موجود ہے —

(۳۵۲) لوهاری سے ان سے کوئی تعلق نہیں تها -- اس مغالطه کی وجه غالباً یہ هے که جب مجهے آسی صاحب نے ظریف اور هزل گو شعرا کا تذکرہ لکهنے کا ذکر کیا تها تو میں نے کا ظم لوهار کا ذکر کرتے هوئے جو آزاد کے هم عصر تهے ان سے یه وعدہ کیا تها که بدایوں پهونچکر ان کے اشعار تلاش کروںگا اور اسی سلسله میں آزاد کا یه شعر سنایا تها جو رساله اردو میں شایع هوا هے -- ؛ آسی ' صاحب کے حافظے نے ان دو شاعروں کے حالات کو ایک هی ذات میں جمع کر کے محفوظ کرلیا - اور یه ایک اتفاقی غلطی هے مگر قابل تصحیح —

آزاد بدایونی کے صحیح حالات

" آزاد " مرحوم کا تذکرہ مختصر طور پر میں نے به سلسله مرحوم شعراء بدایوں " تجلیات سخن " کے مقدمے میں کیا هے - ان کا نام محمد علی خاں اور ان کے والد کا نام قادر خاں تها - بدایوں محله چاہ میر کے ساکن تهے ان کا مکان اور خاندان اچهی حیثیت میں اب تک موجود هے - کلام ظریفانه نه تها - اور باوجود کم علمی کے شعر خوب کہتے تهے اور اگر کوئی قافیه نظم کرنے میں یا جدت کی رو میں کوئی ایسا مضمون جو اپنی کسی خصوصیت سے

ظرافت کی حد کے قریب پہونچ جائے جیسا کہ میں ان کے ایک شعر میں دکھاؤں گا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کا نام ظریف شعرا کی فہرست میں لکھ لیا جاے - کیونکہ یہ جدت بعض بعض موقعوں پر اچھے اچھے شاعر کر گزرتے ہیں مثلاً مرزا داغ مرحوم کا یہ مصرعہ " ایسے کے دولگائیے بھگو کر شراب میں" مرزا غالب مرحوم کا یہ شعر - " دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں - ہم ہی کربیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن " یا منیر شکوہ آبادی کے کلام میں - " تدوای آتی ہےان کےگو نے کی پھول تکتے ہیں راہ دونے کی " یا " اب کے سکان کوئے صنم بھیڑئےہوے-" علی ھذا سارےکبوتر آپ کےکلپوتئےہوے " اسی جدت یا زور طبیعت کی رو کے نمونے ہیں - آزاد مرحوم کا انتقال سنہ۱۲۷۶ ھ مطابق سنہ ۱۸۵۹ ع میں ہوا —

رسالہ اردو مذکورۂ بالا میں " آزاد " کا یہ مقطعہ درج ہے —

آزاد کی ہے خانہ بدوشی کا یہ عالم کا ندھے پہ لئے پھرتے ہیں چھپر کئی دن سے

اس کے متعلق یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب مشاعرے میں آزاد نے مقطع کا دوسرا مصرعہ پڑھا تو قافیہ بجاے چھپر کے بستر تھا مگر یاران طریقت نے تعریف کے سلسلہ میں جب اس کو دھرایا تو بستر کی جگہ چھپر ترمیم کردیا اور یہ ترمیم اس قدر مقبول ہوئی کہ مقطعہ اسی طرح زبان‌زد عام ہوگیا ۔ یہ روایت ان لوگوں کی ہے جو ان کے ہمعصر تھے اور اب تک زندہ ہیں - اس غزل کا مطلع یہ تھا —

شہرہ ترےوحشی کاہے گھرگھرکئی دن سے کوٹھوں‌پہ چلےجاتے ہیں پتھرکئی‌دن سے

آزاد مرحوم شعر اوائل عمری ہی سے کہتے تھے چنانچہ اسی زمانے میں اپنے ایک ہم سن دوست کی تلاش اور ان کے نہ ملنے کا حال اس شعر میں نظم کیا ہے :—

مکان حشر میں کوچہ میں اور طویلے میں کہاں کہاں ترا وحشی تجھے پکار ایا

مکان حشر سے مولوی رسول بخش حشر بدیوانی کا مکان کوچہ سے ایک محلہ کی مشہور گلی جو اسی نام سے مشہور ہے اور طویلے سے ایک مکان جو پہلے طویلہ تھا مراد ہے - آزاد مرحوم کا کلام باوجود اچھا کلام اور کافی ذخیرہ ہونے کے تلف ہوگیا - مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ ذیل کے اشعار بھی مجھے یاد ہیں —

خلعت برہنگی کا جو بخشا بہار نے دست جنوں لگے میرے کپڑے اتار نے

داغ کی ایک سپر ہاتھ میں آہی نکلا آپ کے باغ کا لالہ بھی سپاہی نکلا

کاظم اوہار کے اشعار با وجود تلاش کے مجھے دستیاب نہ ہوسکے - اگر اس سلسلے میں اضافہ کرنا مقصود ہو تو بدایوں کے ان پڑہ شاعروں میں ایک گھر کے تین شاعروں کا کلام اور حالات حسب ذیل ہیں :—

''غالب'' - غالب علی نام تھا - ایک کامل فن مرغباز تھے - آخر میں کباب وغیرہ بیچکر بسر اوقات کرتے تھے لیکن جوتا ٹوپی بلکہ پگڑی تک سے درست رہتے تھے - شاعری کا شوق نہیں تھا البتہ چست فقرے اور برجستہ جملے روز مرہ میں داخل تھے اور اسی رو میں اپنی ضرورت کے مطابق وقتی شعر بھی کہہ اٹھتے تھے - پڑھے لکھے نہیں تھے مگر چونکہ قاضی ٹولہ کے رہنے والے تھے جو ذی علم شرفا کا مخصوص محلہ ہے اس لئے صحت لفظی اور تہذیب و سلیقہ سے محروم نہ تھے - اور کسی قدر حرف شناس بھی تھے - ایک صاحب جن پر کبابوں کے دام آتے تھے بہ سلسلہ تلاش ملازمت جھانسی جارہے تھے - غالب علی نے ان کی روانگی کے وقت اپنے داموں کا تقاضا کیا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ انہوں نے جھانسی پہونچکر ان کے دام بھیجنے کا وعدہ کرتے ہوئے مزید احتیاط کے خیال سے یاد دہانی کے لئے

اپنا پتہ لکھہ کر غالب علی کو دیدیا - غالب علی نے اس کو غور سے دیکھا تو لفظ جھانسی پر نظر پڑی فوراً ان کا ھاتھہ پکڑ کر بولے "آپ تو جہان سے جاتے" ھیں میں یاد دھانی کہاں کرونگا - اسی طرح ایک صاحب اُن کے مقروض تھے جب اُن سے تقاضا کیا گیا تو انھوں نے یہ وعدہ کیا کہ علےالصباح میرے مکان پر آؤ اپنے پیسے لیجانا - یہ حسب وعدہ مکان پر پہونچے تو وہ نہیں ملے - دوسرے وقت پھر تقاضا کیا تو مقروض صاحب نے کہا میں صبح کی اذان سنتے ھی ٹہلنے کو نکل جاتا ھوں تم ایسے وقت آؤ کہ اذان میرے دروازے پر سنو - غالب علی دوسرے دن صبح کی اذان سے آدہ گھنٹہ قبل ان کے دروازے پر پہونچے اور اذان کہنی شروع کر دی - اور چونکہ شیعہ مذھب رکھتے تھے اس لئے شیعوں کی اذان کہی - اس محلے میں شیعوں کی ایک ھی مسجد ھے اور وہ بھی اس موقع واردات سے دور - یہہ غیر معمولی اور قبل از وقت اذان سنکر پاس پڑوس کے لوگ اپنے گھروں میں سے نکل آئے - غالب علی کو سخت سست کہا تو یہ قصہ معلوم ھوا اور ایک بزرگ نے اپنے پاس سے وہ قرضہ ادا کرتے ھوئے آیندہ کے لئے مقروض مذکور کو قرض دینے کی سختی سے ممانعت کردی - جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ھوں اسی قسم کی ضرورتوں سے کبھی کبھی غالب علی شعر بھی کہتے تھے اور غالب تخلص کرتے تھے - ۶ - ۷ برس ھوئے ھونگے کہ ان کا انتقال ھوگیا ساٹھہ اور ستر کے درمیان عمر پائی دو شعر مجھے یاد ھیں —

نقد کوئی نہ لے تو کیا کیجے آج 'غالب' اُدھار ھي بیچو

بادل گرج رھا ھے یہ طوفان آب ھے غالب ھمارے برف کی مٹی خراب ھے

بد قسمتی یا خوش قسمتی سے ان کے دونوں لڑکے بھی شاعر ھوئے

جو بقید حیات ہیں —

غالب علی کے بڑے لڑکے جن کی عمر پچاس سے دو ایک برس زائد ہے - واحد علی نام - باپ نے برسوں مکتبوں میں پڑھوایا مگر وہ تشریح الحروف سے آگے نہ بڑھے جب سن شعور کو پہونچے تو ایک آوارہ عورت پر عاشق ہو گئے - جوش عشق میں شاعری شروع کر دی اور داغ تخلص اختیار کیا بیشتر بے تکے اشعار کہتے تھے اور عجیب عجیب طرح سے ان کا مطلب بیان کرتے تھے - مثلاً - ایک شعر تصنیف کیا - "کیا چاند میں بیٹھی ہے نرالی مگر بڑھیا - اس سبزی سائل سا قیا رخسار کو دیکھو"- لوگوں نے مطلب پوچھا تو چاند میں چرخہ کاتنے والی بڑھیا کو اپنی محبوبہ کی مادر مرحوم اور چاند کی روشنی میں سبزی کی رمق کو سبزہ رخسار سے منسوب کرکے مطالب کا طومار باندھ دیا - کسی نے پوچھا کہ آپ کی محبوبہ کو سبزۂ رخسار سے کیا علاقہ تو فرمانے لگے اس سے نہ سہی ہم سے تو علاقہ ہے وہ ہمیں ساقیا رخسار سمجھتی ہے یہ مصرعہ ہم نے اس کی طرف سے لکھدیا - غرض اس قسم کے اشعار تو ہزاروں تھے جو نہ کسی دوسرے کو یاد رہ سکتے تھے نہ اب انھیں یاد ہیں - البتہ اسی زمانہ کی شاعری کا ایک کارنامہ قابل ذکر ہے ایک موقع پر ایک اچھے خاصے شاعر سے سازش کرکے واحد علی صاحب کا مقابلہ کرا دیا گیا اور ایک طرح تجویز کرکے فی البدیہ شعر لکھنے کی فرمائش کی گئی - طرح کا مصرعہ یا ردیف و قافیہ یہ تھا —

"توڑ ڈالے سبو تڑاق پڑاق' - اس مقابلے میں اپنے حریف کے شعر لکھنے سے بلکہ شعر لکھنے کے لئے سنبھلنے سے پہلے واحد علی صاحب نے ذیل کا شعر سنا دیا —

رات غصہ میں آکے ساقی نے توڑ ڈالے سبو تڑاق پڑاق

غالب علی کے دوسرے لڑکے

کا نام واجد علی ہے پہلے 'فاسخ' اس کے بعد 'راسخ' تخلص تھا اور اب واجد ہے یہ بھی پڑھے لکھے نہیں ہیں لیکن حرف شناس ہیں کچھ الٹا سیدھا لکھ بھی لیتے ہیں اور صاف لکھا ہوا ہو تو پڑھ بھی سکتے ہیں ان کی طبیعت شاعری کے لئے زیادہ موزوں ہے - اکثر مشاعروں میں بھی شریک ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی وقت گزاری کے لئے مشاعرہ شروع ہونے سے قبل یا مشاعرہ شروع کرنے کے لئے ان کی غزلیں سننے کی نوبت آ جاتی ہے - گرمیوں میں برف جاڑوں میں چاء بیچکر بسر اوقات کرتے ہیں - برسات کے موسم یا خالی وقت میں ضرورتوں سے مجبور ہو کر زنانہ سواریوں کا دستی ٹھیلہ بھی چلاتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنا ٹھیلہ لے کر بریلی بھی چلے جاتے ہیں اور وہاں رہ کر بھی ٹھیلہ چلاتے ہیں - آج کل ان کا ٹھیلہ بریلی میں کرایہ پر چلتا ہے - تقریباً تیس سال کی عمر ہے بریلی کالج کے ایک مشاعرے میں شریک ہو کر غزل بھی پڑھ چکے ہیں - کبھی کبھی فلاس سے بھی دل بہلا لیتے ہیں - طبیعت تیز اور ذہن رسا پایا ہے - اس لحاظ سے خلف الرشید ہیں مگر باپ کی طرح پوشش کا لحاظ دونوں میں سے ایک کو بھی نہیں ہے - جوتا نہ ہو تو پروا نہیں - ٹوپی نہ ہو تو نہ ہو - ان قیدوں سے آزاد ہیں ان کے اشعار میں ان کے پیشے اور ان کے شوق کا بھی ذکر آ جاتا ہے —

کلام

ایک مشاعرے کی مختصر صحبت میں انھیں چاء کا ٹھیکہ دیدیا گیا تھا اس کا حساب ہوا تو فی البدیہہ یہ شعر پڑھا —

پیالے تیس پڑیں بیس ہم کو پیسے ہیں ہماری جان الٰہی بڑے عذاب میں ہے

ایک مصرعہ طرح کی شکایت میں سر مشاعرہ یہ شعر پڑھا —

دی ہے مہمل یہہ طرح سوچکے جس نے " واجد "
اس میں لکھینگے غزل بھی وہی حضرت نہ کہ میں

اپنا فصلی پیشہ تبدیل کرنے کے متعلق فرماتے ہیں —

جب تلک سردی رہی تو چاء میں ڈوبا رہا
گرمیاں آئی ہیں " واجد " برف کا سامان کو

فلاس کھیلتے وقت جب شاعری زور پکڑتی ہے تو اس قسم کے شعر بھی تصنیف کرتے اور پڑھتے رہتے ہیں —

چال اک آنے کی ہے تو کررہا ہے کیا غضب
تگیوں کا جوڑ بورا (*) پھینک ہارا جانکر
ہاتھہ دھپل (+) پر مرا اٹھوا دیا بیرحم نے
آٹھے گھاتے میں ہم شیخا (‡) کا کھنا مانکر

ان کا کلام کافی تعداد میں ہے مگر سب حفظ ہے مشاعرے کی غزل کسی سے نقل کروا لیتے ہیں اور مشاعرے کے بعد کسی قدردان کو بخش دیتے ہیں - اکثر بیوقوف شعرا نے اصلاح لینے پر توجہ دلائی مگر کسی کی درخواست کو شرف قبولیت نصیب نہ ہوا - بریلی کالج کے مشاعرے کی غزل پر نمونہ کلام کا خاتمہ ہے —

غالباً سنہ ۱۹۲۸ کے مشاعرے میں یہہ غزل میری موجودگی میں پڑھی تھی جب کہ ان کا قیام بریلی ہی میں تھا —

(*) " بورا " - ایک شریک تفریح کا نام (+) " دھپل " فلاس کی یا اس قبیل کی ایک اصطلاح جس سے دھوکا مراد ہے (‡) شیخا - ایک ہم مشرب جلیس کا نام —

غزل

یاد اللہ کی ہم شام و سحر رکھتے ہیں — مہر کی ہم پہ ہمیشہ وہ نظر رکھتے ہیں
ان پہ ہم اپنی محبت کا اثر رکھتے ہیں — ہم پہ وہ لطف و عنایت کی نظر رکھتے ہیں
کس قدر ہے میرے ارمان و تمنا کا ہجوم — دیکھنا ہے وہ جنازے کو کدھر رکھتے ہیں
درد اٹھانے کے لئے ضعف بٹھانے کے لئے — تیرے بیمار کی یہہ دو ہی خبر رکھتے ہیں
چھوٹکر قید قفس سے میں اڑوں کیسے اڑوں — پہلے ہی سے وہ پر و بال کتر رکھتے ہیں
میرے قاسم نے عطا کی مجھے خاطر قسمت — میرے مقسوم میں 'واجد' وہ کسر رکھتے ہیں

میں نے یہہ غزل حاصل کرنے کے لئے آج بلایا تو یہہ شعر لکھا دئے اور فرمایا اس کے اور شعر بھی ہیں جو اس وقت یاد نہیں آتے اس سلسلے میں ایک ان پڑھ شاعر کا ایک زبان کار نامہ مجھے یاد ہے اگر ان کے حالات شائع بھی ہوئے ہوں لیکن یہہ کار نامہ شامل حالات ہونے سے رھجائے تو نا قابل تلافی فر و گزاشت ہوگی - وھوھذا —

ایک دھلی کے شاھزادے جو بفضلہ بقیہ حیات ہیں مرزا چپاتی کے نام سے مشہور ہیں (ان کا نام نامی میں بھول گیا) مگر میں نے ان کو دیکھا ہے - پچاس ساٹھہ کے درمیان عمر ہوگی - زبان میں لکنت ہے پڑھے لکھے بالکل نہیں ہیں (یا شاید حرف شناس ہوں) پتنگ اور تکل بنانے میں کمال رکھتے ہیں کبوتر پالنے اور ان کا رنگ بدلنے یا انہیں حسب مراد رنگین بنانے میں استاد ہیں - گردش زمانہ سے یہی کمالات ان کا ذریعہ معاش ہیں - زیادہ کہنے سننے سے مقامی مشاعروں میں بھی شریک ہوجاتے ہیں - دھلی کے شاہی دربار تاج پوشی منعقدہ سنہ ۱۹۰۳ ع میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی طرح یہہ تھی —

سر عدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب

اس مشاعرے میں مرزا " داغ " میر مہدی " مجروح " جناب " ظہیر "
و مولانا " راسخ " وغیرہ ہم اساتذہ شریک تھے اور مصرعہ طرح کی گرہ
لازمی قرار دی گئی تھی چنانچہ ہر شریک مشاعرہ شاعر نے اس شرط
کی پابندی کی لیکن مرزا چپاتی کی گرہ سب سے بہتر تھی اور اس کا
اعتراف اساتذہ نے سر مشاعرہ کیا تھا - مرزا چپاتی کا وہ شعر ملاحظہ ہو —

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے　　سر عدو کا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

کسی نے سچ کہا ہے —

تو دبنے پہ آئے تو اے رب کریم　　جو چاہے جسے پہاڑ کے چھپر دیدے

تبصرے

ادب

بہار گلشن کشمیر جلد اول

(مرتبہ و مولفۂ پنڈت بر جکشن کول صاحب بے خبر و پنڈت جگموہن ناتھہ رینہ صاحب شوق- مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد - صفحات ۷۶۰)

کشمیری پنڈت اپنی حسن صورت و سیرت اور ذہانت و فطانت کی وجہ سے خاص امتیاز رکھتے ہیں اور خصوصاً ہندوستان میں آکر ان کے جوہر خوب کھلے ہیں- انھوں نے ملک کی تہذیب و شایستگی اور ادب کی ترقی میں قابل تعریف کام کیا ہے - گو ان کی تعداد کم ہے - لیکن حسن قابلیت اور کمال کی وجہ سے وہ جہاں کہیں بھی ہیں صف اول میں نظر آتے ہیں —

بہار گلشن کشمیر جس کا دوسرا نام تذکرہ شعرائے کشمیری پنڈتاں ہے ان کے ادبی کمال کے ثبوت میں کافی شہادت ہے - پنڈت جگموہن ناتھہ رینہ صاحب شوق نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ان شعرا کا کلام اور حالات جمع کئے ہیں- اس کا اندازہ کتاب کے پڑھنے کے بعد ہوسکتا ہے - اس میں فارسی اردو دونوں زبانوں کے شاعر ہیں اور قدیم سے لیکر زمانۂ حال تک تمام شاعر آگئے ہیں اس ممتاز فرقے کا شاید ہی کوئی شاعر شوق صاحب کی نظر سے بچا ہوگا - شوق صاحب نے اس معاملے میں بڑی دیانت سے کام لیا ہے - بعض ایسے شاعر تھے کہ ان کا

کلام کسی بیاض وغیرہ میں ملا مگر ان کا حال دستیاب نہیں ہوا تو انہوں نے اسے آئندہ تحقیق کے لئے اٹھا رکھا اور اس کتاب میں درج نہیں کیا -

قابل مولف نے جہاں تک ان کی دسترس تھی شعرا کے حالات دریافت کرنے اور کلام تلاش کرنے کی کوشش کی ہے - ترتیب حروف ابجد کے لحاظ سے رکھی ہے - اس پہلی جلد میں حروف ' ظ ' تک پہنچے ہیں - باقی دوسری جلد کے لئے ہیں -

مولف نے صرف حالات اور کلام کے جمع کرنے پر اکتفا کیا ہے - کلام کے حسن و قبح سے بحث نہیں کی اور تنقید کی الجھن میں نہیں پڑے یہ انہوں نے ناظرین کے ذوق پر چھوڑ دیا ہے -

کتاب ختم ہو جانے کے بعد جن شعرا کے مزید حالات وغیرہ دستیاب ہوے یا نئے شعرا کا پتہ لگا تو وہ بطور ضمیمہ کے اضافہ کردئے گئے ہیں - چندر بھان برہمن کے حالات اصل کتاب نیز ضمیمے میں درج ہیں - برہمن کی کئی تصانیف کاذکر تو کیا ہے اور ایک کتاب " انشاء چہار چمنی " کا ذکر مرزا سلطان احمد صاحب کے حوالہ سے کیا ہے - یہ چہار چمنی نہیں بلکہ چہار چمن ہے - ضمیمے میں ان کے دیوان اور مثنوی کا ذکر ہے لیکن ان کے علاوہ برہمن کی ایک نہایت عمدہ انشا " منشات برہمن " کے نام سے ہے - نیز تحفہ انوارے ' کار نامہ و تحفۃالنور اور جمع‌الفقرا بھی اس کی تالیفات سے ہیں - " منشات برہمن " میں بادشاہ کے نام کے عرائض اور وہ خطوط جو امرا اور بزرگوں اور عزیزوں کے نام لکھے تھے درج ہیں - ان کی عبارت بہت پاکیزہ اور رنگین ہے اور جگہہ جگہہ غزلیں اور حکیمانہ نکات بھی درج ہیں -

کتاب ایسی نفیس صاف ستھری اور اعلی درجے کی چھپی ہے کہ دیکھے سے جی خوش ہوتا ہے اور کاغذ اور جلد بھی نہایت عمدہ ہے - جن شعرا کے فوٹو مل گئے ہیں ان کی تصویریں بھی بہت خوبی سے چھاپی گئی ہیں -

غرض یہ کتاب ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے اور قابل مولف کی محنت اور ذوق لائق داد ہے -

کتاب ڈاکٹر سر سپرو کے نام معنون کی گئی جو اپنی ادیبانہ قابلیت کی وجہ سے اس کے مستحق تھے -

غالب اور مومن

(از مولانا حکیم سید اعجاز احمد صاحب حجم ۶۴ صفحے
قیمت آٹھ آنے - دائرہ علمیہ فیض آباد)

یہ رسالہ " مولانا حکیم سید اعجاز احمد صاحب معجز سہوانی - منشی فاضل و مولوی فاضل پنجاب" کے زور قلم کا نتیجہ ہے - آپ کے ہم وطن' حضرت 'نکہت' (سہوانی) نے جن کے القاب مصنف سے بھی بڑھ چڑھ کر تحریر کئے گئے ہیں ' ایک " محققانہ " تبصرہ لکھکر اس "محققانہ " موازنے کا وزن بڑھایا ہے - اصل مقصد غالباً " مومن " خاں مرحوم کے محاسن کلام کو بیان کرنا تھا - " غالب " کی تنقید و تنقیص محض تصویر کا رنگ چمکانے کے لئے ضروری سمجھی گئی - لیکن موازنے کی غرض سے " غالب " کے جو اشعار چنے گئے ہیں ' ان میں ایسی نا انصافی یا نا واقفیت سے کام لیا ہے کہ کتاب کی وقعت نظر سے گر جاتی ہے - تبصرہ نگار صاحب تو یہاں تک جوش میں آئے کہ "غالب" کو "ذوق" و "مومن" جیسے استادوں کے مقابلے میں لانے کے قابل ہی نہیں سمجھتے بلکہ اردو شاعر تسلیم کرنے میں بھی متامل ہیں - قریب قریب وہی سب اعتراضات رسالے میں دھرائے گئے ہیں جو پچاس برس پہلے دہلی سے بازاری مرزا صاحب کے کلام پر کیا کرتے تھے - سب سے زیادہ ناراضی اس کے مُغلق و عسیرالفہم ہونے پر ظاہر کی ہے لیکن اس نکتہ چینی کے تو لائق مصنف کے ممدوح کا کلام بھی پاک و بری نہیں بلکہ بڑی مشکل یہ ہے کہ ان کے معمے حل کرنے کے بعد بھی " حاصل " کی صرف حسرت باقی رہ جاتی ہے - بے شبہ ان کے چیدہ اور صاف اشعار اپنے رنگ میں لاجواب ہیں - ان کی نازک خیالی اور رنگین بیانی میں کسی سخن شناس کو کلام نہیں ہوسکتا مگر اپنی ذہانت و جدت پسندی کے با وجود " مومن " اسی رسمی تغزل کی زنجیروں میں قید ہیں ' جس نے دو صدی تک ہماری شاعری کو محض ایرانی غزل نویسوں کی نقالی بنائے رکھا - اور حضرت " معجز " یا ان کے دوسرے ہم خیال کتنی ہی سینہ کوبی کریں ' عہد جدید کے تعلیم یافتہ

اہل ذوق ' شعر کے فن لطیف کو کبھی اس جھوٹی عاشقی اور شرمناک امرد پرستی کے مضامین تک محدود سمجھنے پر آمادہ نہ ہونگے جو ایک مدت سے ہمارے شعرا کا سرمایۂ فخر و مباہات رہا اور اب ہماری ساری تہذیب و اخلاق کے چہرے پر سیاہ داغ نظر آتا ہے - قادرالکلام اردو شعرا میں مرزا " غالب " پہلے شخص ہیں جن کی نگاہ بارہا امارد اور شاہدان بازاری کے کوٹھوں سے ہٹ کر انسانی زندگی کے دوسرے نازک و پیچیدہ تر مسائل تک پہنچتی ہے اور وہ نہایت لطیف اور فلسفیانہ انداز میں ان پر رائے زنی کر جاتے ہیں - یہی وہ خصوصیت ہے جس کے باعث زمانۂ حاضرہ کے اہل نظر ان کے اس درجہ گرویدہ و معتقد پائے جاتے ہیں - لائق مصنف رسالہ اور ان کے دوست نکہت صاحب اس خیال کو پیش نظر رکھکر غور فرمائیں گے تو عجب نہیں کہ انہیں بھی غالب اور اپنے دوسرے ممدوحوں کے کلام میں اس فرق عظیم کا مشاہدہ ہوجائے جسے دیکھنے سے وہ اب تک معذور و محروم رہے —

لائق مصنف مرزا غالب کی زبان دانی اور دہلوی نہ ہونے پر بھی مُنہ آئے ہیں اور شہادت میں " طبا طبائی " صاحب کا قول پیش کیا ہے - لیکن زبان دانی کے اگر ان پرانے اور بھولے ہوئے معیاروں سے کام لیا گیا تو ہمیں خوف ہے کہ سہوانی نقادوں کو اردو زبان کی شاعری کے متعلق کسی طرح لب کشائی کا حق نہیں باقی رہے گا - فتدبر —

(ش)

انار کلی

(از سید امتیاز علی صاحب " تاج " - دارالاشاعت - لاہور)

اس ڈرامہ میں شہزادہ " سلیم " اور " انار کلی " کی باہمی محبت اور اس کے تلخ انجام کو بیان کیا گیا ہے - " انار کلی " کے افسانے کی

تاریخی صداقت اب تک ثابت نہیں ہوئی لیکن روایتاً یہ قصہ اس قدر عام رہا ہے کہ اس کی تہ میں ضرور کوئی نہ کوئی حقیقت ہوگی قصہ یہ ہے کہ 'اکبر' کے حرم میں نادرہ بیگم یا شرف النسا بیگم ایک کنیز تھی جسے شہنشاہ نے " انار کلی " کے خطاب سے سرفراز کیا تھا - " شہزادۂ " سلیم " کا عنفوان شباب تھا - " انار کلی " کے حسن و رعنائی نے اسے اپنی طرف مائل کیا - عشق رسمی فرق مراتب سے بے نیاز ہوتا ہے - " انار کلی " ویسے تھی تو ادنیٰ کنیز لیکن " سلیم " کی نظر میں اس کا رتبہ کچھ اور ہی ہوگیا تھا - ایک دن ہونے والی بات اکبر نے شیش محل میں ان دونوں کو اشارہ و تبسم کرتے دیکھ لیا - دیکھنا تھا کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی - " سلیم " کے اخلاق اور ' انار کلی کی جرات سے اسے یہ توقع نہ تھی - برھمی کے عالم میں حکم دیا کہ ' انار کلی ' کو زندہ دیوار میں چن دیا جائے —

یہاں تک تو یہ افسانہ ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ' سلیم ' نے ' انار کلی ' کا مقبرہ اپنے زمانۂ حکومت میں بنوایا - اس کا تعویذ سنگ مرمر کی بڑی سل سے بنا ہوا ہے اور اس عہد کی سنگ تراشی کے عمدہ نمونوں میں اس کا شمار ہوتا ہے —

مصنف نے اس المیہ کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے پہلے باب میں ' سلیم ' اور ' انار کلی ' کی ابتدائی محبت کا حال ہے - اس باب میں چار منظر ہیں - دوسرے باب میں قلعہ ' لاہور ' کی ایک بزم رقص کا ذکر ہے جس میں ' انار کلی ' کے کمال کا حرم کی دوسری سب کنیزوں پر سکہ بیٹھ گیا اس باب میں بھی چار منظر ہیں —

تیسرے باب میں ' سلیم ' اور ' انار کلی ' کے راز محبت کے طشت از بام ہونے کا حال ہے - اس باب میں پانچ منظر ہیں —

اس ڈرامے کی زبان میں مواقع کا پورے طور پر لحاظ رکھا گیا ہے - روز مرہ کی جگہ روز مرہ اور جہاں زور بیان کی ضرورت ہے وہاں اسے برتا گیا ہے ہمارے خیال میں اس ڈرامے کو ایکٹ کرنے میں کوئی بات مانع نہیں —

لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے - عبدالرحمن صاحب چغتائی کی پانچ تصاویر بھی ہیں جو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بنائی ہیں —

(ی)

نغمۂ روح

(از اختر انصاری صاحب دهلوی - مطبوعه دلی پرنٹنگ ورکس - دهلی قیمت ۱۲ آنے) ۰

یه مجموعه اختر انصاری صاحب دهلوی کے قطعات ' غزلیات اور نظموں پر مشتمل هے - موصوف کا کلام اسی رنگ میں هے جو آج کل اقبال کے اثر سے هماری زبان کے بیشتر نوجوان شاعروں نے اختیار کرلیا هے - یه واقعه هے که هماری زبان کی تاریخ میں کسی اور شاعر نے اپنی زندگی میں اپنے رنگ اور اپنے طرز کو اتنا کامیاب نہیں دیکھا ' جتنا که اقبال نے - بڑے شاعر کی شخصیت زبان کو جہاں بہت سے فائدے پہنچاتی هے وهاں نقصان بھی پہنچاتی هے - اس کے هم عصر اس سے ایسے مرعوب هو جاتے هیں که وه جو کچھه دیکھتے هیں اسی کی نگاه سے دیکھتے هیں اور جو کچھه کہتے هیں اسی کی زبان سے - اس مجموعے میں اقبال کے رنگ کی جھلک هر صفحه پر نظر آتی هے - لیکن اس سے یه نه سمجھنا چاهئے که اختر انصاری صاحب اپنی ذاتی اپج کو استعمال نہیں کرتے - دراصل جہاں کہیں وه اقبالی طرز سے هٹے هیں وهیں ان کے پیرایۂ بیان میں لطف آگیا هے - بعض قطعے اس مجموعے میں خوب هیں —

" محبت " پر ایک قطعه هے : محبت هے اک خوش نما شوخ کانٹا
جو چبھتا هے آنکھوں کے پردوں میں پہلے
اتر جاتا هے پھر وه دل کی رگوں میں
خلش اول اور بعد میں درد بن کے

" آنسو " پر دوسرا قطعه هے : ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نه تھا میں نے
که خاک میں نه ملیں میری آنکھه کے تارے
میں ان کو ضبط نه کرتا اگر خبر هوتی
پگھل کے قلب میں بن جائنگے یه انگارے

ہندی اردو مالا

(مولفہ پنڈت ہری ہر شاستری پروفیسر انچارج ہندی سنسکرت جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن - صفحات ۵۵ قیمت دو آنے)

——

یہ ہندی اردو کی دوسری کتاب پنڈت ہری ہر شاستری صاحب نے ان اردو داں طالب علموں کے لئے لکھی ہے جو ہندی سیکھنا چاہتے ہیں - شروع میں حروف کے باہمی جوڑ کا طریقہ بتایا ہے - اس کے بعد ہندی میں آسان سبق مختلف مضامین پر لکھے ہیں - اور اس کے مقابل صفحے پر اول مشکل الفاظ اور ان کے معنے اردو میں دیئے ہیں اور پھر تمام سبق اردو حروف میں لکھ دیا ہے - اس طریقے سے طالب علم بہت آسانی سے بغیر اُستاد کی مدد کے ہندی پڑھ سکتا اور اس میں مہارت حاصل کرسکتا ہے - اس کے بعد چند سبق صرف ہندی میں لکھے ہیں اور شروع میں اُن کے معنے بھی ہندی ہی میں دیے ہیں آخر میں ایک سبق ہندی محاورات کا ہے جن کے مقابل میں اردو ترجمہ بھی لکھ دیا ہے - سب سے آخر میں ہندی اعداد اور رقمیں درج ہیں اردو دانوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے —

شیطان سبھا

(مصنفۂ سید آل حسن صاحب بی - اے ' ایل ایل - بی ' وکیل مرادآباد عالم بک ایجنسی مرادآباد - صفحات ۳۸ قیمت چار آنے)

——

یہ مثنوی ملٹن کی مشہور نظم پیراڈائس لوسٹ سے اخذ کی گئی ہے اس میں صرف شیطان اور اس کے ساتھیوں کی تقریریں نظم کی گئی ہیں - ملٹن

کی نظم کی قوت اور شکوہ تو اس میں نہیں ہے تا ہم اس مضمون کو سادہ طور سے نظم کر دیا ہے —

یادگار شیون

(مرتبہ بیضا خاں صاحب ، اوسط درجے کی تقطیع ، صفحات ۶۰ ، لکھائی چھپائی اچھی ، ڈنڈائی برقی پریس اسلامیہ اسکول امرت سر)

یہ مختصر کتاب مرزا شجاع خاں شیون مرحوم کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے ، شیون مرحوم نوجوان شاعر تھے - ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو ضرور ترقی کرتے اور مشہور شعرا کی صف میں جگہ پاتے موجودہ مجموعہ میں اکثر اشعار اچھے ہیں ان میں جدت اور مضمون آفرینی کے آثار پائے جاتے ہیں - زبان بھی صاف پاک ہے —

(چ)

میکدہ

(مجموعہ کلام حضرت منہر واسطی - قیمت مجلد ۱۲ آنے ، غیر مجلد ۸ آنے - منوہر دیسی دواخانہ - چوک چونے منڈی لاہور)

حضرت منہر واسطی کی اُن نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں - اس میں مختلف ۲۵ نظمیں ، ۶ غزلیں اور چند متفرق اشعار ہیں - جناب منہر کے کلام میں پختگی ہے ، زبان صاف ، شستہ اور بیان رواں ہے مضامین میں تنوع ہے - کتاب اچھی چھپی ہے کاغذ بھی عمدہ ہے ، جلد خوش نما ہے —

(چ)

فروغ بیان

(مصنفه جناب شاد صابری صاحب ' سوا سو صفحے ' چھوٹی تقطیع ' قیمت ایک روپیه ' ملنے کا پته :- شاد صابری اوور سیر ' میونسپلٹی ' کراچی)

یه جناب شاد صابری کے کلام کا مجموعه ھے - اس میں ۱۰۴ صفحوں پر غزلیں ھیں اور بقیه ۲۰ صفحوں پر نظمیں - اس مجموعه کو دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے که حضرت شاد پر جدید انقلاب شاعری کا کم اثر ھوا ھے - وہ برابر پرانے طرز میں غزل گوئی کر رہے ھیں - اس مجموعے میں نظمیں بھی ھیں جو نام و صورت کے لحاظ سے تو جدید معلوم ھوتی ھیں لیکن مضامین کے اعتبار سے ان میں قدیم رنگ کی جھلک نمایاں ھے - غزلیں زبان و بیان کے اعتبار سے اچھی ھیں مضامین میں بھی ایک حد تک تنوع ھے شروع میں حضرت شاد نے خود اپنے حالات اس خیال سے لکھ دئے ھیں که آئندہ ان کے متعلق غلط فہمی نه ھو اور آئندہ قیاس کی بناء پر لوگ ان کی تصویر کو مسخ نه کر دیں - اس کے بعد جناب قمر بدایونی کا مقدمه ھے - مقدمه کی تمہید سے معلوم ھوتا ھے که یه دوسو برس قبل کی کسی کتاب سے ترجمه کی گئی ھے - اس میں اصناف و ارکان سخن کو ارکان دین و ایمان سے تشبیه دی ھے مثلاً رباعی کو چار مصلوں یا رسول اکرم کے ھر چہار یاران با صفا سے ' مخمس کو پنجتن پاک یا اوقات نماز پنج گانه سے - غرض شعر و سخن کی عظمت اس تشابه سے ثابت کی گئی ھے —

شروع میں مصنف نے اپنی تصویر سے کتاب کو زینت دی ھے —

(چ)

پریم گیتا

(مرتبہ ملک فضل حسین صاحب ' چھبی تقطیع ۳۲ صفحے
ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اسلام سکندر آباد دکن)

یہ ان نعتیہ نظموں کا مختصر مجموعہ ہے جو ہندو شعرا نے کہی ہیں۔ اس میں ۱۹ شاعروں کی نظمیں ہیں - شعراء تقریباً سب حال کے ہیں ' یہ اس عام اتحاد اور یگانگت کے آثار ہیں جو قدیم زمانے میں ہندو مسلمانوں میں پائے جاتے تھے اور دونوں قومیں ایک دوسرے کی تہذیب سے متاثر تھیں اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندو شاعروں نے اولیا اور انبیا کی ثنا و صفت میں بڑے خلوص سے نظمیں لکھی ہیں اس مسموم اور مکدر فضا میں بھی ایسے پاک نفس لوگ موجود ہیں جن کے آئینہ دل پر کدورت نہیں آنے پائی اور وہ برابر پرانی روایتوں کو برقرار رکھتے چلے آرہے ہیں - ایسے ہی نیک دل ہندو شاعروں کی نعتیہ نظمیں اس مجموعے میں ہیں —

(چ)

تعلیم

نوپیشہ مدرس

(مترجمہ عبدالنور صدیقی و عبدالشکور صاحبان ' صفحات ۸۹ ' چھوٹی تقطیع ' لکھائی چھپائی اچھی ' قیمت سوا روپیہ ملنے کا پتہ :- مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن)

فن تعلیم پر اردو زبان میں بہت کم ذخیرہ ہے خوشی کی بات ہے کہ

اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے - نو پیشہ مدرس امریکہ کے ایک ماہر تعلیم جے ' ایس ' ڈیوس کی کتاب " دی ینگ ٹیچرس پرائمر " کا ترجمہ ہے - اس میں ان تمام ضروری چیزوں کا ذکر ہے جن سے ایک نو پیشہ مدرس کو واقف ہونا لازم ہے - اس میں حسب ذیل نو باب ہیں ' ضبط جماعت ' داب نظر ' مدرس کی آواز ' ترتیب سوال ' سر انجام جواب ' تختہ سیاہ ' درس کی تیاری ' سبق کی توضیح ' متعلق اطفال - ان نو ابواب میں وہ تمام ضروری ہدایات ہیں جن پر اگر عمل کیا جاے تو ایک نیا مدرس اپنے پیشے میں کامیاب ہو سکتا ہے - مصنف نے بار بار حکم اور نصیحت کرنے کو ملمع کیا ہے - بے شبہہ لایق مصنف کا یہ خیال صحیح ہے کہ کم عمروں اور نو جوانوں کے لئے نصیحت اکثر الٹا اثر رکھتی ہے ' لیکن خود فاضل مصنف نے یہ کتاب جو نو جوان مدرسوں کے لئے لکھی گئی ہے تحکمانہ لب و لہجہ اور واعظانہ انداز میں لکھی ہے تا ہم اس میں نصحیت کی تلخی نہیں - امید ہے کہ یہ کتاب نوجوان تعلیم پیشہ اصحاب کے لئے مفید ثابت ہوگی - ترجمہ صاف سادہ اور عام فہم ہے - ایک آدھ باب میں فنی اصطلاحات آئی ہیں - اگر ان کی ضروری تشریح ایک مختصر ضمیمہ کی شکل میں کردی جاتی تو اچھا تھا —

(چ)

محنت

(مصنفہ عبدالغفار صاحب ' صفحات ۴۸ ' چھوٹی تقطیع لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ - قیمت ۴ آنے - ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی)

یہ مختصر ڈراما بچوں کے لئے لکھا گیا ہے - اس میں یہ بات ثابت کی ہے کہ محنت سے انسان زندگی میں کامیاب و با مراد ہوتا ہے ' محض روپیہ

پیسہ اور دوسرا کوئی ذریعہ انسان کو محنت کے مقابلے میں کامران نہیں کرسکتا ڈرامے کی روئداد اچھی ہے - بچوں کے لئے سبق آموز ہے —

(چ)

مذہب

یاد اسلام

(مصنفہ جناب منشی شاہ محمد ممتاز علی صاحب ' آہ ' امیٹھوی صفحات ۷۶ - چھوٹی تقطیع لکھائی چھپائی اچھی قیمت دس آنے - ملنے کا پتہ :- مولوی محمد ساجد - محلہ مغل پورہ فیض آباد)

اس مثنوی میں مصنف نے اسلام کی عظمت و شان ظاہر کی ہے ' آنحضرت صلعم کی سیرت پاک کو بیان کیا ہے - اسلام کو ایک فطری مذہب ثابت کرنے اور ان شبہات کو عقلی دلائل سے دور کرنے کی کوشش کی ہے جو جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے دل میں اسلام کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں - اس مثنوی کے بعض مضامین مولانا حالی کے انقلاب انگیز مسدس کے مضامین سے ملتے ہیں لیکن جو جوش اور فصاحت اس میں ہے اس میں مفقود ہے - تاہم یہ مثنوی اپنے موضوع ' زبان اور بیان کے لحاظ سے قابل قدر ہے —

(چ)

نیچریت

(مترجمہ جناب عبدالمنان صاحب ' ۶۴ صفحات ' چھوٹی تقطیع '
لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی - قیمت ۶ آنے ملنے کا پتہ :-
کتب خانہ آصفیہ کشمیری بازار لاہور)

علامہ سید جمال الدین افغانی (رح) ' کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ان کا شمار ان نامور بزرگوں میں ھے جنھوں نے مسلمانوں کو ابھارنے اور ان کی قومیت کو زندہ کرنے کے لئے بڑے بڑے جتن کئے ھیں - یہ مختصر رسالہ علامہ موصوف نے بزبان فارسی اس زمانے میں لکھا تھا جب کہ مادہ پرستی اور دھریت کے غلبے سے اکثر مسلمان اندیشہ مند تھے - اس کا مقصد یہ ھے کہ انسان کو مذھب کی طرف توجہ دلائی جاے اور نیچریت کا راز فاش کیا جاے - ھمارے کان اس قسم کے الفاظ سے آشنا ھوگئے ھیں اس لئے ھمیں اس کی کچھہ زیادہ اھمیت نہیں معلوم ھوتی - تقریباً نصف صدی قبل یہ خاص مسئلہ ھو گیا تھا - اس باب میں بے شمار مضامین اور کتابیں لکھی گئی ھیں - مترجم عبدالمنان صاحب نے صاف ترجمہ کیا ھے - شروع میں علامہ موصوف کے سوانح حیات بھی ھیں —

(چ)

یازدہ سورہ شریف

یہ کتاب پیکوارث پریس لاھور نے بڑے اھتمام سے بہت خوش خط اور پاکیزہ کاغذ پر طبع کی ھے - چھپائی بھی اعلیٰ درجے کی ھے - ایسی نفیس طباعت دیکھنے میں نہیں آئی)

اس مطبع نے پارے الم بھی عکسی رنگین چھاپا بہت صاف ستھرا اور عمدہ چھپا ھے - طرز تحریر اس قسم کا ھے کہ بچے اور کم سواد شخص بھی آسانی سے پڑھ سکتے ھیں —

تاریخ

تاریخ الامت حصہ ہفتم

(مصنفہ مولوی محمد اسلم صاحب جیراجپوری - جامعہ ملیہ اسلامیہ - دہلی - قیمت ایک روپیہ)

تاریخ الامت کے اس حصے میں سلاطین و خلفائے عثمانیہ کی سیاسی تاریخ کو اختصار کے ساتھہ پیش کیا گیا ہے - یہ دیکھہ کر تعجب ہوتا ہے کہ اردو میں آج تک دولت عثمانیہ کی تاریخ نہیں لکھی گئی - تاریخ الامت کے اس حصہ سے یہ کمی پوری ہوجائےگی - اس کتاب کے اور دوسرے حصوں کی طرح اس حصے کی زبان بھی نہایت سادہ اور عام فہم ہے - مولانا نے یہ سلسلہ در اصل تعلیمی غرض کے لئے تصنیف کیا ہے - علمی تحقیق کی بجائے مسلمہ تاریخی وقعات کو سلیس اور عام فہم انداز میں طلبہ کے لئے پیش کیا گیا ہے - چنانچہ طلبہ میں یہ پورا سلسلہ بہت مقبول ہوا اور ہر کالج میں اس سے استفادہ کیا جا رہا ہے —

تاریخ الامت کے ساتویں حصے میں دولت عثمانیہ کی بنیاد سے لیکر غازی مصطفی کمال پاشا کے برسر اقتدار ہونے تک کے سارے اہم سیاسی واقعات موجود ہیں - ہماری رائے میں اگر مولانا آئندہ ایڈیشن میں سن ہجری کے ساتھہ ساتھہ سن عیسوی بھی درج کردیں تو طلبہ کے لئے اس میں اور بھی زیادہ سہولت ہوگی —
(ع)

اسلامی خلافت کا کارنامہ دوسرا حصہ

دوسری جلد - مصطفی کمال

(مولفہ حاجی محمد موسی خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑہ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس - صفحات ۳۵۱ ، قیمت ایک روپیہ آٹھہ آنے - آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈہ سے مل سکتی ہے)

اس کتاب کے پہلے حصے پر گزشتہ کسی پرچے میں تبصرہ ہو چکا ہے ·

اس حصے میں حضرت محمد صلعم کے حالات ہجرت مکہ سے سنہ ۵ ہجری تک بیان کئے گئے ہیں - ان حالات کے ضمن میں بہت سے اخلاقی مسائل اور دوسرے ضروری امور اور معاملات پر بھی بحث کی گئی ہے - کتاب کا طرز بیان سادہ ہے اور ہر مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کے متعلق کافی معلومات ہوجاتی ہے اور غیر ضروري طول سے احتراض کیا ہے - جن لوگوں کی رسائی بڑی کتابوں تک نہیں ہے اُن کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے - قابل مصنف کي محنت قابل شکریہ ہے —

حیات احمد بن حنبل

(مولفہ مولانا ، شاہ محمد عزالدین صاحب پھلواری ، صفحات ۷۵ -
قیمت بارہ آنہ - ایک ڈپو پھلواری ضلع پٹنہ)

امام احمد بن حنبل اُن برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے علم اور اسلا م کي بڑی خدمت کی ہے جن کا ایمان ایسا سچا اور مضبوط تھا کہ اس کے لیے انھوں نے ہر طرح کی ایذائیں اور عقوبتیں سہیں اور سخت سے سخت ایذا اور بڑے سے بڑے انعام کے وعدوں سے بھی اس میں ذرہ برابر لغزش نہ ہوی - اس مختصر کتاب میں ان کے حالات اور عقائد وغیرہ بیان کئے گئے ہیں —

اسلامی نظام تعلیم

مترجمہ فضل کریم خاں درانی صاحب بی - اے صفحات ۵۶ - قیمت ۶ آنے
قومی کتب خانہ ریلوے روڈ - لاهور)

یہ رسالہ فاضل مستشرق ڈاکٹر دانیال هانے برک کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے - جس میں فاضل مصنف نے مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو

تحقیق و دیانت سے بیان کیا ہے ۔ یہ بہت دلچسپ ، پر از معلومات اور عبرت خیز مضمون ہے ۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں تقریباً نویں صدی تک بلکہ کچھ بعد بھی مسلمانوں میں طلب علم کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا اور یہ شوق انہیں شہر شہر ، ملک ملک اور جنگلوں اور صحراؤں میں لئے لئے پھرتا تھا ۔ اگرچہ اس کی ابتدا مذہب سے ہوی اور سارا اہتمام اسی کی تعلیم کے لئے تھا لیکن اس کے طفیل میں دوسرے علوم مثلاً صرف و نحو رجال ، فلسفہ و منطق لغت و معانی وغیرہ بھی رواج پاگئے اور رفتہ رفتہ مذہبی دباؤ سے نکل کر خود ایک مستقل حیثیت قائم کرلی - ایک بڑی بات یہ تھی کہ تعلیم میں حکومت کا اثر بہت کم تھا مسجدیں مکتبوں اور مدرسوں کا کام دیتی تھیں اور عام شوق حوصلہ افزائی کرتا تھا ۔ گوبعد میں امرا و وزرا اور بادشاہوں نے بھی بہت کچھ مدد دی اور اس کار خیر کے لئے اوقاف کا انتظام کردیا —

قابل مترجم نے ترجمہ بہت شستہ اور رواں کیا ہے اور علم کی خدمت کی ہے —

دنیا کے بسنے والے

(مولفہ سید بشیر حسین صاحب زیدی بی - اے (کینٹب)
پبلشر — مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ — دہلی —)

اس رسالے میں دنیا کے مختلف حصوں کے باشندوں کے طرز ماند و بود اور ان کی مخصوص ملکی خصوصیت کو نہایت سادہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے - یہ رسالہ در اصل بچوں کے لئے لکھا گیا ہے اور ہمارے خیال میں وہ اس مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتا ہے — اس رسالے میں حسب ذیل ابواب ہیں :—

اسکیمو رِڈ انڈین یا سرخ ہندی ، وسط ایشیا کے کرغی ، سوس ، بدو عرب افریقہ کے بونے ، سیوانا کے حبشی اور جاپان کے لوگ — ہرباب میں تصاویر کے ذریعہ سے باشندوں کی شکل و شباہت اور ملکی پیداوار کو پیش کیا گیا ہے — ان تصاویر کی وجہ سے کتاب کی دلچسپی میں اور اضافہ ہوگیا ہے — مولف نے اس کا خاص

طور پر اہتمام کیا ہے کہ ان کے پیرایۂ بیان سے بچوں کی دلچسپی آخر تک بدستور باقی رہے —

(ی)

منطق و فلسفہ

مبادی فلسفہ حصۂ اول

(یا فلسفہ کی پہلی کتاب ' از مولانا عبدالماجد صاحب بی - اے ' صفحات ۱۸۵ - معارف پریس اعظم گڈھ)

جیسا کہ فاضل مصنف نے دیباچے کے شروع میں بیان کیا ہے یہ " کوئی مستقل تصنیف نہیں ' چند قدیم متفرق فلسفیانہ مقالات کا مجموعہ ہے " - لیکن اُن پر بڑے غور اور احتیاط سے نظر ثانی کی گئی ہے اور اس قدر قطع و برید ' تبدیل و ترمیم ' حذف و اضافہ کیا گیا ہے اور زبان کو شگفتہ اور رواں بنانے میں اس درجے کوشش کی گئی ہے کہ یہ ایک طرح کی جدید تصنیف ہو گئی ہے - اس میں چھہ مقالے ہیں جن میں سے پانچ زمانہ ہوا بعض رسالوں میں شایع ہوئے تھے اور ایک (نفس و مفردات نفس) مصنف کی ایک غیر مطبوعہ و نا تمام تصنیف کا پہلا باب ہے —

اگر چہ تمام مضامین فلسفیانہ ہیں لیکن اس قدر صفائی ' شستگی اور خوبی سے لکھے گئے ہیں کہ یہ صرف فلسفے کے طالب علم ہی کے لئے مفید نہیں بلکہ ہر پڑھا لکھا شخص جسے علم سے کچھہ ذوق ہے ان سے لطف حاصل کر سکتا ہے اور اپنی معلومات میں بہت کچھہ اضافہ کر سکتا ہے - اردو زبان میں اس قسم

کی بہت کم کتابیں ہیں - اس زمانے میں مولانا عبدالماجد صاحب نے فلسفیانہ مضامین کی داغ بیل ڈالی اور اس شعبۂ علم پر مستقل تصانیف اُن کے قلم سے نکلیں اور اب تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے - اسی کتاب کے دیباچے میں دوسرے حصے کی بھی بشارت دی ہے اور امید ہے کہ وہ بھی جلد شایع ہو گی —

یہ کتاب علمی حیثیت بھی رکھتی ہے ادبی حیثیت بھی - اور علم و ادب دونوں کے شائق اسے شوق سے پڑھ سکتے ہیں اور ہماری یونیورسٹیوں کے نصاب میں دونوں حیثیتوں سے شریک ہونے کے قابل ہے —

اساس منطق

(تصنیف مولوی سید ابو سعید عبدالقدوس صاحب بہاری مدرس مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد - صفحات ۵۸ ' قیمت چھ آنے - سید رکن الدین صاحب مدرسہ مصباح العلوم سے مل سکتی ہے)

ہمارے ہاں کی منطق کو سہل زبان میں ادا کیا ہے - ہر بیان کے ساتھ مشقی سوالات بھی ہیں - طلبہ کے لئے مفید ہے —

آزادی

(ترجمہ مولوی سعید انصاری صاحب بی - اے ' مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرولباغ - دہلی)

جان اسٹوارٹ مل کی تصنیف لبرٹی ' علم سیاست کی مشہور کتابوں میں سے ہے - اس میں ان مسائل سے بحث کی گئی ہے جو انفرادی آزادی کی بنیاد ہیں - ' مل ' انفرادیت کا کھلم کھلا حامی تھا - وہ ریاست اور حیات اجتماعی کی

ضرورت کا منکر نہ تھا بلکہ، انہیں فرد کا خادم اور اس کی نشو و نما کا آلہ کار تصور کرتا تھا - اس کتاب میں اس نے فرد کے حقوق کی حمایت کی ہے —

اس کتاب کو سعود انصاری صاحب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے - ترجمہ، سادہ اور عام فہم ہے - لیکن بعض جگہ مطالب میں پورے طور پر صفائی نہیں پیدا ہوئی - اس ترجمہ کے شروع میں پروفیسر محمد مجیب صاحب بی - اے (اکسن) کا نہایت پر مغز اور ساتھہ ہی دلچسپ مقدمہ بھی ہے - اس میں 'مل' کے فلسفہ پر بحث کی گئی ہے - کتاب حسب ذیل ابواب پر منقسم ہے - باب اول دیباچۂ مصنف؛ باب دوم آزادئی خیال ومباحثہ؛ باب سوم انفرادیت بہبود انسانی کا ایک ذریعہ ہے؛ باب چہارم فرد پر جماعت کے اختیارات کے حدود؛ باب پنجم مثالیں (اس میں ان اصول و مبادیات کی عملی مثالیں پیش کی گئی ہیں جن کا تعلق نفس موضوع سے ہے) - یہ ترجمہ سلسلۂ اردو اکاڈیمی کا انیسواں نمبر ہے —

(ی)

(اس کتاب کا ترجمہ مدت ہوئی راجہ نرندرو ناتھہ صاحب نے کیا تھا، کیا اچھا ہوتا کہ مترجم صاحب اُسے دیکھہ لیتے - اگر اُس سے مقصد پورا ہو جاتا تو مناسب تغیر و تبدل کے ساتھہ راجہ صاحب سے اجازت لے کر شایع کر دیتے اور اس زحمت سے بچ جاتے —

(اڈیٹر اردو)

متفرقات

Europe's Debt to Islam

یعنی اسلام کا احسان یورپ پر

(مولفہ سید ایم - ایچ زاهدی صاحب - کلکتہ - قیمت ایک روپیہ دو آنے - طلبہ سے بارہ آنے)

اس رسالے میں قابل مولف نے عربوں کی علمی ترقی کا خاکہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے -

اگرچہ یہ رسالہ مختصر ہے تاہم مولف نے اُن تمام علمی ترقیوں کو جو مسلمانوں نے ہر شعبے میں کی تھیں اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے کے بعد دل پر اس کا کچھ نہ کچھ نقش باقی رہ جاتا ہے - ملک کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر پی - سی- رے نے اس پر ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے —

گلگشت دکن

(مصنفہ جناب مولوی محمد صبغت اللہ صاحب شہید انصاری
صفحات ۴۸ - چھوٹی تقطیع - مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ)

مصنف نے اس مختصر رسالے میں اپنے سفر دکن کے حالات لکھے ہیں - ان کا قیام دکن کے مختلف شہروں میں تین ہفتے رہا ہے اس عرصے میں انھوں نے دکن کی جن علمی ' معاشی اور تمدنی ترقیوں کا مطالعہ کیا ہے ان کو سلیقے سے قلم بند کردیا ہے - جو لوگ دکن کے حالات سے بالکل ناواقف ہیں ان کے لئے یہ رسالہ مفید ہے —

(چ)

اردو کے جدید رسالے

الوائدہ

(ماھانہ - اڈیٹر ایم - کے - خاں صاحب - لاھور سالانہ چندہ تین روپے آٹھ آنے)

یہ عیسائی مشنریوں کا ماھانہ رسالہ ہے جو اسی جنوری سے لاھور سے شایع

ہونا شروع ہوا ہے - اگرچہ عنوان پر مذہبی کے ساتھہ " معاشرتی اور سیاسی ماہوار اردو رسالہ " لکھا ہے لیکن پہلے نمبر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیادہ تر مذہبی ہے جس کا مقصد عیسائی مذہب کی خوبیاں دکھلانا ہے - پہلے سولہ صفحوں میں چند مضمون مختلف مذہبی اور غیر مذہبی مضمون ہیں باقی ایک جز پر " سلطان التفاسیر " ہے جو مسلسل اس رسالے میں شایع ہوگی - یہ قرآن شریف کی تفسیر ہے جس کے لکھنے والے پادری مولوی سلطان محمد خاں صاحب پروفیسر عربی ایف - سی کالج لاہور و اڈیٹر نور افشاں ہیں معروف بہ پادری ایس - ایم پال جس کے متعلق یہ دعوی کیا گیا ہے کہ وہ بڑے تحقیق اور مدت دراز کے مطالعہ اور غور کے بعد لکھی گئی ہے - تفسیر کا منشا معلوم ہے - لیکن ہم اتنا ضرور کہتے ہیں کہ پادری صاحب ایک عالم آدمی ہیں انہوں نے اپنی اس تالیف میں ہر بحث کو بہت تہذیب اور شایستگی سے بیان کیا ہے اور ادب و احترام کو ہر موقع پر ملحوظ رکھا ہے - ان سولہ صفحوں میں صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے جو ابھی ختم نہیں ہوئی —

مارچ کے نمبر میں علاوہ تفسیر اور دوسرے مضامین کے یوسف علیہ السلام کا ڈراما اور ایک چھوٹا فسانہ بھی ہے —

رسالے کو سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے —

طبیب

(ماہانہ - انجمن خدام الطب پٹنہ - مدیر محمد شریف صاحب بازید پوری - چندہ ایک روپیہ)

یہ رسالہ گورنمنٹ طبیہ اسکول پٹنہ کے اساتذہ کی سرپرستی میں اسی سال شایع ہوا ہے - طبی مسائل پر مضامین شایع ہوتے ہیں اور طبی کالجوں کے متعلق معلومات کا اندراج بھی ہوتا ہے عام فائدے کے مضامین بھی لکھے

جاتے ھیں - اور قدیم اور جدید طب دونوں پر بحث ھوتی ھے - مفید رسالہ ھے اور بہت سستا —

ضیائے شمس

(ماھانہ - مدیر ظہیر احمد شمس صاحب سہارنپوری
سالانہ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے - سہارنپور

ادبی رسالہ ھے - سہارنپور سے شایع ھوتا ھے اس لئے بہت غنیمت ھے —

ستارہ

(ماھانہ - اڈیٹر راجیشور ناتھہ ورما - سالانہ چندہ دو روپے - لاھور)

ادبی رسالہ ھے - جس میں زیادہ تر نظم ، فسانے اور ڈرامے وغیرہ کی گنجائش ھے - اس کے لئے اڈیٹر صاحب نے اچھا سامان جمع کیا ھے - البتہ کوئی خاص بات نہیں ھے —

رسالوں کے خاص نمبر

حریم

یہ عورتوں کا رسالہ ھے اور لکھنؤ سے نکلتا ھے - اس کا سال نامہ بہت خوش نما

چھپا ہے اور بہت کام کے اور لطف کے مضامین جمع کئے ہیں - حفظان صحت ' تعلیم نسواں ' اصلاح رسوم ' طرح طرح کے فسانے ' نظمیں ' دستکاری کے گر اور سب سے زیادہ پر لطف بعض لذیذ کھانوں کے پکانے کی ترکیبیں ' یہ سب کچھہ اس میں موجود ہے - پڑھی لکھی عورتوں اور لڑکیوں کے لئے اس رسالے میں تفریح و تعلیم کا اچھا خاصا سامان موجود ہے - قیمت اس سال نامے کی ایک روپیہ ہے حجم تخمیناً سوا دو سو صفحے ہے یہ قیمت کچھہ زیادہ نہیں —

ہمایوں

یہ رسالہ میاں بشیر احمد صاحب بی - اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا کی زیر ادارت ایک خاص اصول اور متانت کے ساتھہ شایع ہوتا ہے - جنوری میں اس کا سالگرہ نمبر شایع ہوا جس میں تنوع مضامین کے ساتھہ ہر قسم کی دلچسپی اور حسن خوبی کا خیال رکھا گیا ہے - متین تحریروں کے ساتھہ تفریحی مضامین بھی ہیں - حکیمانہ نظموں کے ساتھہ غزلیں بھی ہیں - چھوٹے فسانے ہیں تو ڈرامے بھی ہیں - خود فاضل اڈیٹر اور شریک اڈیٹر کی اچھی اچھی نظمیں درج ہیں - تصویروں کا معاملہ بہت بے ڈھب ہے تاہم ہمایوں کی تصویریں معقول ہیں اور مقابلتاً بہتر ہیں - اردو رسالوں کی تصویروں میں بہت کچھہ اصلاح کی ضرورت ہے —

الہام (عید نمبر)

یہ رسالہ پندرہ روزہ ہے اور مولانا ابوالکلام ساحر دہلوی کی زیر ادارت دہلی سے شایع ہوتا ہے - اس رسالے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شروع سے آخر تک منظوم ہوتا ہے - چونکہ یہ عید نمبر ہے اس لئے عید پر متعدد نظمیں ہیں —

مدت ہوئی لکھنؤ سے ایک منظوم اخبار نکلا تھا جس میں خبریں تک نظم میں ہوتی تھیں —

مشیر باغ بانی

پروفیسر جی- ایم - ملک ایم- ایس سی (زراعت امریکہ) کی اڈیٹری میں لاہور سے شایع ہوتا ہے - اس نے بھی اپنا سالگرہ نمبر شایع کیا ہے - اس میں کاشتکاری اور باغ بانی کے متعلق بہت سی کار آمد باتیں ملتی ہیں - جن لوگوں کو اس فن سے دلچسپی ہے وہ اس رسالے کو ضرور پڑھیں —

میثاق (عید نمبر)

قابل اڈیٹر نے بڑی محنت سے عید پر مضامین اور نظمیں حاصل کی ہیں- شروع سے آخر تک سب مضمون عید سے متعلق ہیں - یہ کوئی آسان بات نہیں- رسالے کی حیثیت دیکھتے ہوے یہ عید نمبر بہت غنیمت اور تعریف کے لائق ہے —

اردو

جلد ۱۲ جولائی سنہ ۱۹۳۲ع حصہ ۴۷

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

روسی ناول

پہلا دور

پہلا باب

نکولائی و سیل یوچ گو گول

(۱۸۵۰ - ۱۸۰۹)

از

جناب مولوی محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)

روسی انشاپردازی کی پہلی کوششوں کا ذکر ایک گذشتہ باب میں ہوچکا ہے - گو گول کی تصانیف میں روسی ناول اور ڈراما پہلی مرتبہ اپنی مخصوص اور دلفریب شکل میں نظر آتے ہیں - اس وقت تک روسی ادیب یورپی مذاق کی پیروی کرتے رہے تھے ' گو گول نے ہمت سے کام لے کر اپنی بات اپنے انداز سے کہی ' اور تعلیم یافتہ روسیوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا - اس کے زمانے میں رومانیت کا اثر زائل نہیں ہوا تھا ' پشکن کے قصے اور اکثر نظمیں اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں ' اس کی ایک جھلک تورگنیف کے افسانوں میں بھی ملتی ہے ' لیکن گو گول کے افسانوں میں اس کی بو بھی نہیں ' تربیت اور مذاق کے اعتبار سے وہ ٹھیٹھ دیسی آدمی تھا ' اور بعد کی زندگی بھی اس کی طبیعت کو بدل نہ سکی ' وہ صوبہ اوکرائن کے ایک گانوں میں پیدا ہوا -

اس کا باپ کوسک نسل کا ایک چھوٹا زمینڈار تھا ' اور اس کا بچپن ایک ایسی فضا میں گذرا ' جس پر پرانی کوسک وضع اور فلسفۂ زندگی کا اثر اس وقت تک نمایاں تھا ' گوگول کی ذهنیت اس دیہاتی کی سی تھی جو شہری زندگی کی نفاستوں سے مرعوب نہیں هوتا ' اسکول اور کالج میں اس کی آزاد خود مختار اور مغرور طبیعت نے اس کی تعلیم میں بہت خلل ڈالا - اکثر مضمون جو پڑھائے جاتے تھے نا پسند تھے یونانی اور رومن ادب کو وہ حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا ' اور جرمن اور فرانسیسی انشا پردازی کی بھی اس کے دل میں زیادہ عزت نہیں تھی اس لئے اس نے ان چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی - عام معیار کے لحاظ سے اس کی تعلیم خراب رهی ' لیکن اس خرابی کا نتیجہ اچھا نکلا - اس نے طالب علمی کے زمانے هی سے ناولیں ' افسانے اور ڈرامے لکھنا شروع کر دئیے ' اور یہ مشق آگے چل کر بہت کار آمد ثابت هوئی - اٹھارہ برس کی عمر میں وہ اپنا وطن چھوڑ کر پیٹر برگ پہنچا ' اور وهاں اُسے وزیر زراعت کے دفتر میں ملازمت مل گئی - لیکن اس کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ ایک طریقے پر زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا - دو سال کے اندر اس نے ملازمت ترک کر دی ' اور یورپ کا سفر کرنے کے ارادے سے روانہ هوا ' مگر آدھے راستے سے واپس آ گیا - اس کی تعلیم کی طرح اُس کے اس سفر کا نامکمل رہ جانا بھی اس کی ذهنی آزادی کی علامت تھی اور یہ اس کے حق میں بہت اچھا هوا ' اگر وہ یورپ جاتا تو ممکن هے اپنے خلقی ذوق اور آزادی کو وهیں چھوڑ آتا ' سفر سے واپس آنے کے بعد اس نے انشا پردازی کا شغل اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ دیکھا ' اور ۱۸۳۱ میں اس کی پہلی کامیاب تصنیف شائع هوئی ' جس کا عنوان " جکانکا کے قریب ایک باڑی میں سنی هوئی کہانیاں " تھا - افسانوں کے اس مجموعے نے

گوگول کومشہور کر دیا ' کیونکہ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جنھوں نے گوگول کو روسی ادب میں اس کے بلند درجے پر پہنچایا ہے ـــ

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے - ان افسانوں میں دیہاتی زندگی کے قصے سنائے گئے ہیں - یہ بجائے خود ایک جدت تھی ' مگر ان افسانوں کے اور اوصاف کے مقابلے میں یہ بہت ادنیٰ صفت معلوم ہوتی ہے - گوگول نے اُوکرائن کے مناظر قدرت کی نہایت دلکش تصویریں کھینچی ہیں ' اسے زبان پر اتنی قدرت تھی کہ اس کی باریک بین‌نظر اس کا نازک احساس اور اس کی ہمدردی بھری ظرافت اپنا پورا کمال دکھا سکی ' اس کے افسانوں میں مافوق الفطرت قوتوں کا اکثر ذکر آتا ہے ' ان میں بھوت پریت ' چڑیلیں اور شیطان بے تکلفی سے انسانی زندگی میں شریک ہوتے ہوئے اور مداخلت کرتے دکھائے گئے ہیں ' لیکن جن لوگوں کا رهنا سہنا اور فلسفۂ زندگی بیان کیا گیا ہے ' وہ ان سب چیزوں کو مانتے تھے اور اس عقیدے کو ان کے کردار سے بہت گہرا تعلق تھا ' اس لئے در اصل بھوت پریت کے ذکر سے افسانوں کی حقیقت نگاری پر حرف نہیں آتا ' گوگول کی طبیعت میں دیہاتی فضا اور دیہاتی لوگوں کی سرشت کے ہر رنگ اور ہر کیفیت کے سمجھنے کی وجدانی قوت تھی ' اس کی زبان کی شستگی ' شیرینی اور روانی ' پڑھنے والے کے سامنے ایسی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر دیتی ہے کہ حقیقت اور افسانے کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے '

" اوکرائن کی رات دیکھئے : بیچ آسمان سے چاند زمین کو تک رہا ہے ' آسمان کا گنبد جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ' معلوم ہوتا ہے پھیل کر اور وسیع ہو گیا ہے - اور اب گرم ہے اور سانسیں بھر رہا ہے ' ساری زمین پر سیمیں روشنی چھٹکی ہوئی ہے : پرتا ثیر ہوا میں خنکی ہے ؛

وہ آدمی کو گلے مل کر بھیجتی ہے اس کی رفتار متوالی اور خوشبوؤں کے سمندر کو جنبش دیتی ہے ، جانفزا رات ، مسحور کن رات ! جنگل ، کسی روحانی کیف میں ڈوبے ہوئے ساکت کھڑے ہیں اندھیرے میں لپٹے ہیں ، اور اپنے سائے سے دور دور تک اندھیرا پھیلا رہے ہیں ، تالاب خاموش اور ساکن ہیں ، ان کی سطح پر ایک لہر تک نہیں ، ان کے پانی کی ٹھنڈک اور تاریکی باغوں کی سیاہی مائل سبزدیواروں میں قید ہے ، اور قید ہونے سے کچھ اداس ہوگئی ہے ، جنگلی پھلوں کی گھنی جھاڑیاں جن میں کسی انسان نے آج تک قدم نہیں رکھا ہے ڈرتی ڈرتی اپنی جڑوں کو چشمے کے ٹھنڈے دھارے کی طرف پھیلاتی ہیں ، اور ان کی پتیاں چپکے سے کچھ کہتی ہیں ، ایسے لہجے میں جس سے ناراضگی اور خفگی ظاہر ہوتی ہے ، جب رات کی ہوا کا کوئی شریر جھونکا آہستہ آہستہ آتا ہے اور آنکھ بچا کر ان کا بوسہ لے لیتا ہے ، ساری زمین پر نیند طاری ہے ، مگر آسمان پر چاند اور تارے سب آنکھیں کھولے جاگ رہے ہیں ، اور اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں - انسان کی روح میں اس وقت عجیب وسعت پیدا ہوجاتی ہے ، اور اس کی تہ سے ہزارہا چاندی کی طرح چمکتے ہوے خیالی پیکر نکل کر دنیا کو آباد کر دیتے ہیں - جانفزارات ! مسحور کن رات ! یکبارگی خاموشی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے ، اور جنگل اور تالاب اور میدان سب جاگ اٹھتے ہیں ، ہر طرف سے اُکرائنی بلبلوں کے نغموں کی بارش ہونے لگتی ہے ، اور خیال ہوتا ہے کہ چاند تک ان کے سریلے راگوں کو محویت سے سن رہا ہے .... ٹیلے پر گانو اونگھہ رہا ہے ، جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو - چاندنی میں اس کے جھونپڑے چمکتے ہیں ، اور رات کے ساتھہ ان کی چمک بڑھتی جاتی ہے .... گانو والے سب جی بھر کر گیت گا چکے ہیں ، اب ہر طرف خاموشی ہے ، بھلے آدمی سب سو گئے ہیں ، صرف کہیں کہیں تنگ کھڑکیوں میں چراغ کی روشنی نظر آتی ہے یا کسی گھرانے کے لوگ جنھیں کسی وجہ سے دیر

ہوگئی ہے دروازے کے باہر بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے ہیں ....''
یہ منظر '' مئی کی رات '' سے لیا گیا ہے ' جو اس مجموعے کا ایک افسانہ ہے ' اسی افسانے کے دو اشخاص سراپا ملاحظہ ہو : ایک گانو کا مکھیا ہے' دوسرا شراب ساز جو گانو میں شراب کا کارخانہ قائم کرنے کے لئے آیا ہے —

'' مکھیا کے ماتھے پر ہمیشہ بل رہتے ہیں' اس کا چہرہ روکھا ہے' وہ زیادہ بک بک پسند نہیں کرتا' بہت زمانہ ہوا........ جب ملکہ کیتھرین اللہ بخشے' دارالسلطنت سے کریمیا جارہی تھیں تو وہ ان کے ہمراہ بوتی گارڈ کے طور پر جانے کے لئے اپنے گانو والوں میں سے منتخب کیا گیا تھا' اور اسے شاہی کوچوان کی بغل میں بیٹھنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا . اسی زمانے سے مکھیا نے عقلمندی اور اہمیت کے احساس سے سر جھکانا' اپنی لمبی اور جھکی ہوئی مونچھوں پر تاؤ دینا اور ہر چیز کو ترچھی' شکرے کی سی تیز نظر سے دیکھنا سیکھا' اسی زمانے سے مکھیا میں اس کی قابلیت پیدا ہوگئی کہ چاہے جس مسئلہ پر گفتگو ہو وہ باتوں کو ایر پھیر کر اپنی اس داستان کی طرف لے آئے کہ وہ ملکہ کی ہمراہی کے لئے کس طرح سے منتخب ہوا' اور اسے شاہی کوچوان کی بغل میں بیٹھنے کا شرف کیونکر حاصل ہوا . مکھیا کو کبھی کبھی بہرا بننے میں مزہ آتا ہے' خصوصاً جب اسے ایسی باتیں سنائی جاتی ہیں' جنھیں وہ سننا نہیں چاہتا ہے' مکھیا لباس میں کسی قسم کا بانکپن برداشت نہیں کرسکتا .... مکھیا رنڈوا ہے' مگر اس کے گھر میں اس کی سالی رہتی ہے' جس کا کام دونوں وقت کھانا پکانا ' بنچیں دھونا ' مکان پر سفیدی کرنا' کپڑوں کے لئے سوت کاتنا' اور گھر گرستی کی

دیکھہ بھال کرنا ہے، گانو میں مشہور ہے کہ مکھیا سے اس کی کوئی عزیز داری نہیں، لیکن ہم کو معلوم ہے کہ مکھیا کے بہت سے بدخواہ ہیں، جو ہر قسم کی افواہ خوشی سے پھیلانے پر تیار رہتے ہیں .... یہ بھی ممکن ہے، لوگوں کو بات بنانے کا موقع اس وجہ سے ملا ہو کہ مکھیا کی سالی کو ہمیشہ برا لگتا ہے، اگر مکھیا کسی ایسے کھیت میں چلا جائے جہاں گانو کی عورتیں کام کرتی ہوتی ہیں، یا ایسے کوسک سے ملنے جاتا ہے، جس کے گھر میں جوان لڑکی ہوتی ہے، مکھیا کانا ہے، مگر اس کی اکیلی آنکھہ — بڑی شریر ہے، اور دور سے خوبصورت عورت کو پہچان لیتی ہے - ہاں، مگر وہ خوبصورت چہرہ کی طرف توجہ کرنے سے پہلے اچھی طرح اِدھر اُدھر دیکھہ لیتا ہے، کہ کہیں اس کی سالی کی نظر تو اس پر نہیں پڑ رہی ہے ...."

شراب ساز مکھیا کے یہاں مہمان آیا ہے . " ایک ٹھنگنا، موٹا سا آدمی جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہر وقت ہنستی رہتی ہیں، غالباً وہ اس خوشی کو ظاہر کرنے کے لئے جو اُسے اپنا چھوٹا سا پائپ پینے میں ہوتی ہے . وہ ہر مدت تھوکتا رہتا ہے، اور اس کے ساتھہ ہی انگلی سے پائپ میں تمباکو کی راکھہ دبا تا جاتا ہے . دھوئیں کے بادل اس کے منھہ اور اس کے پائپ سے نکل کر ہر طرف چھاگئے ہیں، اور خود اسے بھی سرمئی رنگ کے کہرے نے لپیٹ لیا ہے . معلوم ہوتا ہے کسی شراب کے کارخانے کا دود دان جو چھت پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہے، سیر کے شوق میں نکلا ہے اور مکھیا کے گھر میں آکر ادب سے میز کے پاس بیٹھہ گیا ہے شراب ساز کی ناک کے نیچے اس کی گھنی اور چھوٹی مونچھیں ہیں، جن کے سارے بال کھڑے ہیں، لیکن پائپ کے دھوئیں میں وہ بہت دھندلی نظر

آرہی ہیں، اور خیال ہوتا ہے وہ مونچھیں نہیں ہیں بلکہ ایک چوہا جسے شراب ساز منہ میں دبائے ہوئے ہے ......''

" باڑی میں سنی ہوئی کہانیوں " کے بعد ہی گوگول نے ایک مجموعہ " میر گوروو'' کے عنوان سے شائع کیا - میر گوروو نام ہے پولتاوا کے پاس ایک گانو کا جس میں گوگول پیدا ہوا تھا، اس مجموعے میں گوگول کی انشا پردازی کی خوبیاں اور نکھر آئیں - اور اس میں ظرافت کے ساتھ درد ہے جو پہلے مجموعے میں نہیں پایا جاتا - ' ایک آنکھ سے ہنسنا ' ایک سے رونا ' گوگول کی انشا پردازی اور حقیقت نگاری کا خاص وصف ہے ' اور اس مجموعے میں یہ وصف اپنی پوری شان سے نظر آتا ہے - لیکن گوگول کی طبیعت نہ معلوم کس وجہ سے ناول نویسی سے ہٹ گئی ' اور اس نے روس کوچک * کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کرکے قدیم کتابوں اور تاریخی داستانوں کا مطالعہ شروع کیا - اس میں مورخ بننے کی صلاحیت بہت کم تھی ' اور اس کے مطالعے کا پہلا نتیجہ - " تراس بلبا " ایک تاریخی ناول کی صورت میں نکلا - ناول کی تاریخی بنیاد بہت کمزور ہے ' کبھی کبھی مصنف بھول جاتا ہے کہ اسے زمانہ زیر بحث کے ذہنی معیار کا لحاظ رکھنا چاہئے ' اور اس لئے بعض تقریریں جو ناول کے اشخاص کرتے ہیں مصنوعی معلوم ہوتی ہیں ' مگر رزمیہ داستان کی حیثیت سے ناول نہایت قابل قدر ہے ' اور کوسک نسل کی مردانگی ' بہادری ' جفا کشی اور سادگی کی جو تصویریں

---

* روس کا جنوب مغربی حصہ جس میں " چھوٹے " روسیوں کی نسل آباد ہے - " چھوٹے " اور " بڑے " روسیوں میں قد کے علاوہ سیرت اور مزاج کا بھی کچھ فرق ہے ' " چھوٹا " روسی فطرتاً ہنس مکھ ہوتا ہے " بڑا " روسی غمگین اور یاس مشرب —

کھینچی گئی ھیں بہت ھی ھمت افزا اور سبق آموز ھیں ' ایک بوڑھے باپ کا اپنے بیٹوں کی طاقت آزمائی کے لئے ان سے کشتی لڑنا ' اس کے ایک لڑکے کا شائستگی اور نفاست پسندی کی تحقیر کرنے کے لئے بہت اچھے کپڑے پہن کر زمین میں لوٹنا ' اس ماں کے دل کی کیفیت جو اپنے بچوں کی ھمت جواں مردی پر فخر کرتی ھے مگر دل سے خوف اور اندیشہ ' نہیں نکال سکتی ھے یہ سب پہلے صفحوں ھی میں بیان کیا گیا ھے ' اور سارے ناول میں یہ فضا قائم رھتی ھے ' " تراس بلبا " کی تصنیف کے بعد گوگول کا تاریخی مطالعہ کچھہ دن جاری رھا ' مگر روس کو چک کی تاریخ محض خیال ھی کی صورت میں رھی - چند مضامین کی بنا پر جو بظاھر بہت عالمانہ تھے گوگول کو تاریخ کے پروفیسر کی جگہ مل گئی ' مگر اس کے علم کا سارا سرمایہ پہلے لکچر میں ختم ھو گیا اور تقرر کے ڈیڑھ سال بعد اسے مجبوراً استعفا دینا پڑا —

اس کے بعد پھر گوگول نے عالم فاضل سمجھے جانے کی ھوس نہیں کی اور ناول نویسی میں مشغول ھو گیا ' دو تین سال کے اندر اس نے " گل کاریوں اور کہانیوں " کے عنوان سے افسانوں کا تیسرا مجموعہ شائع کیا جس کے بہترین قصے " پرانی وضع کے زمیندار " " اوان اوان کی لڑائی " نفسکئی پروسپکٹ " اور " لبادہ " ھیں —

" پرانی وضع کے زمیندار " ایک بڈھے اور بڑھیا افناسی ئی اوانووچ اور پلخیریا اوانو فنا کی کہانی ھے - دونوں چین سے رھتے تھے ' ایک دوسرے سے اور ساری دنیا سے خوش تھے - لیکن اگر زندگی کے معنی حرکت اور تغیر ھیں تو وہ دونوں جوانی میں بھی " زندگی " کی نعمت سے محروم تھے - گوگول کو ان سے بہت محبت ھے - ان کے سفید بالوں سے اور ان

کے معصوم دلوں سے ' مگر ان کی تصویر کھینچنے میں اس کا اصل مقصد روسیوں کی ذہنی بے مائیگی اور ان کی زندگی کا جمود دکھانا ہے ' اور اس لحاظ سے یہ افسانہ ایک ادبی کارنامہ ہے افناسی اوانووچ دن بھر کھاتے رہتے ہیں ' ان کی بیوی پلخیریا اوانوفنا کا دن میٹھے اچار اور مربے تیار کرنے میں گزرتا ہے ' گفتگو بھی کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق ہوتی ہے البتہ " کبھی کبھی آسمان صاف ' دن اجالا اور کمرے خوب گرم ہوئے تو افناسی اوانووچ کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے ' اور وہ پلخیریا اوانوفنا کا مذاق اڑاتے ہیں .... "

پلخیریا اوانوفنا ' اگر ہمارے گھر میں ایک بارگی آگ لگ گئی تو پھر ہم کہاں جائیں گے ؟ "

" یہ لو - خدا نہ کرے ! " بڑی بی کہتی ہیں اور صلیب کا نشان بناتی ہیں —

" پھر بھی ' فرض کرو کہ ہمارے گھر میں آگ لگ گئی تو ہم کہاں بھاگ کر جائیں گے ؟ "

" خدا جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں - افناسی اوانووچ ! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے گھر میں آگ لگ جائے ؟ خدا کو یہ ہرگز منظور نہ ہوگا ۔ "

" پھر بھی اگر سب کچھ جل گیا ؟ "

گھر سب جل جائے تو میں باورچی خانہ میں چلی جاوں گی ' اور آپ اس کمرے میں جہاں چوکی دارنی رہتی ہے ۔ "

" اگر باورچی خانے میں آگ لگ گئی اور سب جل گیا ؟ "

" لو اور سنو ! خدا ہمیں ایسی مصیبت سے بچائے کہ گھر میں آگ لگ جائے اور باورچی خانے میں بھی ' اگر ایسا ہوا تو ہم گودام میں

جاکر رہیں گے ' جب تک دوسرا مکان نہ بن جائے ."

" اور اگر گودام میں بھی آگ لگ گئی ؟ "

" خدا جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں ' بس اب میں بہت سن چکی ' یسی باتیں کرنا گناہ ہے ' ایسی باتوں کی خدا کے یہاں سے سزا ملتی ہے !"

افناسی اوانووچ ' اس بات سے خوش ہوکر کہ اُنھوں نے پلخیر یا اوانوفنا کا مذاق اُڑایا ہے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے مسکراتے رہتے ."

ایسی زندگی کا انجام بھی بہت مناسب ہوا : پلخیر یا اوانوفنا کی بلی کھوگئی ' کچھہ دنوں کے بعد انھیں اسی طرح کی بلی باغ میں دکھائی دی ' اور وہ اسے چمکار پکار کر گھر ساتھہ لائیں ' اور پیالہ بھر دودہ اس کے سامنے پینے کے لئے رکھدیا ' مگر جیسے ہي اُنھوں نے اس کی پیٹھہ سہلانے کے لئے ہاتھہ بڑھایا بلی زن سے کھڑکی سے کود کر نکل بھاگی ' پلخیر یا اوانوفنا کو یقین ہوگیا کہ در اصل یہ ایک بلی نہیں تھی بلکہ ان کی موت جو بلی کی شکل میں آئی تھی ' انھوں نے گھر کا سب سامان ٹھیک کیا ' افناسی ئی اوانووچ کے لئے اتنے مربے اور اچار تیار کردئے کہ وہ برسوں تک کھاتے رہیں اور یہ وصیت کی کہ ان کا کفن ململ کا ہو ' اس لئے کہ وہ سستا ہے ' اور اسی کا سا جو دوسرا کپڑا رکھا ہے اس کي افناسئی اوانووچ کے لئے عبا تیار کرائی جائے . یہ وصیت کرنے کے کچھہ دنوں بعد وہ مرگئیں ' افناسئی اوانوچ چار پانچ سال اور زندہ رہے ' اور پھر خوشی خوشی اپنی پلخیر یا اوانوفنا سے ملاقات کے لئے چل دئے —

" اوان اوان ' کی لڑائی " عام روسی زندگی کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالتی ہے . دو اوسط درجے کے زمیندار ذرا سی بات پر ایک دوسرے

سے بگڑ جاتے ھیں - ان میں صلح کرانے کی بہت کوشش کی جاتی ھے، دونو چاھتے ھیں کہ پھر آپس میں دوستی ھوجائے، مگر عین اس وقت جب وہ بغل گیری کے لئے طیار ھوتے ھیں، تو ذرا سی بات پر لڑائی ھو جاتی ھے، اور مفاھمت کی کوئی صورت باقی نہیں رھتی —

" نفسکئی پر اسپکٹ " میں گوگول نے روسی شہر کی ایک درد ناک داستان سنائی ہے - دو نوجوان، ایک فوجی افسر، اور دوسرا مصور جن کی آپس میں جان پہچان تھی، پیٹر برگ کی مشہور سڑک نفسکئی پر اسپکٹ پر چلے جارھے تھے، ان کے سامنے سے دو عورتیں گذریں، جونہایت حسین تھیں، ان میں سے ایک کے بال سیاہ تھے، دوسری کے سنہرے، فوجی افسر نے سنہرے بالوں والی کا پیچھا کیا، مصور نے سیاہ بالوں والی کا، محض اس ارادے سے کہ اِس کے مکان کی شان و شوکت دیکھے، کیوں کہ بظاھر وہ بہت امیر معلوم ھوتی تھی، لیکن وہ ایک معمولی طوائف نکلی، مصور کی بھولی معصوم طبیعت، جس پر اس عورت کے حسن کا بہت اثر ھوا تھا، اس صدمے کی تاب نہ لاسکی، اور چند دنوں میں وہ ایک نازک پھول کی طرح کمھلا کر مر گیا - جس عورت کے فراق میں فوجی افسر گیا تھا وہ ایک جرمن موچی کی بیوی تھی، افسرنے بہت کوشش کی کہ اس سے آشنائی ھوجائے، مگر کامیاب نہ ھوا، اور آخر کار جب جرمن موچی نے اسے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ اکیلا دیکھا تو اپنے دوست کی مدد سے اسے اٹھاکر دروازے کے باھر پھینک دیا - فوجی افسر ایسا بے حیا تھا کہ اس بے عزتی کا اس پر کوئی اثر نہیں ھوا - اور دوسرے دن وہ اسے بالکل بھول گیا —

" نفسکئی پراسکت " گوگول کے عام طرز سے جدا ھے، مگر اس میں بھی اس کی باریک بینی اور ظرافت اپنا رنگ دکھاتی ھیں . صبح سے

شام تک جو مختلف قسم کے لوگ نفسکئی پراسپکٹ پر سے گذرتے ہیں ان کے اوصاف نہایت مفصل اور دلچسپ طریقے پر دکھائے گئے ہیں ۔ جرمن موچی، جو اپنی ناک کٹوا ڈالنا چاہتا ہے، کیونکہ ناک کی وجہ سے اس کی ناس لینے کی عادت پڑ گئی ہے، اور ناس خریدنے میں اس کا بہت روپیہ صرف ہوتا ہے، گوگول کے بہترین مضحک کیرکٹروں میں سے ہے ۔

اس وقت تک گوگول کے تصور نے جو خیالی پیکر بنائے تھے، وہ روسیوں کے سچے نمونے تھے، لیکن وہ کیرکٹر جس کے ہم شکل روسی ناولوں میں ہزاروں کی تعداد میں نظر آتے ہیں اور جسے عام رائے نے روسی تمدن کی مخصوص پیداوار قرار دیا ہے، پہلی بار گوگول کے افسانے " لبادے " میں اپنی صورت دکھاتا ہے، " لبادے " کا ہیرو اکاکئی اکاکئے وچ ایک مضحک مگر سیدھا سادا اور مسکین آدمی ہے، جسے دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ کہہ اٹھتے ہیں، : " دیکھو بچارے غریب کو " اکاکئی اکاکئے وچ ایک دفتر میں نوکر ہے، جہاں اسے زیادہ تر کاغذات اور خطوط نقل کرنے کے لئے دیے جاتے ہیں ۔ اس کام سے اس کا جی نہیں گھبراتا، بلکہ اسے اس میں خاص لطف آتا ہے، کیونکہ اسے خوش نویسی کا شوق ہے، اور اس کام میں اسے خوش نویسی کا بہت موقع ملتا ہے، خطوط اور کاغذات نقل کرنے کا کام اس کے لئے پر لطف اور رنگا رنگ احساسات کا ایک عالم تھا ایک خاص قسم کے خط اسے بہت ہی پسند تھے ۔ اگر انہیں دوبارہ لکھنا ہوتا تو اسے دلی مسرت ہوتی ۔ " لیکن " شوق " اور " لطف " کے الفاظ اکاکئی اکاکئے وچ کے صحیح جذبات ادا نہیں کرسکتے، اسے اپنے کام سے حقیقی عشق ہے، اس کی ساری امیدیں، ارمان اور تمنائیں اسی سے وابستہ ہیں، زندگی کا کوئی مزہ نہیں جو اسے اس کام میں حاصل نہ

ہوتا ہو. لیکن اکاکئی اکاکئے وچ کا جسم ذرا کمزور ہے' جاڑوں میں اسے سردی بہت لگتی ہے' اس لئے اس کا بہت جی چاہتا ہے کہ ایک لبادہ خریدے' اور رفتہ رفتہ خطاط ہونے کے علاوہ ایک نئے لبادے کا مالک بننا بھی اس کی دلی آرزؤں میں شامل ہوجاتا ہے' کئی سال تک تھوڑا تھوڑا روپیہ اکھٹا کرکے وہ آخر کار ایک نیا لبادہ خریدتا ہے' مگر آسمان کا ظلم دیکھئے' اکاکئی اکاکئے وچ کا لبادہ پہلے ہی دن چوری جاتا ہے۔ اس کا دل ایسا سخت صدمہ برداشت نہیں کرسکتا' وہ بے چارہ مرجاتا ہے' اور بھوت بن کر شہر میں مارا مارا پھرنے لگتا ہے —

عموماً دنیا اکاکئے وچ جیسے بچارے غریبوں پر ہنستی ہے' اور اس کی ہنسی حقارت بھری ہوتی ہے' روسی حقیقت نگار اپنی قوم کے نمونوں کی صورت اور سیرت کے تمام پہلو کمال وضاحت اور باریک بینی سے دکھاتے ہیں' مگر اپنے تعصبات اور رجحانات کو اس طرح سے معطل کردیتے ہیں کہ ان کی صورت گری میں حقیقت کا منظر دکھانے کے سوا اور کوئی خواہش یا ارادہ ظاہر نہیں ہوتا' ہم ان کے کیرکٹروں کو ان کی نظر سے نہیں ' اپنی نظروں سے دیکھتے ہیں ' اور ہمارے دلوں پر وہ اثر نہیں ہوتا جو حقیقت نگار پیدا کرنا چاہتے ہیں ' بلکہ وہ جو خود بخود پیدا ہوتا ' اگر ہم ایسی ہستیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے . اکاکئے وچ جیسے لوگوں سے ہمیں پہلے الجھن ہوتی ہے' پھر ان پر غصہ آتا ہے' اور آخر کار اگر ہم کو انسانی ہمدردی چھو بھی گئی ہے ' تو ہم کو ان پر ترس آتا ہے ' اور دل محبت کے درد سے بھر آتا ہے گو گول کی بحیثیت انسان کے یہی کیفیت تھی ' لیکن بحیثیت آرٹسٹ اور مصور کے اس نے بچارے اکاکئے وچ پر رحم

کھا کر یا اس سے خفا ہو کر کسی قسم کا مبالغہ یا غلط بیانی جائز نہیں رکھی - وہ ایک آنکھ سے اکاکیے وچ پر ہنستا ہے ' اس لئے کہ اکاکیے کے مضحک ہونے میں کوئی شک نہیں ' اور ایک آنکھ سے روتا ہے ' اس لئے کہ اکاکیے وچ بھی انسان ہے اور ہمدردی کا مستحق ' جذبات کے گھوڑے کو ایڑ لگا کر پھر اس طرح روکنا خواہ کتنا مشکل اور تکلیف دہ ہو ' حقیقت نگاری کا تقاضا تھا اکاکیئے وچ جیسے لوگ ہر گز نظر انداز نہ کئے جائیں - روس میں اکاکیے وچ جیسے ' بچاروں ' کے وجود کا سب نے گوگول کا افسانہ پڑھتے ہی اعتراف کیا ' بلکہ یہ بھی تسلیم کر لیا کہ روس کے اکثر باشندوں میں اکاکیے وچ کی کوئی نہ کوئی صفت موجود ہے - چنانچہ افسانہ پڑہ کر گوگول کے معاصرین میں سے کسی نے لکھا : ' " ہم سب گوگول کے ' لبادے ' سے نکلے ہیں " جس کے معنی یہ تھے کہ ہر روشن خیال روسی ' بچارے ' اکاکیے وچ سے مشابہت محسوس کرتا تھا ' بے کسی نے اسے بھی اکاکیے وچ کی طرح مضحک اور مسکین اور قابل رحم بنا دیا تھا ' اور تقدیر اس کے اور اس کی تمناؤں کے ساتھہ بھی ویسا ہی سلوک کرتی تھی ' جیسا اس نے اکاکیے وچ کے ساتھہ کیا —

' گل کاریوں اور کہانیوں ' کے بعد گوگول نے دو ڈرامے لکھے ' ' انسپکٹر جنرل ' اور ' شادی ' - ان میں مضحک کیر کٹروں کی کوئی انتہا نہیں ' لیکن ان میں بھی وہی لا شخصی انداز نمایاں ہے جو گوگول نے اکاکیئے وچ کی صورت گری میں اختیار کیا تھا ' اور ان موقعوں پر بھی جب گوگول ہمیں ہنسی سے بیچین کر دیتا ہے ' انسانی ہمدردی آنسوؤں یا آہوں کی شکل میں اپنا خراج وصول کر لیتی ہے - ' انسپکٹر جنرل ' کے کیر کٹر مضحک ہونے کے علاوہ مفسد اور بد دیانت بھی ہیں ' اور گوگول نے ڈراما محض

ان کا مذاق اُڑانے کے لئے نہیں بلکه اس غرض سے بھی لکھا تھا که قوم سرکاری ملازموں کی رشوت خوری اور بے ایمانیوں سے آگاہ ہو' مگر مصور کے کمال نے مصلح کے خیالات پر بالکل پردہ ڈال دیا اور ریاست کی بد نظمی پر خفا ہونے کے بجائے ہم کو ان لوگوں کی بے چارگی اور بے کسی پر ترس آتا ہے جو فطرتاً ایک خاص طرح کا چال چلن اختیار کرنے پر مجبور ہیں' اور اپنی صفائی کی کوشش بھی کرتے ہیں تو اس طرح که بالکل مسخر معلوم ہونے لگتے ہیں۔

انسپکٹر جنرل کا پلاٹ یہ ہے که ایک شہر کے سرکاری عہدہ داروں کو پته لگتا ہے که دارالسلطنت سے ایک خاص افسر ان کا کام جانچنے کے لئے بھیجا جا رہا ہے' کیونکه ان لوگوں کی مرکزی حکومت تک بہت سی شکائتیں پہنچی ہیں۔ شہر کے تمام عہدہ دار یہ خبر سن کر گھبرا جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا ہے' سب بڑے رشوت خور ہیں' اور تمام شہر والے ان کی حرکتوں سے بہت نالاں ہیں' اس لئے سب کو یقین ہے' که اگر واقعی انسپکٹر جنرل بھیجا گیا تو ان کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ ان کا خیال ہے که انسپکٹر جنرل بھیس بدل کر آئے گا' اور بد حواسی میں وہ ایک آوارہ نو جوان کو جو اتفاق سے شہر کے ایک ادنیٰ ہوٹل میں آ کر ٹھیر گیا ہے' انسپکٹر جنرل سمجھ لیتے ہیں۔ یہ نو جوان جسے روپے کی سخت ضرورت تھی' تقدیر کے اس کھیل سے فائدہ اُٹھاتا ہے' اور خوب دعوتیں کھا کر اور روپیه وصول کرکے اپنا رستہ لیتا ہے' آخر میں ان سب کو معلوم ہوتا ہے که وہ نو جوان انسپکٹر جنرل نہیں تھا' کوئی معمولی لفنگا تھا' اور اسی وقت کوئی سپاہی آ کر اطلاع دیتا ہے که انسپکٹر جنرل آیا ہے اور اس نے سب کو طلب کیا ہے۔—

جعلی انسپکٹر جنرل کے آنے کا منظر نہایت دلچسپ ہے صدر کو جیسے

ہی خبر ہوتی ہے کہ دارالسلطنت سے ایک بڑا افسر آنے والا ہے ' وہ تمام بڑے عہدہ داروں کو بلا بھیجتا ہے ' اور انھیں یہ خبر سنا دیتا ہے . سب کے سب بہت پریشان ہوتے ہیں ' مگر چونکہ سب پر یکساں گرفت ہوسکتی ہے ' اس لئے ایک دوسرے کو تنبیہ کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں صدر میونسپلٹی ہچکچا کر منصف سے کہتا ہے :—

" آپ کی کچہری کے برآمدے میں ' جہاں لوگ عموماً عرضیاں لےکر آتے ہیں ' اردلیوں نے بطخوں کے بچے پال رکھے ہیں ' جو اِدھر اُدھر بھاگے پھرتے ہیں ' اور پیروں تلے آ جاتے ہیں - گھر گرستی کرنا ہر شخص کے لئے قابل تعریف بات ہے تو اردلیوں کے لئے کیوں نہ ہو ' مگر بھئی ایسی جگہ پر تو زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا ... ... "

منصف فوراً جواب دیتا ہے :—

" میں ان سب کو آج ہی باورچی خانے پکڑ بھجواتا ہوں ' آپ کا جی چاہے تو آج میرے یہاں کھانا کھائیے "

صدر میونسپلٹی چند اور بے قاعدگیوں کی طرف توجہ دلا کر کہتا ہے :—

" ... ... اسی طرح آپ کا اسیسر ... ... یوں تو وہ آدمی خاصا ہوشیار ہے ' مگر اس کے منہ سے ایسی بو آتی ہے ' معلوم ہوتا ہے ' سیدھا کسی شراب کے کارخانے سے آ رہا ہے - یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ...... اگر یہ بدبو واقعی کوئی پیدائشی مرض ہے ' جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ' تو اسے سمجھائیے ' پیاز یا لہسن یا کوئی اور دوا کھائیے ...... "

لیکن اس معاملے میں منصف کا بس نہیں چل سکتا :—

" نہیں ' اب یہ بدبو نہیں مٹ سکتی . وہ کہتا ہے بچپن میں اس

کی داڑھی کے چوٹ لگ گئی تھی' اور تب سے اس کے منہ سے کچھہ ووقکا
کی بو آنے لگی ہے."

اس ناکامی سے صدر میونسپلٹی کی اصلاحی کوششوں کا خاتمہ نہیں
ہوجاتا۔ وہ تمام افسروں کو فلسفیانہ طرز پر ان کی خاص کم زوری سے
آگاہ کرتا ہے :—

"...... عجیب بات ہے' ایسا کوئی آدمی ہی نہیں' جس کے سر کوئی
گناہ نہ ہو' خدا ہی نے دنیا کو ایسا بنایا ہے ... ..."

منصف سمجھتا ہے کہ اس کی رشوت خوری کی طرف اشارہ ہے اور
بگڑ کر کہتا ہے کہ گناہ گناہ میں فرق ہے' "میں سب سے کھلم کھلا کہتا
ہوں' میں رشوت لیتا ہوں ' مگر کیسی رشوت ؟ شکاری کتے کے بچے. یہ
کچھہ اور ہی چیز ہے."

پھر صدر میونسپلٹی ان حضرات کی طرف متوجہ ہوتا ہے' جن کے
ماتحت اسکول اور اوقات اور خیرات خانے ہیں۔

"... ... آپ کو استادوں کی طرف خاص طور سے توجہ کرنا چاہئے'
وہ بڑے لائق لوگ ہیں اور مختلف کالجوں میں تعلیم حاصل کرچکے ہیں'
مگر عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں' جو ممکن ہے علم و فضل کے لازمی
جزو ہوں مثلاً استادوں میں سے ایک جس کا چہرہ کچھہ پھولا سا ہے ... کبھی
اپنی کرسی پر بیٹھہ ہی نہیں سکتا' بغیر اس طرح (منہ بنا کر) منہ
بنائے ہوئے اور پھر حلق کے پاس ہاتھہ لے جا کر اپنی داڑھی کو انگلیوں
سے باہر کی طرف پھینکتا ہے' اگر وہ صرف طالب علموں کا اس طرح منہ
چڑھائے تو کوئی بات نہیں ... ... لیکن آپ خود غور کیجئے' اگر وہ کسی
شخص کا جو اسکول کا معائنہ کرنے آیا ہو' اس طرح منہ چڑھائے - تو

اس کا نتیجہ بہت برا ہوسکتا ہے : ممکن ہے انسپکٹر جنرل یا کوئی اور اس بات کو اپنی رپورٹ میں درج کردے۔ خدا جانے پھر اس کا کیا انجام ہو ... ... مجھے آپ کو استاد تاریخ کی طرف بھی توجہ دلانا ہے ... ... میں نے ایک مرتبہ ان کا لکچر سنا تھا ... ... جب انھوں نے اسکندر اعظم کا ذکر شروع کیا تو خدا جانے انھیں کیا ہو گیا۔ انھوں نے اپنی جگہ سے جھپٹ کر ایک کرسی اٹھائی اور پوری طاقت سے اسے زمین پر دے مارا - میں نے مانا اسکندر اعظم بڑا بہادر تھا، مگر آخر کرسیاں کیوں توڑی جائیں؟ اس سے تو خزانے کا نقصان ہوتا ہے ... ... "

اس مجمع میں پوسٹ ماسٹر بھی شریک ہوجاتا ہے، صدر میونسپلٹی الگ لے جاکر اس سے کہتا ہے کہ فی الحال تمام خط کھول کر دیکھ لیا کرے تاکہ ان لوگوں کے خلاف کوئی شکایت ڈاک کے ذریعہ سے دارالسلطنت نہ بھیجی جا سکے۔ پوسٹ ماسٹر جواب دیتا ہے کہ اسے یہ باتیں سکھانے کی ضرورت نہیں، اسے خود خط پڑھنے کا بہت شوق ہے، اور اگر کوئی خط اسے خاص طور سے پسند آتا ہے تو وہ اسے اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور بار بار پڑھا کرتا ہے ... ... یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ دو حضرات جن کا کام شہر بھر میں خبریں سننا اور سنانا ہے دوڑے ہوے آتے ہیں، اور خبر دیتے ہیں کہ انھیں فلاں ہوٹل میں ایک آدمی نظر آیا ہے، جو دارالسلطنت سے آیا ہے، اور انسپکٹر جنرل کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔

صدر میونسپلٹی فوراً ہوٹل پہنچتا ہے - نوجوان لفنگے کی پہلے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ معاملہ کیا ہے - لیکن جب اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سارے بزرگ کس غلط فہمی میں ہیں تو انھیں اچھی طرح سے

لوٹتا ہے - آخر کار پوسٹ ماسٹر اس کا ایک خط کھول لیتا ہے، جو اس نے اپنے کسی دوست کو لکھا ہے اور جس میں شہر کے تمام مشاہیر کو خوب گالیاں دی ہیں اور پھبتیاں کسی ہیں - خط سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ان سب نے دھوکا کھایا ہے، مگر اس وقت تک چڑیا اُڑ جاتی ہے —

گوگول کا دوسرا ڈراما "شادی" بھی اسی طرح مضحک سیرتوں کا عجائب خانہ ہے - اس کا ہیرو پوڈکولیسن، ایک کھاتا پیتا آدمی ہے، جو شادی کرنا چاہتا ہے، مگر ایسا جھینپو ہے کہ خود کسی لڑکی سے دوستی کرکے اس سے شادی کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا، ایک مشاطہ اس کا ایک لڑکی سے نکاح کرانے کا وعدہ کرتی ہے، اور پوڈکولیسن کپڑے وغیرہ تیار کرانے لگتا ہے - اس کی کیفیت پہلے منظر میں ظاہر ہو جاتی ہے، جب وہ اپنے نوکر کو بار بار بلاکر اس سے جرح کرتا ہے :—

"درزی کے یہاں گیا تھا ؟"

"گیا تھا -"

"تو کیا ہوا، وہ فراک کوٹ سی رہا ہے ؟"

"سی رہا ہے ."

"بہت سا سی چکا ہے ؟"

"ہاں کافی سی لیا ہے، کاج بنانے شروع کردئے ہیں ."

"کیا ؟"

میں نے کہا: اس نے کاج بنانے شروع کردئے ہیں ."

"اور اس نے کہیں یہ تو نہیں پوچھا کہ صاحب کو بھلا فراک کس لئے چاہئے ؟"

"نہیں، نہیں پوچھا ."

"ممکن ہے اس نے کہا ہو: صاحب شادی تو نہیں کرنا چاہتے ؟"

" نہیں کچھہ نہیں کہا -" ....

" ... ہاں ' مگر کیا اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ صاحب اتنی باریک بانات کا کوٹ کیوں سلوا رہے ہیں ؟ "

" نہیں ."

" اس کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا کہ شاید صاحب شادی کرنا چاھتے ہوں ؟"

" نہیں ' اس کے متعلق کچھہ باتیں نہیں ہوئیں " ....

پود کولیسن کو اس کا خوف ہے کہ ایسا نہ ہو اس کی شادی کی خبر تمام شہر میں مشہور ہو جائے اور لوگ اسے چھیڑیں اور اس کا مذاق اُڑانے لگیں - نوکر ایک بار چلا جاتا ہے تو کچھہ سوچنے کے بعد وہ پھر اس کو آواز دیتا ہے .

" پولش خرید لایا ؟ "

" خرید لایا " ....

تمہے پالش دیتے وقت دکان والے نے یہ تو نہیں پوچھا تھا کہ بھلا صاحب کو اس پالش کی کیوں ضرورت پڑی ؟ "

" نہیں "

" ممکن ہے اس نے کہا ہو : کہیں صاحب شادی کرنے کی فکر میں تو نہیں ہیں ؟ "

" نہیں ' اس نے کچھہ نہیں کہا تھا . "

یہ گھبراہٹ ' خوف اور اندیشوں کا یہ عالم دیکھتے ہوئے بھلا کب ممکن تھا کہ پود کولیسن دولھا بننے کی ہمت کرسکتا ' اتفاق سے اس کے ایک دوست کوچ کرت نے اس کی شادی کرادینے کا بیڑا اٹھا لیا ' پودکولیسن کے علاوہ اور امیدواروں کو جنھیں مشاطہ نے پھانسا تھا کوچ کرت نے بھگاکر

اور ڈرا کر بھگا دیا اور پود کولیسن کے لئیے میدان صاف کردیا' لیکن عین اس وقت جب دلہن گرجا میں جانے کے لئیے تیار ہوگئی' پود کولیسن ہمت ہار گیا' اور چونکہ کوچ کرت نے اس خیال سے کہ کہیں وہ فرار نہ ہوجائے دروازے پر پہرہ کھڑا کردیا تھا' پود کولیسن کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا .

" انسپکٹر جنرل " کا اصلاحی مقصد نہیں پورا ہوا . زار نکولائی نے خود اسے پڑھا بہت پسند کیا' اسے اسٹیج پر دکھلانے کا حکم دیا اور پہلے تماشے میں جا کر ہنسنے اور داد دینے میں پیش قدمی کی . لیکن سرکاری عہدہ داروں نے اس کی مخالفت میں ایک طوفان برپا کردیا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اسٹیج پر دکھانے کی قطعی ممانعت ہو گئی . مگر گوگول کی طبیعت میں اس ڈراما لکھنے کے ساتھہ قومی اصلاح کا ولولہ اٹھا اور اس کا نقطۂ نظر بھی کسی قدر بدل گیا . اس کی باریک بینی ویسی ہی رہی' ظرافت اتنی ہی' مگر واقعات کو وہ مصلح کی نگاہوں سے دیکھنے لگا' اور جو درد روسی زندگی کا نظارہ اس کے دل میں پیدا کرتا تھا وہ اس امنگ میں منتقل ہو گیا کہ روسیوں کو حقیقت حال سے آگاہ کیا جائے' اور روسی زندگی کی عبرت انگیز تصویریں دکھا کر لوگوں کے دل بہتر زندگی کی آرزوؤں سے معمور کردئیے جائیں . " انسپکٹر جنرل " کی تصنیف کے بہت جلد بعد اس نے ایک ناول لکھنا شروع کردیا جس کا عنوان " مردہ روحیں " تھا -

" مردہ روحوں " میں مصوری بہت بڑے پیمانے پر کی گئی ہے' گوگول کا ارادہ تھا کہ روسی زندگی کی ایک جامع تصویر کھینچے' اور اسی غرض سے اس نے ایک ایسا لوچدار پلاٹ منتخب کیا جو اس پر قصے کے تسلسل کی کوئی ذمہ داری یا پابندی نہیں ڈالتا - ناول کا ہیرو چچکوف' ایک نہایت درجہ چالاک' خود غرض اور عیار آدمی ہے جو دو بار سرکاری

ملازمت سے غبن اور رشوت خوری کی بنا پر نکالا جا چکا ہے ۰ وہ روپیہ کمانے کی ایک اور تدبیر سوچ کر مردہ روحیں خریدنے نکلتا ہے - اس زمانے میں تمام روسی کاشتکار زمینداروں کی ملکیت تھے اور دوسری چیزوں کی طرح بیچ اور خریدے جاسکتے تھے - زمینداروں پر لگان ان نفوس "روحوں" کے حساب سے لگایا جاتا تھا جو ان کی ملکیت میں تھیں ' لیکن چونکہ مردم شماری ہر دسویں سال ہوا کرتی تھی ' اس لئے زمینداروں کو ان کاشتکاروں کا لگان بھی دینا ہوتا تھا جو درمیان میں مرجاتے تھے ' چچکوف کی تدبیر یہ تھی کہ ایسی مردہ "روحیں" زمینداروں سے سستے داموں خریدے فرضی قیمتیں لگاکر ان کا ایک باقاعدہ بیع نامہ لکھوائے - جیسا کہ زندہ روحوں کی خرید فروخت کے وقت لکھوایا جاتا تھا ' اور تب انہیں کسی بڑے بنک میں جاکر ایک معقول رقم کے عوض رہن رکھا جاوے ' روحیں خریدنے کے لئے وہ ایک گاڑی پر بیٹھہ کر سفر کو نکلتا ہے ' اور گوگول بھی ہمیں اس کے ساتھہ ساتھہ سیر کراتا ہے ' اور ان زمینداروں میں جن کے پاس چچکوف بیوپار کرنے جاتا ہے ' ہمیں روسی سیرت مختلف شکلوں میں دکھلائی جاتی ہے - منی لوف ایک جوان زمیندار ہے ' جس میں کوئی خصوصیت نہیں ' کسی قسم کا شوق نہیں ' جو کبھی سوچتا ہے کہ اپنے گھر سے تالاب تک ایک زمین دوز راستہ بنائے ' کبھی اسے تالاب پر ایک ایسا پل بنانے کی سوجھتی ہے جس کے دونوں طرف مٹھائی کی دوکانیں ہوں ' مگر وہ کرتا کراتا کچھہ نہیں اس کے گول کمرے میں کئی کوچ ہیں جن پر کپڑا چڑھانا باقی رہ گیا ہے ' وہ اپنے تمام مہمانوں سے کہتا ہے کہ ان پر نہ بیٹھیں ' وہ ابھی تیار نہیں ہیں ' لیکن کئی سال گذر گئے اور وہ کوچ اسی حالت میں پڑے ہیں - اس کی جائداد کا انتظام بہت خراب ہے ' اسے

کھانا تک ٹھیک طرح سے نہیں ملتا مگر وہ خوش ہے اور کسی چیز کی فکر نہیں کرتا - اس کے برعکس سویا کئیے وچ ایک نہایت کنجوس ' اکھڑ آدمی ہے ' جو اپنی جائداد کا انتظام بہت اچھا کرتا ہے اور روپیے کے لالچ میں ہر طرح کی بے ایمانی کرنے پر خوشی سے راضی ہوجاتا ہے ' اگر اسے یہ یقین ہوجائے کہ اس میں فائدہ ہوگا - کھانے میں اور دوسروں کو گالیاں دینے میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا - نوز دُرلویف اسی قسم کا مگر کسی قدر مختلف آدمی ہے ' بے ایمان ' جھوٹا ' فسادی ' آوارہ ' جو ملنے جلنے میں بڑا بے تکلف ہے - مگر جیسا کہ چچکوف کو ذاتی تجربہ سے معلوم ہوجاتا ہے اپنی جان پہچان کے لوگوں کو پٹوانے اور ذلیل کرنے پر بھی بہت جلد آمادہ ہوجاتا ہے - جب شہرن میں چچکوف اپنا کام ختم کرچکتا ہے ' بیع نامے لکھ کر کچہری میں داخل کردئے جاتے ہیں ' اور رخصت ہونے سے پہلے وہ دوستوں کے یہاں دعوتیں کھانے میں مصروف ہوتا ہے تو یہی نو ز دریوف سب سے کہہ دیتا ہے کہ چچکوف نے مردہ روحیں خریدی ہیں ' اور ناول کے هیرو کا سارا کام بگڑ جاتا ہے ' وہ اس ناکامیابی سے مایوس نہیں ہوجاتا بلکہ ملک کے دوسرے حصے میں جاکر اسی طرح مردہ روحوں کا بیوپار شروع کردیتا ہے ' اسی سلسلے میں وہ جعلی وصیت نامہ بناکر ایک رئیس عورت کی جائداد کا بڑا حصہ ورثے میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ' مگر اس کا جعل پکڑا جاتا ہے ' اور وہ بمشکل قید خانے سے اپنی جان بچاتا ہے —

جو ہنسنا چاہے اسے '' مردہ روحوں '' میں اس کے بہت سے موقع ملیں گے ' گو گول کی نظر انسانی زندگی کا پہلو دیکھنے میں کبھی نہیں چوکتی - شہرن کے سرکاری وکیل کی بائیں آنکھ اس طرح جھپکتی تھی گویا وہ کہنا چاہتا ہے " بیٹا ذرا دوسرے کمرے میں جو چلو تو تم کو بتیے

کی بات سناؤں '' لیکن وہ نہایت سنجیدہ اور خاموش پسند آدمی تھا ' چچکوف سے اس کی خاصی دوستی ہوگئی ' اور جب اس نے آخر میں افواہ سنی کہ چچکوف کوئی سزا یافتہ مجرم ہے ' اور جعلی نوٹ بناتا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا - اتفاق سے اسی زمانے میں فالج گرنے سے یا قلب کی حرکت بند ہونے سے وہ اچانک مرگیا - 'لوگوں نے ڈاکٹر کو فصد کھولنے کے لئے بلوایا ' لیکن وہ دیکھہ رہے تھے کہ سرکاری وکیل کے جسم سے روح نکل چکی ہے تب انہیں ..... احساس ہوا وہ واقعی روح رکھتا تھا ' اگرچہ اس کی انکسار نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا '' ... .. ایک زمیندار سے جو لمبان چوڑان میں یکساں ہے اور کھاتے کھاتے پھول گیا ہے ' ایک ہمسایہ شکایت کرتا ہے کہ اسے زندگی میں کوئی لطف نہیں آتا ہے ' اور اس کا جی گھبرایا کرتا ہے - '' تمہارا جی کیوں گھبراتا ہے '' ؟ وہ بزرگ حیرت سے پوچھتے ہیں - '' تم کھاتے کافی نہیں ہو ' اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں - لیکن ایسے '' چٹکلے '' مردہ روحوں '' کی مایوس کن اور ہمت شکن فضا پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے ' گو گول ہنستا اور ہنسا تا ہے ' مگر یہ بھی ایک مجبوری سی ہے ' '' مردہ روحوں '' میں ایک جنرل ہیں جنہیں چچکوف کا ایک لطیفہ بہت پسند آتا ہے اور جب ان کی لڑکی اعتراض کرتی ہے کہ انہیں ہنسنے کے بجائے افسوس کرنا چاہئیے تو وہ کہتے ہیں :- بیٹی میں کروں کیا ...... یہ بات ہی کچھہ ایسی مضحک ہے : '' گو گول کا بھی یہی انداز ہے ' لیکن ظرافت سے وہ کبھی اپنے یا اپنے پڑھنے والوں کے دل پر غم کا بوجھہ ہلکا نہیں کرتا - '' مردہ روحوں '' میں ایک بزرگ فرماتے ہیں : '' مجھے اکثر خیال ہوتا ہے کہ روسی کو بالکل گیا گذرا سمجھنا چاہئیے ' اس کے ارادے میں قوت نہیں ' اس میں اتنی ہمت نہیں کہ استقلال سے کام کرے - وہ کچھہ کرنا چاہتا ہے '

مگر کچھہ کر نہیں پاتا - وہ ہر دن سوچھتا ہے کہ کل سے ایک نئی زندگی شروع کروں گا' جس قدر محنت کرنی چاہئیے وہ کرونگا ' کھانے میں پرھیز کروں گا ' مگر ھوتا ھواتا کچھہ نہیں - اسی رات کو وہ ضرورت سے زیادہ کھاجاتا ہے بے وقوفوں کی طرح آنکھیں مچمچاتا ہے اور منہ سے ایک حرف بھی نہیں نکال سکتا - ھاں' واقعی : ھمیشہ یوں ھی ھوا کرتا ہے" گوگول نے جب " مردہ روحوں " کے پہلے دو چار باب لکھے تو شاعر پشکن زندہ تھا ' اور گوگول نے اسے یہ پڑہ کر سنائے - پشکن گھبرا کر چلا اٹھا ' یا خدا ھمارا روس بھی کیا عجیب ویرانہ ہے '' ۱۸۴۲ ع میں " مردہ روحوں '' کی پہلی جلد شائع ھوئی اور اس کے پڑھنے سے اور سب پر بھی ایسا ھی اثر ھوا - لیکن گوگول کی حقیقت بینی تسلیم کرتے ھوئے نقادوں نے یہ رائے ظاھر کی کہ جس معاشرے میں صرف ایسے ھی لوگ ھوں جیسے گوگول نے اپنی ناول میں دکھائے ھیں اس کا صفحہ ھستی پر قائم رھنا ناممکن ہے - گوگول نے بھی یہ محسوس کیا ' اور اپنے نقادوں کو یقین دلایا کہ ناول ابھی ختم نہیں ھوا ہے ' اس کا پہلا حصہ روسی زندگی کا صرف ایک رخ دکھاتا ہے اور آگے چل کر وہ ناول کے پیرائے میں نجات کی بھی کوئی صورت دکھائے گا ' لیکن نجات کی اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی - " مردہ روحوں " کا دوسرا حصہ تین بار لکھہ کر جلادیا ' اور جس شکل میں اس کی آخر کار چھپنے کی نوبت آئی وہ نہایت نا مکمل تھا ' اور اس میں نجات کا راستہ سمجھانے کا وعدہ بھی ذرا بے تکے طریقے سے پورا کیا گیا تھا - مگر " مردہ روحوں " کے دوسرے حصے کو دیکھہ کر گوگول پر حرف گیری کرنا انصاف کے خلاف ہے . یہ حصہ گوگول کے مرنے کے بعد شائع ھوا ' اور مرنے سے کئی سال قبل ۱۸۴۷ ع میں گوگول نے '' احباب کے نام خطوط '' کے عنوان سے

ایک کتاب لکھی تھی، جس میں اس نے اعلان کیا تھا کہ اس نے ناول نویسی ترک کردی ھے .

قومی نجات کا مسئلہ ھر اصل نہایت اہم تھا ، اور اگر گوگول نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے طے کرنا ناول نویس کے امکان سے باھر ھے تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی . " احباب کے نام خطوط " ایک قسم کے مذھبی وعظوں کا مجموعہ ھے اور اس سے معلوم ھوتا ھے کہ گوگول نے اپنی عاجزی اور بے کسی محسوس کرکے مذھب کے آغوش میں پناہ لی تھی . اس کے معاصرین کو اس تصنیف سے کسی قسم کا اطمینان نہیں ھوا ، کیونکہ وہ مذھبی جذبے اور مذھب کی پیروی میں فرق کرتے تھے . گوگول کے وعظوں سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ زار اور روسی کلیسا کے سامنے سر تسلیم خم کرانے کی تعلیم دینا چاھتا ھے ، اور یہ بھول گئے کہ وہ کیسے زار اور کیسے کلیسا کے خواب دیکھ رہا تھا ، جہاں تک روسی فطرت کی تعبیر کا تعلق ھے ، گوگول کے وعظ بھی اسی قدر پر حقیقت تھے ، جتنے اس کے ناول اور دستئفکی اور تالستائی کی تصانیف نے اسے ایک حد تک ثابت بھی کردیا . بھر حال یہ صحیح ھو یا نہ ھو کہ روسی فطرت کو صرف مذھبیت کا جذبہ نجات دلا سکتا ھے ، گوگول کا انجام صاف طور سے ظاھر کردیتا ھے کہ روسی ناول نویسوں کے لئے ناول محض قصے کہانی نہیں تھے - ان کی نظروں میں ناول وھی حیثیت رکھتا تھا جو قدیم یونانی معیار کے مطابق فلسفے کی تھی ، اس کا مقصد صرف جی بہلانا یا عبرت دلانا نہیں تھا - اس کا موضوع انسانی زندگی کی ھر شکل اور کیفیت تھی ، وہ ایک آئینہ تھا جس میں صرف موجودہ حالات کا عکس

نہیں تھا ' بلکہ اس زندگی کا ایک دھندلا سا پرتو جسے انسان اپنے تمام قویٰ کی نشو و نما کے بعد اپنی جولانگاہ بنا سکتا ہے - گوگول پہلا ناول نویس تھا جس نے ناول کے کل امکانات سمجھے اور ناول نویسی کے پورے فرائض محسوس کئے ' اور باوجود اپنے فلسفیانہ مقاصد کی ناکامی کے وہ دنیا کے ناول نویسوں میں بہت بڑا درجہ رکھتا ہے ۔

خطبات گارساں دتاسی

تیرھواں خطبہ

۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۳ ع

از

(ترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی۔ لٹ

(پیرس) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن)

حضرات !

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس سال کے خطبے میں بھی میں آپ کے روبرو یہ اعلان بلا تکلف کر سکتا ہوں کہ ہندوستانی ادب دن بدن ترقی پر ہے۔ میں اپنے اس دعوے کی تائید میں اس سرکاری رپورٹ کو پیش کرتا ہوں جو اس سال ماہ مئی میں شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ میں ان زبانوں کے متعلق معلومات ملتی ہیں جن کا سیکھنا سول سروس کے نوجوان ملازموں کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ خاص کرکے ان کے واسطے جو صوبۂ شمال مغربی ' اودھ یا پنجاب میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں۔ سول سروس کے امتحان کی ایک کونسل ہے۔ اس کونسل کے صدر وزیر مالیات سر چارلس تریولین ہیں۔ اور دوسرے ارکان میں آر۔ ایم بنرجی اور مولوی عبداللطیف کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کونسل نے وزیر ہند سرچارلس وڈ

کے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ سول سروس کے امید واروں کا ہندوستان کی صرف دو زبانوں یعنی اردو اور ہندی میں امتحان لینا چاہئیے - ان دو زبانوں کے جاننے سے سول سروس کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں - اب تک یہ قاعدہ تھا کہ صوبہ شمال مغربی، اودھ اور پنجاب میں جانے والے امید واروں کی ہندی اور فارسی میں جانچ ہوتی تھی اور بنگال جانے والے امید واروں کا اردو اور بنگالی میں امتحان لیا جاتا تھا —

سر چارلس ٹریویلین نے انڈیا آفس میں سرکاری ملازموں کے متعلق جو یہ تجویز کی ہے اس سے علوم مشرقیہ کو بہت نفع پہنچے گا - موصوف ان سب لوگوں میں ہر دلعزیز ہیں جو ہندوستان سے محبت رکھتے ہیں - موصوف کی تجویز کے موافق سول سروس کے ابتدائی امتحان میں ۱۸ سے لے کر ۲۱ سال کی عمر والے شریک ہو سکتے ہیں - کامیابی کے بعد انھیں آکسفورڈ یا کیمبرج بھیجا جاتا ہے تا کہ وہ دو سال اس علاقے کی زبان کی تحصیل کریں جہاں ان کا تقرر کیا جائیگا - اس علاقے کی زبان کے ساتھ جہاں ان کا تقرر ہو گا ہندوستانی لازمی طور پر سب کو سیکھنی ہوتی ہے - چنانچہ اکسفورڈ اور کیمبرج دونوں یونیورسٹیوں میں ہندوستانی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے - آکسفورڈ میں کیپٹن جے چیمبرس اور کیمبرج میں میجر جے - جی ستیفن ہندوستانی پڑھاتے ہیں —

فوجی خدمت کرنے والوں کے لئیے ایشیائی زبانوں کے سیکھنے کے متعلق قواعد زیادہ سخت نہیں ہیں - یہ بھی ممکن ہے کہ فوجی خدمت سے کوئی اپنے تئیں سول میں یا سیاسیات میں منتقل کرالے - لیکن صیغۂ سیاسیات کی خدمت اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ ہندوستانی کے سخت امتحان میں کامیابی نہ حاصل کر لی جائے - باوجود اس کے کہ فوج میں

بھرتی ہونے سے قبل ہندوستانی زبان کا امتحان ہر امیدوار کو دینا ہوتا ہے لیکن اگر وہ فوج سے سیاسیات میں منتقل ہو تو اس وقت پھر اس کا امتحان ہوتا ہے - زبان کے علاوہ امیدوار سے ہندوستان کے قوانین ' تاریخ اور بالخصوص ان عہد ناموں کے متعلق سوالات پوچھے جاتے ہیں جو دیسی رئیسوں کے ساتھہ برطانیہ نے کئے ہیں - وہ افسر جو اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں - انھیں سرکاری طور پر ایک سو اسی روپے دئے جاتے ہیں تا کہ وہ کسی منشی سے خاص طور پر بعد میں سبق لے سکیں * —

سر چارلس ٹریویلین نے ہندوستانی زبان کے لئے انعام مقرر کیا ہے - اس سے بھی ہندوستانی کی اہمیت میں اضافہ ہو گا - یہ انعام پانچ سو روپے کا ہے - یہ انعام اس امیدوار کو ملے گا جو اردو زبان میں حسب ذیل موضوع پر بہترین مضمون لکھے —

" یونانی علوم کا بغداد کے عباسی اور قرطبہ کے اموی خلفاء کے زمانہ میں اثر - اس کے ساتھہ وہ اثر بھی بتلایا جائے جو عربوں نے قرون مظلمہ کے بعد یورپ کے نشاۃ ثانیہ پر ڈالا ہے - ان باہمی اثرات سے بطور نتیجہ یہ ثابت کیا جائے کہ اب اس وقت پختہ کار اہل یورپ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے میل جول سے کیا حالات مترتب ہوں گے —

مضمون یکم اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ ع کمیشن کے پتہ پر کلکتہ بھیج دینا چاہئے جو خاص طور پر اس مضمون کی جانچ کے لئے نامزد کیا گیا ہے - اس کمیشن میں " ایڈورڈ بی کاول " کے علاوہ دو ہندو عالم بھی شامل ہیں -

اس ضمن میں میں " سر چارلس وڈ " کے قول کا نقل کرنا مناسب خیال

---

* Allen's Indian Mail, Nov. 1863

کرتا ہوں - سرچارلس ٹریولین بھی ان کے ہم خیال ہیں اور میں بھی متعدد مرتبہ انھیں خیالات کا خود اعادہ کر چکا ہوں - لیکن 'سرچارلس وڈ' نے انھیں خیالات کو نہایت خوبی اور واقفکاری کے ساتھہ پیش کیا ہے - وہ کہتے ہیں —

"پٹنہ سے لے کر پیشاور تک سارے شمالی ہند کی زبان ہندوستانی ہے - شہروں میں ' قصبات میں ' گاؤں میں ' سول اور فوجی مرکزوں میں ' درباروں میں اور سرکاری دفتروں میں ہر کہیں یہ سمجھی جاتی ہے - ہر تعلیم یافتہ شخص اور ادنی سے لے کر اعلی تک سب ہی اسے استعمال کرتے ہیں - جس طرح اطالوی زبان کی اہمیت 'اٹلی' میں ہے یا انگریزی کی انگلستان میں ہے بس وہی حیثیت ہندوستانی کی شمالی ہند کے وسیع علاقوں میں ہے" —

پھر وہ کہتے ہیں —

"ہندی سے در اصل مراد وہ دہقانی بولیاں ہیں جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہیں - سول سروس کے نوجوانوں کو جو ہندی سکھائی جاتی ہے وہ برج کی بھاشا ہے - یہ وہ بولی ہے جو 'متھرا' اور 'برندابن' کے آس پاس بولی جاتی ہے - ہندی کا پنجابی سے بس اسی قسم کا تعلق ہے جو Somersetshire کی بولی Northumberland کی بولی سے ہے - ان ہندی بولیوں کا اردو (ہندوستانی) سے وہی تعلق ہے جو اصلی انگریزی زبان کا مذکورہ صدر بولیوں سے ہے - ہر کہیں آپ دیکھیں گے کہ گاؤں والے بلا تکلف ہندوستانی میں بات چیت کرتے ہیں - اگر کسی کو ہندوستانی زبان پر پوری قدرت حاصل ہو تو وہ بہت جلد آسانی کے ساتھہ

ہندوستان کی ہر مقامی بولی کو سیکھہ سکتا ہے *—

مسٹر " منٹگمری مارٹن " نے اپنی کتاب " مشرقی ہند " میں اور بھی واضح طور پر یہ بات ثابت کی ہے کہ صوبہ شمال مغربی کی زبان سوائے ہندوستانی کے اور کوئی نہیں ہوسکتی دھلی ' آگرہ ' الہ آباد ' لاہور اور اودھ کے ملحقہ علاقوں میں یہی زبان استعمال کی جاتی ہے - ہندی بہار اور صوبہ متوسط کی زبان ہے ' لیکن ہندوستانی اردو یا دکھنی ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں سمجھی جاتی ہے —

اس سے آپ حضرات پر یہ روشن ہوگیا ہوگا ' جس کی نسبت میں بار بار آپ کی توجہ مبذول کرا چکا ہوں ' کہ ہندوستانی زبان ہندوستان میں عام طور پر مروج ہے - گزشتہ سال آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں " کلکتہ " کے اس جلسہ کی مثال پیش کی تھی جس میں " سر جان پی. گرانت " کو الوداع کہتے وقت اظہار خلوص و ہمدردی کے لئے متعدد ہندو مقررین نے ہندوستانی زبان میں تقریریں کیں نہ کہ بنگالی میں جو صوبہ بنگال کی زبان ہے - اسی طرح کلکتہ کے ایک اور جلسہ میں جو اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ انگلستان کے کپڑے کے کارخانوں کے مزدوروں سے اظہار ہمدردی کی جائے - مختلف

---

* سر چارلس فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں فارسی نہ تو دفتری زبان ہی باقی رہی اور نہ لوگ اس میں گفتگو کرتے ہیں اور اب دن بدن اس زبان کے تحصیل کرنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے - موصوف نے یہ بات اس واسطے بیان کی ہے تا کہ وہ اپنے ان ساتھیوں کو قائل کریں جو فارسی زبان کو صوبہ شمالی مغربی کے مدارس میں لازمی قرار دینے کے حق میں ہیں —

مقررین نے ہندوستانی میں تقریریں کیں - فرینڈ آف انڈیا (Friend of India) میں اس کا ذکر ہے کہ راجہ نراین سنگھہ نے اس جلسہ میں تجاویز کی تائید اردو زبان میں کی - موصوف نے اپنی تقریر میں انگلستان کی اس فیاضی کا ذکر کیا جو ہندوستان میں قحط کے موقعہ پر ظاہر ہوچکی ہے - موصوف نے فرمایا کہ اب ہماری باری ہے کہ ہم اپنے محسنوں کی اعانت کے لئے اُنہیں جانوں نے اپنی فیاضی سے مصائب و خطرات سے نجات دلائی - اگر اس وقت ہم کچھہ کریں تو یہ کوئی بڑا احسان نہ ہوگا بلکہ ہمارا ایسا کرنا اس قرض کی ادائی ہوگی جو ہم پر واجب ہے - ہمارے اور انگلستان کے تعلق میں اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جو ہم پر اس قوم نے کیا ہے - اس کے علاوہ یہ ایک مسلم بات ہے کہ ضرورت مند کی ضرورت رفع کرنا اور اس کی اعانت کرنا ہر صاحب مقدور کا فرض ہے —

اس جلسہ میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب نے شرکت کی اور ہر شخص جذبۂ خدمت سے متاثر تھا - بقول شاعر پوپ —

" مذہب و نجات کے معاملے میں ہر کوئی اختلاف رکھتا ہے لیکن صرف ہمدردی ہی ایسی چیز ہے جو ساری دنیا کو متحد کر دیتی ہے "—

شہزادہ " ویلز " کی شادی کے موقعہ پر ہندوستان میں ہر جگہ جلسے منعقد ہوئے اور ان میں ہندوستانی زبان میں تقریریں کی گئیں - ۱۸ مئی کو کلکتہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں منشی " امیر علی " نے اردو میں نہایت فصیح و بلیغ تقریر کی - مقامی اخباروں میں اس تقریر کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے - اس جلسہ میں شہزادہ اور ان کی بیوی کے لئے ایک تحفہ پیش کرنے کی تجویز منظور ہوئی —

اس بات کا ایک مزید ثبوت کہ ہندوستانی ہندوستان کی مروجہ زبان ہے - ہمیں اس سے ملتا ہے کہ گورنمنٹ انگریزی نے ہندوستان میں یہ قاعدہ بنا دیا ہے کہ اگر کسی رجمنٹ میں ترجمان (Interpret) کی ضرورت ہو تو اس افسر کو یہ خدمت دی جاسکتی جس نے صرف ہندوستانی زبان میں امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے - لیکن یہ ایسی صورت میں ہوگا جب کہ اور کوئی بہتر شخص نہ ملے جو ہندوستان کی سب زبانیں جانتا ہو - تا ہم اس سے آپ کو ہندوستانی زبان کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے —

ہندوستان کے سکوں پر ان کی قیمت لکھنے کا جب مسئلہ در پیش تھا تو یہ فیصلہ ہوا کہ ہندی اور اردو حروف میں اسے لکھنا چاہئے - یہ سکے ہندوستان کے سب صوبوں میں استعمال کئے جاتے ہیں —

ہندوستانی صرف ہندوستان ہی میں نہیں بولی جاتی ہے - مشرق قریب کے بندرگاہوں اور افریقہ کے ساحل پر لوگ اس زبان کو استعمال کرتے ہیں - مسٹر شیفر نے ' جو شاہ‌المانیہ کے خاص انٹرپرٹ (ترجمان) (Interpret) تھے اس زبان کو عدن میں سنا اور مسٹر ژول اپیر نے جو ہمارے انسٹیٹیوٹ کے معزز رکن ہیں اس زبان کو " بصرہ " میں بولتے سنا - میں نے ابھی حال میں تجارتی سامان کی رسید دیکھی جو بندرگاہ " لامو " پر زنجبار کے قریب جہاز پر لادا گیا تھا اور " عدن " بھیجا گیا - یہ رسید ناگری رسم خط میں تھی جو عام طور پر بنئے لوگ اپنی خط و کتابت میں استعمال کرتے ہیں - میں نے حال ہی میں " رنگون ٹائمز " میں ایک انگریزی مشن کا ذکر پڑھا جو " آوا " " کرنیل فیر " کے زیر سر کردگی گیا تھا - یہ مشن تجارتی معاہدے کی غرض سے بھیجا گیا تھا - چنانچہ راجہ کے لڑکے نے

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار ہندوستانی زبان میں کیا اس واسطے کہ اسے انگریزی نہیں آتی تھی * —

سول سروس کے امتحان کے لئے حسب ذیل ہندوستانی کی کتابیں نصاب میں رکھی گئی ہیں : انتخابات باغ و بہار ؛ اخوان‌الصفا ؛ سیرالمتاخرین آخرالذکر کتاب میں عہد مغل کے زوال اور انگریزی حکومت کی ابتدا کا حال ہے ۔ اس کتاب کا مصنف ایک مشہور مسلمان ہے جو ذاتی طور پر کلایو، وارن ہیسٹنگز اور دوسرے انگریزی اعیان حکومت سے واقف تھا ۔ اس کتاب کی زبان نہایت سلیس ہے —

ہندی کے نصاب میں حسب ذیل کتابیں رکھی گئی ہیں : انتخاب پریم ساگر، سنگھاسن بتیسی، اور شاید راجنتی اور کالی داس کی راماین رکھی گئی ہے ۔ میں نے یہ معلومات مولوی عبداللطیف سے حاصل کی ہیں —

ان کتابوں کے علاوہ خطوط، سرکاری دستاویزیں، عرضداشتیں، احکام اور تعزیرات ہند کے اقتباسات بھی سول سروس کے امیدواروں کو پڑھنے ہوتے ہیں —

سنہ ۶۲ ۱۸ ع میں ہندوستان میں دیسی مطابع نے مختلف قسم کی چھ سو کتابیں طبع کیں اور بارہ نئے رسائل و اخبارات جاری ہوئے † ہندوستانی مطابع کی اہمیت دن بدن بڑھتی جارہی ہے ۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حکومت بنگال نے کلکتہ میں ایک سرکاری رپورٹ کنندہ مقرر کیا ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ ارباب حکومت کو عوام‌الناس کے خیالات سے ہفتہ وار اطلاع دے تاکہ حکام کو اپنی رعایا کی خواہشات اور ان کی

---

* انڈین میل جون سنہ ۶۳ ۱۸ ع

† سرکاری رپورٹ کے مطابق سنہ ۵۸ ۱۸ ع میں صرف صوبۂ شمال مغربی میں اردو ہندی کے ملاکر ۲۲ اخبارات تھے ۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو ہفتہ وار شائع ہوتے تھے ۔

ضرورتوں کا علم ہوتا رہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ رپورٹ کلکٹر کی حیثیت 'سنسر' کی ہے۔ اس کے ساتھ ایک پنڈت اور ایک مولوی کام کرتا ہے —

کلکتہ سے لے کر پیشاور تک آپ شمالی ہند کے کسی بڑے شہر میں جائیے ہر جگہ لیتھو گرافی پریس دکھائی دیں گے۔ مجھے اس کی اطلاع ملی ہے کہ سنہ ۱۸۵۹ ء میں صرف شہر کلکتہ میں بیس مطبع تھے * —

گذشتہ سال میں نے پنجاب کے دو اخبارات کا ذکر کیا تھا۔ اس وقت میرے پاس ان کے نمونے پہنچ گئے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا یہ دو اخبار "سرکاری اخبار" اور "مصب رعایا" ہیں۔ اول الذکر کا جس جگہ نام لکھا جاتا ہے اس کے اوپر برطانیہ عظمیٰ کے آلات حرب کا طغرہ بطور سپاہ موجود ہے۔ یہ اخبار لاہور میں سرکاری لیتھو پریس میں چھپتا ہے۔ یہ رسالے کے طور پر چھوٹی تقطیع میں طبع ہوتا ہے۔ ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں۔ پنڈت اجودھیا پرشاد اس کے اڈیٹر ہیں جو متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ یہ مہینہ کی پہلی کو نکلتا ہے۔ اس بات کو بھی خاص طور پر لکھا جاتا ہے کہ اس رسالے کے کاتب کا نام محمد علی خطاط ہے۔ پہلی اکتوبر کے نمبر میں اور دوسری چیزوں کے علاوہ 'راولپنڈی' کے نارمل اسکول کے نتائج امتحان سہ ماہی ۱۸۶۲ ع درج ہیں۔ پہلی نومبر کی اشاعت میں ملتان کے اسکول کے افتتاح کا حال لکھا ہے۔ یہ رسم ۲۳ اکتوبر کو منائی گئی تھی۔ اس کے تتمے کے طور پر ایک اور اخبار شائع ہوتا ہے جس کا نام ہی "تتمہ سرکاری اخبار" ہے۔ اسے صوبۂ

* اس کی فہرست " Selections from the Records of Bengal Govt. " میں ملی گئی۔ نمبر ۲۳ —

پنجاب کا پولیس گزٹ سمجھنا چاہئے —

' محب رعایا ' مہینے میں دوبار نکلتا ہے - مجھے اس اخبار کا ایک نمبر ملا ہے جو ۲۸ فروری سنہ حال کا ہے - یہ بھی چھوٹی تقطیع میں دو کالم پر چھپتا ہے - یہ لیتھو میں نہیں نکلتا بلکہ ٹائپ میں - جہاں تک کہ اخبارات کا تعلق ہے ایسی مثال ہندوستان میں اور نہیں ملے گی - ٹائپ میں نسخ رسم خط استعمال ہوتا ہے - ہندوستان میں نسخ کا مطلق رواج نہیں نستعلیق عام طور پر مروج ہے - اس اخبار کے سر ورق پر ایک شعر ہوتا ہے * اس اخبار کے مدیر کا نام جواہر لال ہے - انکا نام شاید آپ پہلے بھی سن چکے ہیں - یہ اخبار مطبع صدرالعام میں بمقام آگرہ طبع ہوتا ہے —

ہندوستانی کے جو جدید اخبار نکلنا شروع ہوئے ہیں ان میں سے میں آپ کی توجہ " خیر خواہ خلق " کی جانب مبذول کراتا ہوں - یہ اس اخبار سے علحدہ ہے جس کا میں ذکر کر چکا ہوں یعنی " خیر خواہ خلائق " اور جو اجمیر سے نکلتا ہے - " خیر خواہ خلق " مہینہ میں دو مرتبہ آگرہ میں سکندرہ کے چھاپے خانہ سے شائع ہوتا ہے یہ چھوٹی تقطیع میں صرف ایک ورق پر دو کالم میں چھپتا ہے - یہ در اصل بلکل مذہبی قسم کا اخبار ہے - اس کا مقصد دین مسیح کی نشر و اشاعت ہے - اس کے سر ورق پر یہ الفاظ لکھے رہتے ہیں —

" خدا کا خوف دانائی کی ابتدا ہے اور مذہبی آدمی کے نزدیک علم اور احتیاط ہم معنی ہیں - " سیاسی خبروں کے علاوہ اس میں مذہبی ' تاریخی ' علمی اور ادبی مضامین ہوتے ہیں اور کبھی کبھی لیتھو میں

---

* یہاں فرانسیسی میں شعر کا مطلب دیا ہے کہ محنت سے آدمی ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ سکتا ہے —

تصاویر بھی ہوتی ہیں - ۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۲ ع کے تتمے میں بڑے دن کے درخت کی ایک تصویر دی ہے اور اس کا مطلب سمجھایا ہے —

ایک اخبار لوک متر ہے - یہ ہندی کا رسالہ ہے اور دیوناگری رسم خط میں شائع ہوتا ہے - اور آگرہ میں سکندرہ کے مطبع میں چھپتا ہے جہاں "خیرخواہ خلق" چھپتا ہے - یہ پہلی جنوری سنہ ۱۸۶۳ م سے نکلنا شروع ہوا ہے - چھوٹی تقطیع میں دو کالم پر چھپتا ہے - یہ رسالہ ماہانہ ہے - اس رسالہ کا مقصد وہی ہے جو "خیر خواہ خلق" کا - ایک ہندوں میں اور دوسرا مسلمانوں میں مسیحیت کی اشاعت و تبلیغ کی غرض سے شائع کیا گیا ہے - اس کے مدیر کا نام پردۂ خفا میں ہے - لیکن اس کے مضامین کے معیار اور سنسکرت دوہوں اور ہندی چوپائیوں کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً وہ کوئی ہندو و عالم ہوں گے جنھوں نے مسیحی دین قبول کرلیا ہے —

مجھے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں پہنچی کہ آیا اس سال کلکتہ سے کوئی نیا اخبار یا رسالہ شائع ہوا یا نہیں ؟ - گزشتہ سال تو چار اردو کے اخبار وہاں سے نکلتے تھے —

اب ہم اخبار و رسائل کے علاوہ اور دوسرے ادبی مشاغل کی نسبت کچھ کہنا چاہتے ہیں - ایک مشہور کتاب جو حال میں شائع ہوئی ہے انجیل مقدس کی شرح ہے * - یہ "سید احمد" صدرامین غازی پور کی تصنیف ہے - موصوف اس وقت اردو زبان کے اعلیٰ ترین انشاپردازوں میں ہیں اور میں نے انھیں کی کتاب "آثارالصنادید" کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے - موصوف آج کل مذہبی مباحث میں مصروف ہیں - غالباً چند

---

* Mohomedan Commentary of the holy Bible غازی پور سنہ ۱۸۶۲ ع —

سال قبل وہ ایسا نہ کرسکتے اس واسطے کہ بادشاہ دہلی نے اپنی رعایا کو ممانعت کردی تھی کہ وہ عیسائی مشنری لوگوں سے کسی قسم کا بحث مباحثہ نہ کریں † - گزشتہ سال میں نے تذکرۃ کہا تھا کہ عنقریب یہ کتاب نکلنے والی ہے - اس کا پہلا حصہ شائع ہوچکا ہے - مصنف نے ازراہ عنایت یہ حصہ مجھے ارسال فرمایا ہے - میں ان کا ممنون ہوں - اس کتاب کا اصلی نام تبئین الکلام فی تفسیرالتوریت والانجیل علی ملۃ الاسلام " ہے —

میں سمجھتا ہوں آپ کے لئے اس کتاب کے سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ میں اس کے چند اقتباسات اس وقت آپ صحباوں کے سامنے پیش کروں ‡ —

اس کتاب کا یہ پہلا حصہ شہر غازی پور میں مصنف کے خاص ذاتی مطبع میں چھپا ہے - اور موصوف نے خود اس کے سارے اخراجات برداشت کئے ہیں - یہ کتاب بڑی تقطیع پر ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے - اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی ترجمہ بھی ہے - یہ حصہ در اصل تمہید کے طور پر ہے - اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس پوری کتاب کی وسعت کیا ہوگی - سید احمد کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی معلومات گہری ہیں اور انہیں صرف قران اور توریت و انجیل ہی پر کافی عبور نہیں ہے بلکہ دوسری مشرقی تصانیف سے بھی وہ پورے طور پر واقف معلوم ہوتے ہیں - اس سے بھی بڑھ کر تعجب اس امر پر ہے کہ موصوف نے یوروپین تصانیف سے بھی استفادہ کیا ہے - چنانچہ وہ ان کے جگہ جگہ پر حوالے دیتے ہیں - یہ کتاب وسیع مطالعہ اور

---

† Friend of India

‡ اس جگہ اقتباسات کا فرانسیسی ترجمہ ہے —

تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے - مجھے زیادہ تر خوشی اس بات پر ہے کہ یہ کتاب اس زبان میں ہے جس کی تعلیم یہاں میرے ذمہ ہے - میرا تو خیال یہ ہے کہ اس قسم کے مطالب شاید پہلی مرتبہ کسی مسلمان نے اردو میں فکر و تحقیق کے ساتھ پیش کئے ہیں - غالباً یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ شاید ہی مشرق کی کسی زبان میں اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے اس نوعیت کے مطالب کو ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہو —

اس پہلی جلد میں دس ابواب ہیں - پہلے باب میں انبیاء کے مشن اور انسانیت کے لئے ان کی ضرورت کو ثابت کیا ہے - دوسرے باب میں وحی اور کلام الہی کی اصلیت بتائی ہے سید احمد اپنی بحث میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انجیل مقدس میں تعلیم وحی حضرت مسیح کی زبان سے ادا کی گئی ہے —

تیسرے باب میں توریت، صحف الانبیاء، زبور اور انجیل کے متعلق اظہار خیال ہے - چوتھے باب میں ان آسمانی کتابوں کی نسبت جو مسلمانوں کے عقاید ہیں انہیں بیان کیا ہے - پانچویں باب میں ان آسمانی کتابوں سے بحث کی ہے جو بائیبل میں شامل ہیں - اس باب میں ان سب مقدس کتابوں کی صحیح فہرست درج ہے جن میں سے بعض کو مسیحی کلیساء تسلیم کرتا ہے اور بعض کو ماننے سے انکار کرتا ہے - اس فہرست میں بعض کتابیں ایسی ہیں جنھیں مسیحی کلیساء "گم شدہ" یا جعلی بتاتا ہے - مصنف نے ان کتابوں میں سے ہر ایک کی نسبت جو رائے ظاہر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان مسائل پر کافی غور و فکر کیا ہے —

چھٹے باب میں سید احمد نے مسلمانوں کے اس طریقۂ تحقیق کا ذکر کیا ہے جو وہ آسمانی کتابوں کی صداقت پرکھنے کے لئے استعمال کرتے

ہیں - وہ طریقہ یہ ہے کہ ہمیں باوثوق لوگوں کے ایک سلسلہ کا علم ہونا چاہئیے جن کا تعلق صاحب کتاب کی ذات تک پہنچا ہو - چنانچہ سید احمد نے خود اپنی مثال اس موقع پر دی ہے - وہ کہتے ہیں کہ ۲۸ مشہور اور باوثوق اشخاص کے سلسلے کے توسط سے اُن تک قرآن کریم رسول الله سے پہنچا ہے —

ساتویں باب میں ان تصرفات کا ذکر ہے جو انجیل و توریت میں ہوئے ہیں - یہ خیال عام طور پر مسلمانوں میں رائج چلا آتا ہے - دراصل مصنف نے نہایت صفائی اور ہوشیاری سے اس نازک مسئلے پر بحث کی ہے - اس باب کو پڑھنے سے ان کے علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے - مصنف نے آٹھ قسم کے تصرفات کا ذکر کیا ہے اور ان سبھوں کو مثالوں کے ذریعہ سے واضح کیا ہے - پھر اس کے بعد انجیل مقدس کی مختلف کتابوں کے قدیم قلمی نسخوں پر مورخانہ تبصرہ کیا ہے اور بر محل تفصیل سے اپنے مطالب کی تشریح کی ہے —

آٹھویں باب میں سید احمد نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ آیا انجیل مقدس کی مختلف کتابیں اصلی وحی کی تعلیم کے مطابق ہیں یا یہ کہ ان میں بعد میں تصرفات ہوئے ہیں - چنانچہ مصنف نے اس مسئلے کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ وہی ہے جو عام طور پر مسلمانوں میں رائج ہے -

نویں باب میں یہ بتایا ہے کہ مسلمان لوگ انجیل مقدس کے ترجموں کو کس حد تک صحیح سمجھ سکتے ہیں اور ان پر اعتماد کرسکتے ہیں - میرے خیال میں یہ باب اس کتاب میں سب سے زیادہ دلچسپ ہے - شروع میں مصنف نے کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی دشواریوں پر عام افکار پیش کئے ہیں اور پھر اس کے بعد انجیل مقدس کے ان ترجموں پر پوری

غیر جانبداری کے ساتھہ تبصرہ کیا ھے جو مشرق اور مغرب میں اب تک کئے گئے ھیں - اسی ضمن میں ان ترجموں کا بھی ذکر آگیا ھے جو مختلف انجمن ھاے اشاعت انجیل کی جانب سے شائع ھو چکے ھیں - مثلاً ان ان عبرانی اور عرب ترجموں کا بھی ذکر ھے جو میرے استاد سلوستردے ساسی (Silvestre De Sacy) نے اور میں نے اصلی قدیم نسخوں سے مقابلے کے بعد شائع کرائے ھیں - اس کے علاوہ مصنف نے ان سب ھندوستانی ' فارسی ' عربی اور انگریزی ترجموں کا ذکر کیا ھے جو ان تک پہنچ سکے - اس باب کو لکھتے وقت مصنف کے پاس ۱۸ زبانوں کے ترجمے اور دو قلمی نسخے موجود تھے - ان قلمی نسخوں میں ایک عبرانی زبور کا تھا جس کا mazni نے عربی ترجمہ بھی کیا ھے - غالباً یہ نسخہ سولھویں یا سترھویں صدی عیسوی کا لکھا ھوا ھے - اس میں اور عام ' زبور ' میں اختلافات بھی پائے جاتے ھیں - دوسرا قلمی نسخہ چاروں Evangiles کا عربی زبان میں ھے - یہ روم کے سنہ ۱۶۷۱ ع والے ایڈیشن سے ملتا جلتا ھے اور میرے خیال میں غالباً اس کی نقل ھے - اس باب کے آخر میں لسانی خاندان کے اعتبار سے ان زبانوں کا نقشہ دیا ھے جن جن میں انجیل مقدس کا ترجمہ شائع ھو چکا ھے یا عنقریب ھونے والا ھے - یہ نقشہ " Bible of every land " سے نقل کیا ھے - السنہ کی جو تقسیم اس موقع پر دی ھے وہ بجائے خود علمی دلچسپی سے خالی نہیں —

دسویں باب میں ' جو اس کتاب کا آخری باب ھے ' مصنف نے اُن اسلامی احکام کا ذکر کیا ھے جن سے قدیم آسمانی کتب کے بعض حصے منسوخ ھو گئے ھیں - آخر میں دو ضمیمے ھیں پہلے ضمیمہ میں ان مشہور واقعات کی تاریخیں درج ھیں جن کا انجیل مقدس میں ذکر آیا ھے - یہ تاریخیں

نامور انگریز عالم دینیات یوشر (Usher) کے حوالے سے لی گئی ہیں
دوسرے ضمیمے میں تیرہ سو ہجری تک (۱۸۸۲ مطابق سن عیسوی)
سن ہجری اور سن عیسوی کی مطابقت قایم کی ہے - ۱۳۰۰ ہجری تک اس
واسطے کہ عام طور پر مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس سال کے بعد جو عہد
آئیگا وہ دنیا کا آخری عہد ہو گا ـــ

غرض کہ مصنف نے اپنی کتاب کی اس تمہید میں ذاتی اپج اور
اجتہاد سے کام لیا ہے - نہ صرف مسلمانوں بلکہ خود عیسائیوں کے لئے اس
میں بعض باتیں نئی اور سبق آموز ہیں - یہ کتاب یقیناً انجیل کی ایک
نہایت مکمل شرح ہو گی - تمہید کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف
کو ہماری مقدس کتب پر پورا عبور حاصل ہے اور ان کی نظر سب ضروری
معلومات پر پوری طرح حاوی ہے - اس کتاب میں وہ معلومات جو ہمیں
مختلف جگہ جستہ جستہ ملتی ہیں ' ایک جگہ اکھٹا مل جائینگی - ہاں '
ساتھ ہی ہمیں یہ امر فراموش نہ کرنا چاہئیے کہ مصنف ایک مسلمان ہے -
اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسیحی اور اسلامی
تعلیم میں میل پیدا کرے - لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ غالباً اس کے ہم مذہب
لوگ اس کی روا داری کی باتوں کو بری نظر سے دیکھیں گے - دوسری
جانب عیسائی لوگ غالباً کبھی اس بات کی صداقت کو تسلیم نہیں کریں
گے کہ قرآن بھی ایک آسمانی کتاب ہے - ہو گا یہ کہ مسلمان کفر کے فتوے
دیں گے اور عیسائی مصنف ان کے علمی اور صلح پسندانہ خیالات کے
ساتھ اتفاق کرنے سے انکار کریں گے - خیر ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ
دوسرے لوگ اس کتاب کو کس نظر سے دیکھیں گے - ہماری اپنی رائے یہ
ہے کہ مصنف نے یہ کتاب لکھ کر ایک بڑی علمی خدمت کی ہے - اس کتاب

کے پڑھنے سے مصنف کی روادارانہ ذہنیت کا صاف طور پر اظہار ہوتا ہے - موصوف اپنے مذہب اسلام پر قایم رہنے کے ساتھہ ساتھہ اسلامی عقاید کی جس قدر بھی مسیحی تاویل ممکن ہے کرنے پر آمادہ ہیں - جہاں کہیں وہ حضرت مسیح کا ذکر کرتے ہیں تو بالکل اسی طرح کرتے ہیں جیسے کوئی عیسائی کریگا - اس کتاب میں جگہ جگہ آپ کو " حضرت عیسیٰ " " سیدنا عیسیٰ " کے الفاظ ملیں گے - خود قرآن میں بھی حضرت مسیح کے لئے " روح اللہ " کا لفظ استعمال ہوا ہے - اس کتاب کے دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ موجود ہے جو انجیل مقدس کو پڑھتا ہے اور اس کی تعلیمات کو قدر منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے - انجیل کی متعدد کتابوں کے اردو میں ترجمے موجود ہیں - آج کل " ڈاکٹر ماتھر " " مرزا پور " میں ایک مکمل ایڈیشن فارسی رسم خط میں تیار کر رہے ہیں - موصوف نے لاطینی حروف میں سنہ ۱۸۶۰ ع میں اس ترجمے کو شائع کیا ہے - لیکن اب مزید اصلاحات کے بعد وہ یہ دوسرا ایڈیشن تیار کر رہے ہیں جو لندن والے ایڈیشن کی طرح " انجمن اشاعت انجیل برطانیہ و ممالک غیر " کی طرف سے شائع ہوگا - حال میں صوبۂ شمال مغربی کے مشنریوں نے یہ تجویز منظور کی ہے کہ اردو زبان میں انجیل کا ایک ایسا ترجمہ تیار کرنا چاہئے جو تمام ہندوستان میں بے چوں و چرا تسلیم کیا جائے - مجھے اس میں ذرا شبہ ہے کہ آیا یہ تجویز عنقریب عملی جامہ پہن سکے گی —

حال میں جن مصنفین کی نئی مطبوعات شائع ہوئی ہیں ان میں مولوی کریم الدین کا نام سب سے پہلے قابل ذکر ہے - میں سمجھتا ہوں آپ سب ان کے نام سے واقف ہوں گے - موصوف نے اس سال چھہ تصانیف

شائع کی ھیں - لاھور کے " مسٹر رابرٹ کسٹ " کی عنایت کی بدولت یہ سب میرے پاس بھیجی گئی ھیں —

پہلی کتاب " تسہیل القواعد " اردو زبان کی ھے یہ صرف و نحو کی کتاب نئے طریقہ پر لکھی گئی ھے اور پنجاب کے مدارس میں رائج ھے - یہ کتاب اسی نوعیت کی ھے جیسے میری کتاب " ھندوستانی زبان کے مبادیات " ھے - آپ کو معلوم ھوگا کہ میں نے حال ھی میں اس کا ایک نیا ایڈیشن نکالا ھے —

دوسری کتاب " کریم اللغات " ھے - اس میں عربی اور فارسی الفاظ کے اردو میں معنی دئے ھیں - یہ کتاب پنڈت اجودھیا پرشاد کے زیر اھتمام طبع ھوئی ھے —

تیسری کتاب " انشائے اردو " ھے - اس کے چار حصے ھیں - پہلے حصے میں خط نویسی کے نمونے دئے ھیں جو بزرگ اور خرد ' خرد اور بزرگ اور ھم عمر اور ھم مرتبہ لوگوں کے درمیان ھونی چاھئے - دوسرے حصے میں عرائض نویسی کے نمونے ھیں - تیسرے حصے میں دفاتر اور عدالتوں کے خطوط کے نمونے ھیں - چوتھے حصے میں کاروباری خطوط کے نمونے ھیں —

اس کتاب میں سب ضروری معلومات خط و کتابت کے متعلق موجود ھیں - عمر ' رشتے ' اور رتبے کے لحاظ سے جو القاب و آداب ھندوستانی میں استعمال ھوتے ھیں وہ سب اس کتاب میں مصنف نے جمع کردئے ھیں * دوستوں کو لکھنے کے جو آداب ھیں وہ بھی سب بیان کئے ھیں

---

* یہاں القاب و آداب کے فرانسیسی ترجمے دئیے ھیں —

اس کے علاوہ شیخ ' سید ' خان ' مغل ' منشی ' پنڈت اور سرکاری ملازموں کے القاب و آداب ہیں —

اسی قسم کی ایک کتاب ہندی میں بھی لاہور سے شائع ہوئی ہے - اس کا نام پتر ملک ہے —

ایک اور کتاب " پند سود مند " لاہور سے منشی محمد عظیم کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے اس میں قدیم اور جدید مصنفوں کے ڈیڑھ سو مقولے نقل کئے گئے ہیں - اس ڈیڑھ سو میں سو وہ نصائح ہیں جو لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھیں - ہندوستانی میں جو مقولے مروج ہیں وہ عام طور پر کہاوتیں ہیں * —

" لاہور " سے ایک اور کتاب نکلی ہے جس کا نام " خط تقدیر " ہے - یہ کتاب اخلاق پر ہے اگرچہ نثر میں ہے لیکن جا بجا اشعار ہیں - اس کتاب کے سرروق پر ایک شعر بطور طغری لکھا ہوا ہے † —

مولوی کریم الدین نے فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے دیوان حافظ کا ایک انتخاب شائع کیا ہے - اس کے علاوہ موصوف نے " سعدی " کا دیوان مع اس کی سوانح کے طبع کرایا ہے - یہ واضح رہے کہ دیوان " سعدی " کے کلکتہ والے ایڈیشن کے نسخے اب کم یاب ہوگئے ہیں اور اس کے اصل قلمی نسخے تو بالکل ہی نایاب ہیں —

---

* یہاں گارساں دتاسی نے چند مقولوں اور کہاوتوں کا فرانسیسی ترجمہ بھی کیا ہے —

† یہاں اس شعر کا فرانسیسی میں مطلب سمجھایا ہے کہ " تقدیر کی مثال موئے پریشان کی سی ہے جسے کنگھی سلجھاتی ہے " مطلب خبط سا ہے —

ہندوستانی کی اور کتابیں جو مجھے ہندوستان سے بھیجی گئی ہیں ان میں سنہ ۱۸۶۳ ع کی ایک جنتری ہے - پنڈت سورج بھان نے اس کو لاہور سے شائع کیا ہے - پنڈت جی ہندوستانی کے مشہور انشا پردازوں میں ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اس جنتری میں بہت مفید معلومات درج ہیں شروع میں اکیس کالموں میں ہندوستان کے مروج عہدوں کے مطابق ہر ماہ کے دنوں کا حساب ہے - پھر چاند کے دن کا حساب دنوں کا مختلف موسموں میں طول' سورج اور چاند کے مختلف مہینوں میں طلوع ہونے کے اوقات وغیرہ درج ہیں ہر مہینے کو دو صفحوں پر ختم کیا ہے - پہلے صفحے پر مذکورہ تفصیلات ملتی ہیں اور دوسرے پر خاص خاص دنوں کا حال ہے - پھر مسیحی' اسلامی' فصلی' یزد جردی سنین اور نو روز' سمت وغیرہ کے متعلق معلومات جمع کی ہیں - پھر چاند کی گردش' منحوس ایام' مدارات کی تقسیم' اوقات کا تعین' ہوا کے رخوں کی پہچان' اندھیری کے پندرہ دنوں (بدی) اور چاندنی کے پندرہ دنوں (سدی) کے متعلق تفصیل ہے - منطقۃ البروج کی علامات اور ان کے سب " نام " فارسی اور دیو ناگری رسم الخط میں ہیں - ہاتھ دیکھ کر آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے کے طریقے' وبا' اندھے پن اور زہریلے جانوروں کے کاٹنے کے علاج بھی بتائے ہیں ——

میں تعزیرات کے ہندوستانی ترجمہ کی نسبت ذکر کرچکا ہوں - یہ کام مولوی عبد اللطیف خاں نے انجام دیا جن کا میں ابھی ذکر کرچکا ہوں - موصوف نے آر - کسٹ کی ایک کتاب " گنج سوالات قانون فوجداری " کے نام سے ترجمہ کیا ہے - یہ کتاب نہایت مفید ہے - اس کے علاوہ " پنجاب کا قانون دیوانی " " رہنمائے مجسٹریٹ " بھی قابل ذکر ہیں - آخرالذکر " اسکپ وک " (Skip wick) کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے - اس

قسم کی اور بھی چند کتابیں شائع ہوئی ھیں سنہ ۱۸۶۱-۶۲ ع کی پنجاب کے نظم و نسق کی رپورٹ ھے - پنڈت اجودھیا پرشاد نے اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ھے - یہ رپورٹ ان لوگوں کے لئے اھمیت رکھتی ھے جو اس صوبے کے حالات سے ٹھیک ٹھیک واقفیت حاصل کرنا چاھتے ھیں - 'کپتان فلر' نے اس صوبے کی تعلیمی رپورٹ انگریزی میں پیش کی تھی - اس کا بھی اردو ترجمہ لالہ رام جس نے کیا ھے - اور دوسرے بعض رسالے قابل ذکر ھیں جیسے " دستور العمل مدارس تعلیم المعلمین " " رسالۂ نظام شمسی " وغیرہ - ھندی میں " حقایق الموجودات " (جسے چھوٹی سی دائرۃ المعارف سمجھنا چاھئے) اور " جامع النفائس " کا اردو سے ترجمہ ھو گیا ھے —

نئی کتابوں میں عبدالواسع ھانسوی اور دیوی پرشاد کی فارسی کی صرف و نحو قابل ذکر ھے - آخرالذکر ایک مشہور ھندو عالم ھیں - بریلی کالج کے قدیم طالب علم ھیں - آج کل ضلع فرخ آباد میں انسپکٹر مدارس ھیں - موصوف نے ضلع فرخ آباد کی اردو میں تاریخ لکھی ھے اور ایک کتاب ' مظہر قدرت " لکھی ھے جس میں مذھبی مسائل سے بحث کی ھے - موصوف نے حال ھی میں صرف و نحو کے علاوہ ایک لغت بھی لکھی ھے جس میں مختلف السنہ مثلاً ' اردو ' ھندی ' فارسی ' عربی ' بنگالی اور انگریزی کے الفاظ کے معنی ھیں اور ساتھ ھی ان الفاظ کی مشق کے لئے مثالیں بھی دی ھیں —

مجھے حال میں دو ھندی کتابوں کا حال معلوم ھوا ھے جن کے متعلق ذکر کرنا شاید آپ صاحبوں کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ھوگا - ایک " بھگتی بودک " ھے اور دوسری " سہسرا رتری سنکشیپ " ھے - اول الذکر میں سو مذھبی قصے ھیں - انہیں " جے پارسنز " نے ایک جگہ جمع کیا ھے - دوسری کتاب بنگالی کا ترجمہ ھے - یہ ترجمہ پنڈت بدری لال نے کیا ھے - موصوف ھندی کی

متعدد کتابوں کے مصنف ھیں —

اس سال پہلی جنوری کو گورنمنٹ پنجاب کی طرف سے نئی مطبوعات کی جو فہرست شائع ہوئی ھے اس میں بعض کتابیں قابل ذکر ھیں - اس ضمن میں میں آپ صاحبوں کو یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ھوں کہ اگر چہ صوبۂ پنجاب میں پنجابی بولی جاتی ھے لیکن سرکاری دفتروں اور مدارس میں ھندوستانی (اردو اور ھندی) استعمال ھوتی ھے —

اس فہرست کی بعض کتابیں یہ ھیں" جغرافیہ جہاں " " جام جہاں نما " " تاریخ عالم " " تاریخ اودھ " " تاریخ گوشۂ پنجاب "

میں نے جن کتابوں کے ابھی نام لئے ھیں ان میں تقریباً سب انگریزی زبان سے ترجمہ کی گئی ھیں - در اصل یورپین لوگوں کے لئے یہ بات باعث فخر ھونی چاھئے کہ ان کی کتابیں ھندوستان میں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ھیں اور ان کے ترجمے کئے جاتے ھیں - چنانچہ 'ولسن' نے 'رگ وید' پر جو تمہید لکھی تھی اس کا شیوپرشاد نے ھندی میں ترجمہ کردیا ھے - موصوف اس زمانہ کے مشہور انشاپردازوں میں ھیں اور تیس کتابوں کے مصنف ھیں - وہ ھندی اور اردو دونو میں لکھتے ھیں - انھوں نے سکھوں کے عروج و زوال کی تاریخ اور منو کے قوانین پر قلم فرسائی کی ھے - اس کے علاوہ سنسکرت اور انگریزی زبان سے متعدد ترجمے کئے ھیں - اس سال اور جو کتابیں شائع ھوئی ھیں ان کی فہرست یہ ھے - " کورس اردو " " پندنامۂ عیال داران " " مفتاح القواعد " " کلید گنج مال " " زبدۃالحساب " اور " ھدایت نامۂ جاگیرداران " —

میں نے آپ صاحبوں کے سامنے جن مطبوعات کا ذکر کیا ھے اس سے آپ پر یہ واضح ھوگیا ھوگا کہ ان کی بدولت اھل ھند میں تعلیم کا چرچا بڑھتا جا رھا ھے اور دن بدن

مغربی علوم میں اهل هند ترقی کر رهے هیں - یه بات قابل افسوس هے
که اب تک بہت کم هندوستانی اپنی تعلیمی تکمیل کی غرض سے یورپ
آئے هیں - اس میں مسلمانوں کے لئیے تو کوئی دشواری نہیں هے لیکن
هندوؤں کے لئے ولایت آنا بے دین هونے کے مرادف سمجھا جاتا هے - باوجود
اس کے بعض هندو همت کرکے سمندر پار آئے هیں - مثلاً مهی پترم روپ
رام * هیں جنهوں نے ذات باهر هونے کے خطرے کی مطلق پروا نہیں
کی اسی طرح کلکته کے پریسیڈنسی کالج کے ایک طالبعلم بابو ستندرا
ناتهه تگور بهی انگلستان تعلیم کی غرض سے آئے اور سول سروس
امتحان میں کامیاب هوکر واپس گئے - موصوف آج کل " بمبئی میں ایک
اعلیٰ سرکاری عہدہ پر مامور هیں —

هندوستان بهر میں آج کل تین یونیورسٹیاں هیں - ایک کلکته
میں دوسری بمبئی میں اور تیسری مدراس میں - ان یونیورسٹیوں
کے انتظامات نہایت عمدہ هیں اور ان میں طلبه کی ایک بڑی تعداد
تعلیم پا رهی هے - کلکته یونیورسٹی کو قائم هوئے اب چهه سال هوئے هیں -
اس دوران میں ۲۲۵ طلبه کا یونیورسٹی ڈگری کے لئے داخله هوا هے -
گزشته دو سال میں تقریباً دوسو طالبعلم شعبهٔ فنون میں کامیاب هوئے -
ان میں ۸۹ انٹرینس کے امتحان میں کامیاب هوئے - مخصوص شعبوں میں
۲۰ سول میں اور ۲۱ طبابت میں اور ۲۷ وکالت میں کامیاب رهے یه بات
قابل توجه هے که ان امتحانات میں مسلمان هندوؤں سے بہت پیچهے نظر
آتے هیں اور عیسائی بهی پیچهے هیں —

گزشته سرکاری امتحانات میں ۱۳۳۴ امیدواروں نے شرکت کی - ان

---

* خطبه ۲ دسمبر سنه ۱۸۶۱ ع —

میں سولہ سے لے کر بیس سال کی عمر کے امیدواروں میں ۷۱ عیسائی اور ۴۶ مسلمانوں نے شرکت کی ان امتحانات میں صوبہ سرحد لاهور اور کولمبو تک کے طلبۂ شرکت کرتے هیں - ان امتحانوں میں انگریزی کے علاوہ ایک اور زبان لازمی هوتی هے - امیدوار کو اختیار هے کہ وہ جونسی زبان چاهے منتخب کرے - چنانچہ ۱۰۲ طالبعلموں نے هندوستانی کو منتخب کیا ' ۳۰ نے سنکرت کو اور ۶ نے فارسی کو —

ابتدائی تعلیم بھی دن بدن ترقی کررهی هے - صرف صوبہ بنگال میں ۸۱۶ ابتدائی مدارس موجود هیں - ان مدارس میں تقریباً ۵۰ هزار طلبہ تعلیم پا رهے هیں - صوبۂ بمبئی میں ۶۸۰ ابتدائی مدارس هیں اور ان میں ۳۶ هزار سات سو پچاس طلبہ تعلیم پارهے هیں صوبہ مدراس میں ۵۷۹ مدارس هیں جن میں ۲۳ هزار نوسو پینستھہ طلبہ هیں - صوبہ جات شمال مغربی میں ' جہاں صرف هندوستانی بولی جاتی هے - تعلیم کی ترقی هورهی هے - ابتدائی مدارس کی تعداد ۱۰ هزار اسی هے جن میں طلبہ کی تعداد ایک لاکھہ ۷۴ هزار چھہ سو اُناسی هے * —

آگرہ میں سنہ ۱۸۵۰ ع میں ایک کالج قائم هوا هے جسے سینٹ جان کالج کہتے هیں - اس کالج میں نوجوان هندوؤں کو مغربی ادب اور علوم کی تعلیم دی جاتی هے - مسیحی رواداری کے اصول کے مطابق هر ذات کے هندو کا اس کالج میں داخلہ هوسکتا هے - اب تک کوئی خاص دشواری اس طرز عمل کی وجہ سے نہیں پیش آئی تھی لیکن ابھی حال میں ایک شدر ذات کے لڑکے کو کالج میں داخل کرنے سے دقت پیش آرهی هے - یہ لڑکا مہتر کا هے جس نے مسیحی مذهب قبول کر لیا هے - چنانچہ بطور احتجاج

* Indian Mail ستمبر سنہ ۱۸۶۳ ع

کالج کے ۲۰۰ ہندو طالب علموں نے علحدگی اختیار کرلی ھے - اس قسم کا کوئی واقعہ آگرہ کے دوسرے کالج میں جس کا نام وکٹوریہ کالج ھے، اب تک نہیں پیش آیا - اس کالج میں گذشتہ ستمبر میں ۳۵۱ طالب علم تھے - ان میں ۳۱۴ هندو، ۲۵ مسلمان اور صرف ۱۲ عیسائی تھے - اس کالج میں مختلف درسوں کی تعداد ۳۵ ھے - ۱۸ کا تعلق شعبۂ انگریزی سے ھے اور ۱۷ کا شعبۂ مشرقی سے موخرالذکر میں ۱۱ ہندوستانی (اردو اور هندی)، ۴ فارسی ، ایک عربی اور ایک سنسکرت کا درس هوتا ھے* —

میری معلومات اودھ کی قدیم مملکت کے متعلق بہت محدود ھیں - اس کے بر خلاف پنجاب کے حالات دریافت کرنے کے لئے میرے پاس کافی مسالا موجود ھے - یہ پانچ دریاؤں کا وسیع علاقہ جو پندرہ سال قبل ایک زبردست آزاد مملکت کی حیثیت رکھتا تھا آج سلطنت برطانیہ کا ایک حصہ ھے اور تعلیمی لحاظ سے خوب ترقی کر رھا ھے - کیپٹن " فلر " نے حال هي میں جو تعلیمی رپورٹ پیش کی ھے اس کے دیکھنے سے معلوم هوتا ھے کہ سنہ ۱۸۶۲ اور سنہ ۱۸۶۳ ع میں با وجود مالی حالت کی خرابی کے ۵۲ مدرسے اور نئے قایم هوئے ھیں اور طلبہ کی تعداد میں ۷ هزار پانچ سو دس کا اور اضافہ هوا ھے - چنانچہ گزشتہ سال کے پہلی جنوری کے اعداد و شمار کے مطابق اس صوبہ میں ابتدائی مدارس کی تعداد دو هزار چھتیس تک پہنچ چکی ھے اور طلبہ کی کل تعداد ۶۰ هزار ھے - ان میں سے ۵ هزار آٹھ سو چونتیس هندوستانی کے ذریعہ سے انگریزی زبان سیکھ رھے ھیں - لڑکیوں کے مدارس کی تعداد ۱۰۳ ھے - ان میں

---

* Indian Mail – نومبر سنہ ۱۸۶۳ ع

متعدد کتابوں کے مصنف ہیں —

اس سال پہلی جنوری کو گورنمنٹ پنجاب کی طرف سے نئی مطبوعات کی جو فہرست شائع ہوئی ہے اس میں بعض کتابیں قابل ذکر ہیں - اس ضمن میں میں آپ صاحبوں کو یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر چہ صوبۂ پنجاب میں پنجابی بولی جاتی ہے لیکن سرکاری دفتروں اور مدارس میں ہندوستانی (اردو اور ہندی) استعمال ہوتی ہے —

اس فہرست کی بعض کتابیں یہ ہیں" جغرافیہ جہاں " " جام جہاں نما " " تاریخ عالم " " تاریخ اودھ " " تاریخ گوشۂ پنجاب "

میں نے جن کتابوں کے ابھی نام لئے ہیں ان میں تقریباً سب انگریزی زبان سے ترجمہ کی گئی ہیں - در اصل یورپین لوگوں کے لئے یہ بات باعث فخر ہونی چاہئے کہ ان کی کتابیں ہندوستان میں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں اور ان کے ترجمے کئے جاتے ہیں - چنانچہ 'ولسن' نے 'رگ وید' پر جو تمہید لکھی تھی اس کا شیوپرشاد نے ہندی میں ترجمہ کردیا ہے - موصوف اس زمانہ کے مشہور انشاپردازوں میں ہیں اور تیس کتابوں کے مصنف ہیں - وہ ہندی اور اردو دونو میں لکھتے ہیں - انھوں نے سکھوں کے عروج و زوال کی تاریخ اور منو کے قوانین پر قلم فرسائی کی ہے - اس کے علاوہ سنسکرت اور انگریزی زبان سے متعدد ترجمے کئے ہیں - اس سال اور جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی فہرست یہ ہے - " کورس اردو " " پندنامۂ عیال داران " " مفتاح القواعد " " کلید گنج مال " " زبدۃالحساب " اور " ہدایت نامۂ جاگیرداران " —

میں نے آپ صاحبوں کے سامنے جن مطبوعات کا ذکر کیا ہے اس سے آپ پر یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ ان کی بدولت اہل ہند میں تعلیم کا چرچا بڑھتا جا رہا ہے اور دن بدن

مغربی علوم میں اهل هند ترقی کر رهے هیں - یه بات قابل افسوس هے که اب تک بہت کم هندوستانی اپنی تعلیمی تکمیل کی غرض سے یورپ آئے هیں - اس میں مسلمانوں کے لئے تو کوئی دشواری نہیں هے لیکن هندوؤں کے لئے ولایت آنا بے دین هونے کے مرادف سمجھا جاتا هے - باوجود اس کے بعض هندو همت کرکے سمندر پار آئے هیں - مثلاً سهی پترم روپ رام * هیں جنهوں نے ذات باهر هونے کے خطرے کی مطلق پروا نہیں کی اسی طرح کلکته کے پریسیڈنسی کالج کے ایک طالبعلم بابو ستندرا ناتهه ٹگور بهی انگلستان تعلیم کی غرض سے آئے اور سول سروس امتحان میں کامیاب هوکر واپس گئے - موصوف آج کل " بمبئی میں ایک اعلی سرکاری عهده پر مامور هیں —

هندوستان بهر میں آج کل تین یونیورسٹیاں هیں - ایک کلکته میں دوسری بمبئي میں اور تیسری مدراس میں - ان یونیورسٹیوں کے انتظامات نہایت عمده هیں اور ان میں طلبه کی ایک بڑی تعداد تعلیم پا رهی هے - کلکته یونیورسٹی کو قائم هوئے اب چهه سال هوئے هیں - اس دوران میں ۲۲۵ طلبه کا یونیورسٹی ڈگری کے لئے داخله هوا هے - گزشته دو سال میں تقریباً دوسو طالبعلم شعبۂ فنون میں کامیاب هوئے - ان میں ۸۹ انٹرینس کے امتحان میں کامیاب هوئے - مخصوص شعبوں میں ۲۰ سول میں اور ۲۱ طبابت میں اور ۲۷ وکالت میں کامیاب رهے یه بات قابل توجه هے که ان امتحانات میں مسلمان هندوؤں سے بہت پیچهے نظر آتے هیں اور عیسائي بهی پیچهے هیں —

گزشته سرکاری امتحانات میں ۱۳۳۴ امیدواروں نے شرکت کی - ان

---

* خطبه ۲ دسمبر سنه ۱۸۶۱ ع —

میں سوله سے لے کر بیس سال کی عمر کے امیدواروں میں ۷۱ عیسائی اور ۴۶ مسلمانوں نے شرکت کی ان امتحانات میں صوبه سرحد لاهور اور کولمبو تک کے طلبۂ شرکت کرتے هیں - ان امتحانوں میں انگریزی کے علاوہ ایک اور زبان لازمی هوتی هے - امیدوار کو اختیار هے که وہ جونسی زبان چاهے منتخب کرے - چنانچه ۱۰۲ طالبعلموں نے هندوستانی کو منتخب کیا ' ۲۰ نے سنکرت کو اور ۶ نے فارسی کو —

ابتدائی تعلیم بهی دن بدن ترقی کررهی هے - صرف صوبه بنگال میں ۸۱۶ ابتدائی مدارس موجود هیں - ان مدارس میں تقریباً ۵۰ هزار طلبه تعلیم پا رهے هیں - صوبۂ بمبئی میں ۶۸۰ ابتدائی مدارس هیں اور ان میں ۳۶ هزار سات سو پچاس طلبه تعلیم پارهے هیں صوبه مدراس میں ۵۷۹ مدارس هیں جن میں ۲۳ هزار نوسو پینسٹھ طلبه هیں - صوبه جات شمال مغربی میں ' جهاں صرف هندوستانی بولی جاتی هے - تعلیم کی ترقی هورهی هے - ابتدائی مدارس کی تعداد ۱۰ هزار اسی هے جن میں طلبه کی تعداد ایک لاکھ ۷۴ هزار چھه سو اُناسی هے * —

آگرہ میں سنه ۱۸۵۰ ع میں ایک کالج قائم هوا هے جسے سینٹ جان کالج کهتے هیں - اس کالج میں نوجوان هندوؤں کو مغربی ادب اور علوم کی تعلیم دی جاتی هے - مسیحی رواداری کے اصول کے مطابق هر ذات کے هندو کا اس کالج میں داخله هوسکتا هے - اب تک کوئی خاص دشواری اس طرز عمل کی وجه سے نهیں پیش آئی تهی لیکن ابهی حال میں ایک شدر ذات کے لڑکے کو کالج میں داخل کرنے سے دقت پیش آرهی هے - یه لڑکا مهتر کا هے جس نے مسیحی مذهب قبول کر لیا هے - چنانچه بطور احتجاج

* Indian Mail ستمبر سنه ۱۸۶۳ ع

کالج کے ۲۰۰ هندو طالب علموں نے علحدگی اختیار کرلی هے - اس قسم کا کوئی واقعه آگره کے دوسرے کالج میں جس کا نام وکٹوریه کالج هے' اب تک نهیں پیش آیا - اس کالج میں گذشته ستمبر میں ۳۵۱ طالب علم تھے - ان میں ۳۱۴ هندو' ۲۵ مسلمان اور صرف ۱۲ عیسائی تھے - اس کالج میں مختلف درسوں کی تعداد ۳۵ هے - ۱۸ کا تعلق شعبۂ انگریزی سے هے اور ۱۷ کا شعبۂ مشرقی سے موخرالذکر میں ۱۱ هندوستانی (اردو اور هندی)' ۴ فارسی ' ایک عربی اور ایک سنسکرت کا درس هوتا هے* —

میری معلومات اوده کی قدیم مملکت کے متعلق بہت محدود هیں - اس کے بر خلاف پنجاب کے حالات دریافت کرنے کے لئے میرے پاس کافی مسالا موجود هے - یه پانچ دریاؤں کا وسیع علاقه جو پندره سال قبل ایک زبردست آزاد مملکت کی حیثیت رکھتا تھا آج سلطنت برطانیه کا ایک حصه هے اور تعلیمی لحاظ سے خوب ترقی کر رها هے - کیپٹن " فلر " نے حال هی میں جو تعلیمی رپورٹ پیش کی هے اس کے دیکھنے سے معلوم هوتا هے که سنه ۱۸۶۲ اور سنه ۱۸۶۳ ع میں باوجود مالی حالت کی خرابی کے ۵۴ مدرسے اور نئے قایم هوئے هیں اور طلبه کی تعداد میں ۷ هزار پانچ سو دس کا اور اضافه هوا هے - چنانچه گزشته سال کے پہلی جنوری کے اعداد و شمار کے مطابق اس صوبه میں ابتدائی مدارس کی تعداد دو هزار چھتیس تک پہنچ چکی هے اور طلبه کی کل تعداد ۶۰ هزار هے - ان میں سے ۵ هزار آٹھه سو چونتیس هندوستانی کے ذریعه سے انگریزی زبان سیکھه رهے هیں - لڑکیوں کے مدارس کی تعداد ۱۰۳ هے - ان میں

---

* Indian Mail — نومبر سنه ۱۸۶۳ ع

تعلیم پانے والیوں کی تعداد ۲ ہزار دو سو چوبیس ہے گزشتہ سال کے مقابلے میں یہ تعداد دگنی ہے - ان مدارس کے علاوہ معلموں کی تعلیم کے مدارس ہیں - " لاہور " میں معلموں کی اعلی تعلیم کے لئے ایک کالج قایم ہوا ہے جس میں تعلیم پانے والوں کی تعداد دو سو ہے —

" لاہور " کا میڈیکل کالج بہت اچھی حالت میں ہے - گزشتہ سال اس میں ۵۰ طالب علم تھے جن میں سے ۳۰ نے جولائی میں اپنی تعلیم کی تکمیل کرلی ہوگی —

" بمبئی " کا صوبہ تعلیمی ترقی میں کسی طرح دوسرے صوبوں سے پیچھے نہیں ہے - " بمبئی " یونیورسٹی کے پاس اس وقت (Haileybury) کالج کا پورا کتب خانہ آگیا ہے - اس کتب خانے سے مشرقی علوم کی تحقیق میں بہت مدد ملے گی - " کاوس جی جہانگیر " نے' جو " بمبئی " کے ایک متمول پارسی ہیں اور جنہیں انگریز لوگ ان کی دولت کے باعث " نقدہ " (Ready Money) کے نام سے موسوم کرتے ہیں' اس یونیورسٹی کی عمارتوں کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی رقم بطور عطیہ دی ہے - موصوف نے مبلغ ۵ ہزار روپے کا انعام اس پارسی بیرسٹر کے لئے مقرر کیا ہے جو بمبئی ہائی کورٹ میں امتیاز حاصل کرے گا —

" بمبئی " میں ہندوستانی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جو انگریزی مدرسہ قایم ہوا ہے اس کا نام " Alexandra Native Girls' English Institution " ہے - اس کا افتتاح گزشتہ سال پہلی ستمبر کو ہوا - یہ مدرسہ "مانک جی کرست جی " کے مکان میں واقع ہے - ہمیں توقع ہے کہ چار ہزار روپے کے علاوہ جو اس مخیر اور فیاض شخص نے دئے ہیں اس کے اور دوسرے

احباب بھی مالی امداد کریں گے تا کہ اس مدرسے کی اپنی عمارت علحدہ بن جائے —

ایک اور پارسی ہیں جنھوں نے لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کے لئے چار ہزار روپے کی رقم عطا کی ہے اور ایک دوسرے شخص نے چار ہزار کی رقم سنسکرت مدرسہ کے لئے دی ہے - دو پارسیوں نے مل کر ' بمبئی ' یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ۵ ہزار روپے دئے ہیں اس رقم سے سالانہ ایک سونے کا تمغہ اس طالبعلم کو دیا جائیگا جو بہترین مضمون " ہندوستان میں مغربی علوم " پر لکھے گا - " جمشید جی جی جی بھائی " نے ' پونا ' میں ایک کالج قایم کرنے کے لئے ایک لاکھ کا عطیہ دیا ہے - دو اور پارسی ہیں جنھوں نے مل کر ایک لاکھ کا وعدہ کیا ہے - ایک اور پارسی ہیں جنھوں نے گجرات میں تعلیمی ترقی کے لئے ۵۰ ہزار کی رقم کا عطیہ دیا ہے —

آج کل ہندوستان میں فوٹو گرافی کا ہر جگہ رواج ہو رہا ہے - ہندوستانی لوگ اس کے اصول اور طریقے بڑے شوق سے سیکھ رہے ہیں - ' الہ آباد ' گزٹ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ' رڑکی ' کے تھومسن کالج میں ایک ماہر فوٹو گرافی بھی رکھا جائیگا تا کہ وہ دیسی طلبہ کو اس کے اصول و مبادیات سکھائے - غرض کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں فوٹو گرافی کا چرچا ہے- ' ٹراونکور ' میں ' ڈبلوٹیلر ' کی کتاب ' قدیم ہند کی عمارتیں ' سنگتراشی اور مصوری ' کو باتصویر شائع کیا گیا ہے - ' ڈبلوٹیلر ' کو اس کتاب پر راجہ ' ٹراونکور ' کی طرف سے انعام بھی مل چکا ہے —

ہندوستانیوں میں یوروپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اُسی قدر وہ ہمارے تہذیب و تمدن اور ہمارے اصول مذہبی سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں - ہندوستان میں تبلیغ مسیحیت کو جو کامیابی حاصل ہو رہی

ہے اس سے ہر عیسائی کو خوشی ہونی چاہئیے * 'جامی' نے اپنی 'یوسف زلیخا' میں ایک جگہ کہا ہے کہ 'سچائی کو دن دونی ترقی اور فروغ ہوتا ہے'۔ کیتھولک مجبوراً اپنی عبادت ہندوستانی گرجوں میں بھی لاطینی زبان میں کرتے ہیں لیکن 'پروٹسٹنٹ' اور 'انگلی کن' ہندوستانی اور دوسری مقامی زبانوں میں اپنی عبادت کی دعائیں پڑھتے ہیں - انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہندوستانی زبان میں انگریزی دعاؤں کی لے کو منتقل کرلیں لیکن یہ انگریزی لے ہندوستانی لوگوں کو ذرا نہیں بھاتی - بعض مشنری یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستانی راگوں کے مطابق اپنی دعاؤں کو ادا کریں اور ایک حد تک انھیں اس میں کامیابی بھی ہوئی ہے - چنانچہ ہندوستانی راگوں کو جو قدیم زمانے سے ہندوستان میں چلے آ رہے ہیں' یوروپین علامات میں لکھہ لیا گیا ہے - ان راگوں کے متعلق دیسی ماہرین موسیقی سے پوری معلومات حاصل کی گئی ہیں - چنانچہ اس قسم کے گیتوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے - † ہندوستانی موسیقی میں تحریری علامات نہیں استعمال ہوتیں - ان راگوں کو یورپین علامات کے ذریعہ تحریر کیا گیا ہے ان میں سے بعض راگ تو خاص طور پر اسی کے لئے موزوں کئے گئے ہیں لیکن بیشتر ان میں وہ ہیں جو ہندوؤں میں قدیم زمانہ سے چلے آتے ہیں - یہ دن' سال اور موسموں کے لحاظ سے ہوتے ہیں اور

---

* دیکھو ۹ جون سنہ ۱۸۶۳ ع کے Indian Mail میں "of Indian Missions" "Statisticallables" از ڈاکٹر "سلنز"

† بنارس - سنہ ۱۸۶۱ ع - "The Hindustani Choral Book" جے پارسن جے کرسچین اور "ایچ کالنس" نے اس کتاب کو تیار کیا ہے - ہندوستانی میں "سور سنگرا" قابل ذکر ہے - مجھے یہ کتابیں 'نافت' کے موسیولیون بورو نے بھیجی ہیں -

ان کے نام الگ الگ ھیں - مسلمانی گیت ھندو گیتوں سے مختلف ھوتے ھیں - ان میں سے بعض شجاعت علی خاں کے توسط سے حاصل ھوئے ھیں - موصوف پہلے مسلمان تھے اور اب مسیحی دین قبول کر لیا ھے - آج کل وہ کلکتہ کے دیسی گرجے میں پادری کی حیثیت سے کام کرتے ھیں - ھندو اور مسلمانوں کے گیتوں میں نہ صرف راگ اور سر کا فرق ھوتا ھے بلکہ ان کا اتار چڑھاؤ بالکل مختلف ھوتا ھے - ھندوؤں کے گیتوں میں اشعار کو اجزائے لفظی کی مقدار سے موزوں کرتے ھیں جیسے یونانی یا لاطینی میں اور مسلمانی گیتوں میں اجزائے لفظی کی تعداد کا لحاظ کیا جاتا ھے - یہ دوسرا طریقہ زیادہ سادہ ھے *

انگریزی مشن جو ھندوستان میں کام کر رھے ھیں انھیں خوب کامیابی ھو رھی ھے اور ھر روز ھندوستان میں مسیحی دین کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ھو رھا ھے - ۱۸۶۲ ع میں بنگال ، صوبہ شمالی مغربی ، صوبہ بمبئی اور صوبہ مدراس میں عیسائیوں کی کل تعداد ایک لاکھ اٹھارہ ھزار آٹھ سو نوے تھی - مشنریوں کی تعداد جو تبلیغی کام کررھے تھے ۴۱۸ تھی اور کل ھندوستان میں ۸۹۰ کلیسا تھے - گزشتہ سال جولائی کے مہینے میں ایک یوروپین سیاح "دھلی" کے دیسی کلیسا میں اتفاق سے پہنچ گیا تھا - اس نے بیان کیا ھے کہ اس نے وھاں عبادت میں شرکت کی - عبادت کی دعائیں اردو میں تھیں - اس کا بیان ھے کہ اس کلیسا کے ذریعہ سے انجیل مقدس کی نشرو اشاعت کا جو کام ھوتا ھے اس میں دیسی لوگ ، مرد ، عورتیں اور بچے شرکت کرتے ھیں اور دعاؤں کو گا گا کر پڑھتے ھیں - چھوٹا ناگپور میں " رانچی " کے کلیسا کے متعلق

* دیکھو میری کتاب "Rhetorique et prosodie de langues de l'orient Musulman"

بھی ایک دوسرے سیاح نے یہی بیان کیا ہے - فرق اتنا ہے کہ " رانچی " میں دعائیں ہندی میں پڑھی جاتی ہیں - * " امرتسر " میں کلیساء کی دیواروں پر حضرت مسیح کے " دس احکام " اور انجیل مقدس کے بعض دوسرے حصے ہندوستانی میں لکھے ہوئے گئے ہیں - صوبہ شمال مغربی کے دوسرے شہروں کا بھی بعینہ یہی حال ہے - ہر کہیں ہندوستانی زبان میں کلیسا کی دعائیں پڑھی جاتی ہیں —

گزشتہ سال ۳ مئی کو لندن میں " انجمن برائے اشاعت علم مسیحی " کی طرف سے جو جلسہ ہوا تھا اس میں ہندوستان کے ان مسیحی مدارس کے متعلق بہت دلچسپ تفصیلات بیان کی گئی ہیں جن میں ہندو اور مسلمانوں کے بچے بلا تکلف تعلیم حاصل کرتے ہیں - " شملہ " اور " جبل پور " میں حال ہی میں اس قسم کے مسیحی مدارس کھولے گئے ہیں - کلکتہ کے اسقف اور صوبجات متوسط کے ناظم تعلیمات نے " جبل پور " کے طلبہ کا امتحان لیا اور ان دونوں کا خیال ہے کہ ان کے جوابات قابل اطمینان تھے - اس طرح " ناگپور " کا مدرسہ بھی خوب ترقی پر ہے - " لندن " کے اس جلسہ میں کلکتہ کے اسقف کا ایک خط پڑھا گیا جس میں مذکور تھا کہ میں نے آگرہ ، الہ آباد ، " بھاگل پور " " کانپور " اور " بنارس " کے کلیساؤں میں ہندوستانی زبان میں بپتسما کی رسم ادا کی - پھر بنارس کے ایک دیسی مسیحی مبلغ کا ذکر کیا ہے جو چار سال سے کلیسا کے ایک ادنی عہدہ پر کام کر رہا ہے اور چونکہ اس کا کام قابل ستایش رہا ہے اس واسطے اس کو " واعظ " کے عہدہ پر ممتاز کر دیا گیا —

ہندوستان میں ان مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے مسیحی

---

* دیکھو " Colonial church chronicle " ماہ اگست اور دسمبر سنہ ۱۸۶۳ ع -

دین قبول کیا - بقول مور (Moore) :

جب کسی کٹر آدمی کا اعتقاد باطل عقیدہ پر جم جائے اور وہ اسے محبوب رکھنے لگے تو آخر تک وہ اس پر قائم رہتا ہے " —

بدقسمتی سے خود عیسائیوں میں جو باہم اختلافات ہیں ان کا ایشیائی لوگوں کی ذہینیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے - اگر یہ اختلافات ہندوستان میں رونما نہ ہوئے ہوتے تو آج مسیحی حلقہ زیادہ وسیع نظر آتا - ڈاکٹر " کولنسو " نے حال میں انجیل کی تعلیم پر جو افسوس ناک حملہ کیا ہے اس کا بھی بہت برا اثر پڑا - ڈاکٹر " کولنسو " کلیسا سے باغی ہوگئے ہیں - بدقسمتی سے وہ ہندوستان میں بہت شہرت رکھتے ہیں - انھوں نے علم الحساب کی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو بہت مقبول ہوئی ہیں - چنانچہ اس ضمن میں " کلکتہ " کا اخبار " بنگالی " کہتا ہے کہ جب کہ مسیحی تعلیم کے متعلق خود مشہور اہل یورپ کو شبہ ہے تو اس صورت میں ہندوؤں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے دین کو ترک کر کے عیسائی مذہب قبول کرلیں گے نہایت سہل بات ہے - لیکن اس اخبار کے لکھنے والے کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ ڈاکٹر " کولنسو " ممکن ہے ماہر علم حساب کی حیثیت سے لائق فائق ہوں لیکن علم دینیات میں وہ ماہر نہیں ہوسکتے - انھوں نے انجیل کی تعلیم پر جو اعتراضات کئے ہیں ان میں انھوں نے کوئی نئی بات نہیں کہی - سیکڑوں مرتبہ ان اعتراضات کے جوابات دئے جاچکے ہیں - یہ نہایت تعجب انگیز امر ہے کہ ڈاکٹر " کولنسو " کے اعتراضات کا جواب ہمیں سید احمد کی شرح میں ملتا ہے جس کی نسبت میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی ذکر کرچکا ہوں - سید احمد نے بنی اسرائیل کی آبادی بڑھنے اور " مصر " میں juda اور حضرت یوسف

کے زمانہ کے متعلق جو نکات پیدا کئے ھیں ان میں ڈاکٹر " کولنسو " کے اعتراضات کا شافی جواب پایا جاتا ھے —

ھندو اگرچہ اپنے مذھب کے معاملے میں نہایت قدامت پرست واقع ھوئے ھیں لیکن یورپین اور مسیحی تہذیب کا ان پر بہت اثر پڑرھا ھے - اب آھستہ آھستہ وہ اپنے آپ ان رسوم کو ترک کرتے جارھے ھیں جو مسیحی معیار سے معیوب ھیں - چنانچہ بنگال کے بعض معزز ھندوؤں نے گورنر جنرل اور مجلس وضع قوانین کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی ھے جس میں یہ استدعا کی ھے کہ تعداد ازدواج کو اسی طرح ھندوؤں میں قانوناً ممنوع قرار دیا جائے جس طرح ستی کی رسم ممنوع کردی گئی ھے - مجلس وضع قوانین کے آئندہ جلسے میں راجہ دیونرائن سنگھ ایک قرار داد پیش کرنے والے ھیں جس کی روسے اس مشرقی رسم قبیحہ کا کلی انسداد متصور ھے - یقیناً یہ بہت اچھا ھو اگر اس قسم کا قانون منظور ھوجائے لیکن اندیشہ یہ ھے کہ کہیں اس قانون سے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے - اس قسم کا قانون ایک عام مروجہ رسم کے بالکل خلاف ھوگا - جن مشنریوں کو ھندوؤں کو بپتسما دینا ھوتا ھے انھیں اس میں بڑی سہولت ھو جائیگی - اس لئے کہ مشنری ایسے لوگوں کو بپتسما کردینے میں تامل کرتے ھیں جن کی متعدد بیویاں ھوتی ھیں —

ھندوستان میں جن لوگوں کو بنی نوع انسان کے ساتھہ ھمدردی ھے وہ جس طرح بیواؤں کے جلانے اور تعداد ازدواج کی مخالفت کر رھے ھیں اسی طرح اور بہت ساری رسوم قبیحہ ھیں جنھیں وہ حقوق نسوان کے لئے نقصان رساں سمجھتے ھیں - مثال کے طور پر ایک رسم کو لیجئے جو دراصل ھندوؤں کی رسم ھے لیکن ھندوستان کے مسلمانوں میں بھی وہ

عام طور پر رائج ہوگئی ہے - ہماری مراد ہے عقد بیوگان کی ممانعت سے - چنانچہ شاہجہانپور میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کے ارکان میں ہندو اور مسلمان دونو شامل ہیں - اس انجمن کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں جو بری رسمیں پائی جاتی ہیں ان کی اصلاح کی جائے - اس انجمن کے گزشتہ اجلاس میں جو قرار داد منظور ہوئی ہے اس میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے کہ ارکان انجمن اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنائیں اور 'قاضی سر فراز علی' کو اس کے لئے خاص طور پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ ایک دستور العمل لکھیں جس میں پردہ نشین خواتین کو بتلایا جائے کہ کون کون سی نقصان رساں رسموں کی پابندی کے لئے وہ مجبور کی جاتی ہیں —

آپ حضرات مجھے معاف کریں کہ میں نے بعض مسائل کو بہت طول دے دیا - اب میں اپنے خطبے کو ختم کرنے سے پیشتر ان اصحاب کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اس سال راہی ملک عدم ہوئے ہیں —

سب سے پہلے بادشاہ دہلی بہادر شاہ کا نام آتا ہے - مرحوم نے ۷ نومبر سنہ ۱۸۶۲ ع بمقام 'رنگون' تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا - آپ سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کے بعد سے برابر اپنی باوفا بیوی زینت محل کے ساتھ 'رنگون' میں زندگی بسر کر رہے تھے - آپ کے ساتھ آپ کے صاحبزادے جواں بخت بھی تھے - * محمد بہادر شاہ ثانی غازی سنہ ۱۸۳۷ ع میں سراج الدین کے لقب سے اپنے والد ماجد اکبر شاہ ثانی کے انتقال پر تخت دہلی پر جلوہ افروز ہوئے - بادشاہ ہونے سے قبل آپ مرزا محمد علی ظفر کے نام سے مشہور تھے - 'ظفر کی یاد بہت سے دلوں

---

* میں نے اپنے ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۵۷ ع کے خطبے میں بادشاہ دہلی کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں —

کو عزیز ھے - وہ تیموری خاندان کے آخری چراغ تھے - قسمت نے ان کے ساتھہ یاوری نہ کی - ادب کے شائقین کو ان کے ساتھہ اور بھی لگاؤ ھونا چاھئے اس واسطے کہ وہ نہایت اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے * -

پچھلے اگست کی پہلی کو لندن میں مہارانی "چند کنور" کا انتقال ھوگیا - وہ پنجاب کے مہاراجہ دلیپ سنگھہ کی والدہ تھیں - باوجود اس کے کہ ان کے صاحبزادے دلیپ سنگھہ نے مسیحی دین قبول کرلیا لیکن مہارانی آخری دم تک اپنے آبا و اجداد کے مذھب پر قائم رھیں - ان کے انتقال پر دو سکھہ افسروں نے احتجاج کی کہ ان کی نعش کو جلایا جائے اور راکھہ کو ھندوستان بھیجا جائے تاکہ سکھہ دھرم کے مطابق وہ گنگا میں ڈالی جائے - لیکن یہ نہیں ھوا ان کے بیٹے "مہاراجہ دلیپ" نے *اس* کا اھتمام کیا کہ اس موقع پر کوئی رسم نہ برتی جائے نہ مسیحی اور نہ ھندو -

پچھلے اگست کی ۲۱ تاریخ کو نواب سورت میر جعفر علی خاں بھی ملک عدم کوسدھار گئے - ان کا انتقال "سورت محل" (Surat palace) میں ھوا - ان کے ساتھہ ان کے دیرینہ رفیق مرزا لطف اللہ رھا کرتے تھے - موصوف اپنی "خود نوشت" کے باعث یورپ میں اچھی خاصی شہرت حاصل کر چکے ھیں - نواب مرحوم انگریزوں اور ھندوستانیوں دونوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے - وہ ایک نہایت ھی مخیر اور فیاض شخص تھے - آپ پہلی مرتبہ سنہ ۱۸۴۴ ع میں انگلستان تشریف لائے تھے - پھر دوبارہ سنہ ۱۸۵۳ ع میں آئے تھے - اس مرتبہ پیرس بھی آئے تھے - پیرس میں بعض لوگوں نے انھیں دیکھہ کر کہا تھا کہ وہ ٹیپو سلطان سے بہت مشابہ ھیں - مرحوم سے میری متعدد بار ملاقاتیں رھیں آپ نے

---

* یہاں ظفر کے بعض اشعار کا فرانسیسی ترجمہ ھے -

مجھہ سے یہ بھی کہا تھا کہ سورت واپس ہونے پر اپنا سفر نامۂ یورپ شائع کریں گے - میں سمجھتا ہوں غالباً وہ اپنے اس ارادہ کو پورا نہ کر سکے* -

آخر میں میں " جان ویتلی " کے انتقال پر ملال کا ذکر کرتا ہوں - آپ " مالی معاملات " کے مصنف تھے - اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہوچکا ہے اور میں گزشتہ سال اس کا ذکر کرچکا ہوں - آپ " ڈبلن " کے مہا پادری (Archeveque) تھے آپ کا انتقال پچھلے اکتوبر میں ۸ تاریخ کو ہوا - ان کی ایک مشہور کتاب (Lessons on christian evidences) ہے - اس کتاب میں فلسفہ اور دینیات دونوں کے مسائل سے بحث کی ہے - یہ کتاب لارڈ " سمر " کی (Evidencey of christianity) سے بہت کچھہ ملتی جلتی ہے جو خود ایک زمانے میں " ڈبلن " کے مہا پادری رہ چکے تھے - اس آخر الذکر کتاب کا موسیو " مار سلین فرسن " ممبر کونسل نے نہایت شگفتہ فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے † —

ہم لوگوں کو جنھیں ہندوستانی علوم سے دلچسپی ہے خود بخود ہندوستانیوں کے ساتھہ بھی ایک طرح کا لگاؤ پیدا ہو گیا ہے - اس بات میں ہم سب سر چارلس وڈ کے نمونے پر عمل کر رہے ہیں - موصوف

---

*ملاحظ ہو نواب صاحب مرحوم کا خط جو جنوری سنہ ۱۸۵۵ ع کے (Revuede l' Orient) میں شائع ہوا ہے —

† یہ خطبہ چھپنے کے لئے دیا جا چکا تھا جب کہ مجھے اطلاع ملی کہ لارڈ ایلجن کا بمقام دھرم سالہ ۲۰ نومبر انتقال ہوگیا اور ان کی جگہہ سرجان لارنس کام کر رہے ہیں —

وزیر ہند ہیں اور ہندستانیوں کے بہی خواہ ہیں - آپ نے اعلان کیا ہے کہ انگریزی حکومت کے پیش نظر ہندوستان میں ہمیشہ یہ اصول رہے گا کہ ۱۸ کڑور مخلوق کے نفع کا خیال رکھا جائے تاکہ تاج برطانیہ کے سایۂ عاطفت میں جو لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں انہیں خوش حالی نصیب ہو - شاہی اعلان بھی اس اصول پر مبنی تھا - انگریزی عملداری میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب کے لئے یکساں قوانین ہوں گے اور کسی قسم کے امتیازات کا لحاظ نہیں کیا جائیگا - ہندوستان میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کا نام " برطانوی ہندی انجمن " (British Indian Association) ہے - اس انجمن نے ہندوستانی میں اور دوسری مقامی زبانوں میں اس خیال کی نشر واشاعت کو اپنا مقصد ٹھیرایا ہے کہ انگریزی عملداری کے فوائد و برکات سے ہندوستانیوں کو آگاہ کرے - ابھی حال ہی میں کلکتہ میں اس انجمن کا ایک اجلاس ہوا تھا جس میں " راجہ رادھا کنت دیو " بہادر نے صدارت فرمائی تھی - اس جلسہ میں " سر چارلس وڈ " کی رعایا نوازی پر تشکر کا اظہار کیا گیا - راجہ صاحب ایک نہایت فاضل شخص ہیں - اس موقع پر " راجہ کالی کرشن " نے حسب معمول اردو میں تقریر کی اور " سر چارلس " کی تعریف کی کہ انھوں نے ہندوستانیوں کو اس کا موقع دیا کہ وہ مجسٹریٹ کے عہدہ پر پہنچیں اور ملکی نظم و نسق کے اعلیٰ مراتب حاصل کریں - اور دوسرے متعدد لوگوں نے راجہ صاحب کے خیالات کی تائید میں تقریریں کیں اور صاحب وزیر ہند کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کئے جانے کی قرار داد منظور ہوئی —

میں نے آپ صاحبوں کے سامنے ابھی جو واقعات پیش کئے ان سے یقیناً یہ امید بندھتی ہے کہ ہندوستان جو دنیا کے بہترین ملکوں میں سے ہے

، سیٹھی تہذیب کی بدولت خواب غفلت سے بیدار ہوگا - دن بدن اس کے ادب کو فروغ ہو گا - در اصل ادب کا نشو و نما شروع ہو گیا ہے اور ہمیں پوری توقع ہے کہ جس طرح آج سارا یورپ اس کے قدیم ادبی شہکاروں کی تعریف میں رطب اللسان ہے اسی طرح وہ دن بھی عنقریب آنے والا ہے جب کہ اس کا موجودہ ادب بھی دنیا سے خراج تحسین حاصل کرے گا —

پو چوئی

از

(جناب محمد شرف عالم صاحب آرزو جلیلی -

ایم - ایس سی ریسرچ اسکالر راونشا کالج ' کٹک)

' پو چوئی ' ملک چین کا جلیل القدر شاعر شہر ' تائی ' ' یوان ' صوبہ " شانسی " میں پیدا ہوا - ایام طفولیت میں اُس کا قیام زیادہ تر شہر " جنگ یانگ " صوبہ " ہونان " میں رہا - اُس کا باپ درجۂ دوم کا مجسٹریٹ تھا - اُس کا خاندان بہت غریب تھا اور تکلیف و مصیبت سے دست و گریباں رہتا تھا —

" پو " نے سنہ ۸۰۱ ع میں " چانگ آن " میں مستقل بود و باش اختیار کر لی - یہ شہر شمالی مغربی محاذ پر تھا اور ملک کا سیاسی دارالسلطنت تھا - شہر " لویانگ " جو مشرق میں تھا اور جس کی آب و ہوا معتدل تھی - چین کا معاشرتی دارالسلطنت تھا —

سنہ ۸۰۴ ع میں ' پو ' کے باپ کا انتقال ہو گیا اور سنہ ۸۱۱ ع میں اُس کی ماں بھی اس دارفانی سے کوچ کر گئی - سنہ ۸۱۴ ع میں ' پو ' حکام کے غیض و غضب کا شکار ہو گیا - اُس نے دو میمو ریل لکھے تھے جس میں حکومت کی بعض جارحانہ کارروایوں کو جو تا تاریوں کے چھوتے سے

گروہ کو زیر کرنے کے لئے کی گئی تھیں - نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا - اُس نے چند نظمیں بھی لکھیں جس میں حکام کے مظالم اور عوم‌الناس کی مصیبتوں کا نقشہ کھینچا تھا - اتفاق سے عین اسی زمانہ میں وزیراعظم " وُوپو اُن هینگ " کو انقلاب پسند جماعت کے لیڈر " وو لوان چی " نے دن دھاڑے قتل کردیا - " پو " نے بادشاہ کے نام عرضی لکھی اور ملک کی بے چینی کو دفع کر نے کی درخواست کی - اس وقت " پو " شاهزادوں کے استاد کا نائب ناظم تھا - اُس کو اس قسم کی عرضی دینے کا حق نہیں حاصل تھا - دشمنوں کو اُس کے خلاف یہ موقعہ غنیمت مل گیا - انھوں نے ایک اور جرم " پو " پر عاید کیا - " پو " کی ماں کنویں میں گر کر مری تھی - کسی کنویں کے کنارے وہ پھولوں کو دیکھ کر محظوظ هورهی تھی کہ عالم محویت میں اُس کے پاؤں پھسل گئے تھے - " پو " نے اس کی وفات کے بعد دو نظمیں لکھیں - " پھولوں کی تعریف " میں اور "نیا کنواں "- پو کے دشمنوں نے اُس پر یہ جرم عاید کیا کہ ایسی نظمیں لکھ کر " پو " نے اپنی مُردہ ماں کے ساتھ گستاخی کی - اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ " پو " کو جلا وطن کر کے " لیو کیانگ " میں کسی معمولی عہدہ پر سرفراز کیا گیا - تین سال کے بعد اُس کو " چُو نگ چُو " کی گورنری ملی جو اس کے وطن سے بہت دور تھا - " چُونگ چُو " دلفریب باغوں اور خوش نماپھولوں کے لئے مشہور تھا - " پو " کو اِس شہر کے دلکش قدرتی مناظر بھا گئے - سنه ۸۱۹ ع میں وہ دارلسلطنت کو واپس بلالیا گیا اور دوسرے درجہ کا نائب ناظم بحال ھوا - سنه ۸۲۱ ع میں شہنشاہ " مو سنگ " تخت نشیں ھوا - اُس کی مطلق العنانی نے مُلک کے شمالی مغربی گوشہ میں بغاوت پھیلا دی - " چوئی " نے بادشاہ سے اپنا طرز عمل بدلنے کی استدعا کی - جس کا نتیجہ یہ ھوا کہ وہ پھر

دارالسلطنت سے ہٹا دیا گیا اور اس دفعہ " ہینگ چو " کا گورنر مقرر ہوا - سنہ ۸۲۴ ع میں اُس کی گورنری کا زمانہ ختم ہوگیا اور شہر " لویانگ " کے قریب ایک دیہات " بی تاؤلی " میں اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا - موسیقی اور رقص سے وہ اپنا دل بہلایا کرتا تھا —

سنہ ۸۲۵ ع میں وہ " سو چو " کا گورنر ہوگیا - اس وقت اس کا سن ترپن سال کا تھا - مگر یہاں اُس کا شباب از سرنو بیدار ہوگیا تھا - وہ ہمیشہ دعوتوں اور مجلسوں میں مشغول رہتا - دو سال کے بعد صحت خراب ہو جانے کی وجہ سے اُس کو یہ جگہ چھوڑ دینی پڑی - اس کے بعد وہ دارالسلطنت میں متفرق عہدوں پر معمور رہا - سنہ ۸۲۹ ع میں وہ " ہونان " کا گورنر ہوگیا —

اس کے بعد تیرہ سال تک وہ معمولی عہدوں پر جابجا معمور رہا - لیکن اب وہ دنیا کے ہنگاموں سے علیحدہ رہنے کی کوشش کررہا تھا - سنہ ۸۳۲ ع میں اُس نے خانقاہ " سیانگ شان " کو مرمت کرایا اور وہیں رہنے لگا - یہ خانقاہ ' مینگ مین " میں تھی جو " لویانگ " سے تھوڑے فاصلہ پر جنوب کی جانب تھا - یہاں دلچسپی کے لئے وہ اپنا روز نامچہ لکھنے لگا - سنہ ۸۳۹ ع کے موسم سرما میں اُس کا بایاں پاؤں فالج کا شکار ہوگیا - چند مہینوں کے بعد وہ اس قابل ہوا کہ لوگوں کے سہارے سے باغ وغیرہ کی سیر کر سکے —

" پو " کی زندگی کا باقی حصہ اپنی مکمل تصانیف کو ترتیب دینے میں صرف ہوا - سنہ ۸۴۹ ع میں اُس نے انتقال کیا اور یہ وصیت کی کہ اُس کا جنازہ شان و شوکت سے نہ نکالا جائے اور اُس کی لاش " سیانگ شان " کی خانقاہ میں دفن کی جائے —

پوچوئی کے دوست

چینی شاعری کا دار و مدار " دوستی " پر ہے - ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی دوست ضرور ہوتا ہے جس کا تذکرہ وہ اپنی نظموں میں کیا کرتا ہے - " پو " کے دوستوں میں سب سے ممتاز " یوان چین " تھا - ان دونوں میں غالباً سنہ ۸۰۲ ع سے دوستی شروع ہوئی - " پو " کا بیان ہے کہ دوستوں کی تلاش میں اُسے بہت دقت ہوتی تھی - کیونکہ وہ شطرنج یا چوسر وغیرہ سے نہیں واقف تھا جن کے ذریعہ لوگوں سے ملنے جلنے کا زیادہ موقع ملتا - زمانۂ دراز کے بعد اُس نے تین اور دوست حاصل کئے جن سے زندگی بھر ربط قائم رہا - ان میں سے ایک " لیویو سوی " عرف " مینگ تی " شاعر تھا - باقی دو حکام تھے - " ای چین " اور " سوئی سواں لیانگ " —

سنہ ۸۰۵ ع میں " یوان چین " کسی درباری افسر سے اظہار خود داری کرنے پر ' جلا وطن کر دیا گیا - " پو " نے اُس کی جدائی سے متاثر ہوکر حسب ذیل نظم لکھی :—

" میں شہر کی سڑکوں پر نظر دوڑاتا ہوں
سرخ سڑکیں اور اُن کے کنارے سبز اشجار -
مجھے صرف گاڑیاں گھوڑے ' اور سوار نظر آتے ہیں -
میں اُنھیں نہیں پاتا جن کے لئے میرا دل بیقرار ہے -
' کنگ تان ' شہر ' لویانگ ' میں انتقال کر گیا -
اور ' یوان چن ' جلا وطن کرکے ' چنگ من ' بھیجدیا گیا
ان سبھوں میں جو شمالی جنوبی سڑکوں پر چلتے ہیں -
ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کی قدر میں دوسروں سے زیادہ کرتا -"

سنہ ۸۲۱ ع میں ' یوان چن ' ' چنگ من ' سے واپس اگیا اور پھر ' پو ' کی زندگی خوشگوار ہو گئی - ' یوان چن ' سنہ ۸۳۱ ع میں انتقال کر گیا —

پو کی شاعری

' پو ' کا کلام عام فہم اور سلیس ہے - الفاظ اور محاورں کی سلاست اور شستگی کے لئے وہ مشہور ہے - کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی نظمیں کسی بوڑھی کسان پیشہ عورت کو سنایا کرتا تھا ' اور جو الفاظ اُس عورت کی سمجھ میں نہیں آتے انہیں بدل دیتا تھا - اس کے ہمعصروں کی نظموں میں مرصع الفاظ کا استعمال زیادہ ہے —

' کانفیو کیس ' کی طرح ' پو ' کا خیال تھا کہ کسی فن کا حقیقی مقصد صرف تعلیم دینا ہے - اس لئے وہ خود اپنی ہجویہ نظموں کو زیادہ پسند کرتا تھا - پھر بھی اس کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو محض کسی عارضی تاثر کے ماتحت کہی گئی ہوں - اپنی ہجویہ نظموں کے بارے میں " پو " کہتا ہے کہ جب ظالم حکام اور اُن کے مصاحب ان نظموں کو سنتے تھے تو اُن کے چہرے کا رنگ فق ہوجاتا تھا - " پو " کی ہجو گوئی میں مزاح کم اور سنجیدگی زیادہ ہے - اُس کی کسی ہجو میں شاعری کا پلہ نیچا نہیں ہے - اُس کی ہجویہ نظموں کو ہم " منظوم اخلاقی افسانے " کہہ سکتے ہیں —

" پو " نے دوسرے شاعروں کے کلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ' ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف " حسن بیان " کو نہیں پسند کرتا تھا - بلکہ اس کا خیال تھا کہ ہر نظم میں کوئی کار آمد اور مفید " اخلاقی تلقین " ہونی چاہئے —

" پو " کو اپنی زندگی میں جتنی شہرت نصیب ہوئی، شاید ہی دنیا کے کسی اور شاعر کو نصیب ہوئی ہو - اس کی نظمیں زبان زد خاص و عام تھیں - تعلیمی درسگاہوں، عبادت گاہوں اور جہازوں پر اس کی نظمیں کندہ تھیں - جس کسی کو " پو " کی کوئی نظم بھی یاد ہوتی وہ اس کا فخریہ اعلان کرتا اور لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے - مگر یہ ہر دل عزیزی اس کی رومانی نظموں کو نصیب تھی - "یوان چن" کو ' پو ' ایک خط میں لکھتا ہے : " دنیا میری ان نظموں کی زیادہ تعریف کرتی ہے جنھیں میں خود نہیں پسند کرتا - معاصرین میں صرف تم میری تخیلی نظموں کو سمجھ سکتے ہو - ممکن ہے کہ پھر صدیوں کے بعد کوئی میری نظموں کا سمجھنے والا پیدا ہو "—

' پو ' کی شہرت جاپان تک اس کی زندگی ہی میں پہنچ چکی تھی - جاپان میں اب تک اس کی بہت قدر ہے - یہاں تک، کہ شنطائی مذہب کے پیرو اسے دیوتا تصور کرتے ہیں - برٹش میوزیم میں اس کی تصانیف کی ایک ہی نقل ہے جو جاپان میں سترھویں صدی عیسوی میں طبع ہوئی تھی —

" پو " کی بعض نظموں کے ترجمے دلچسپی سے خالی نہیں ہونگے - اگرچہ ترجمہ سے زبان کی خوبیاں نہیں واضح ہو سکتیں، پھر بھی ہم اس کے تخیل کا مطالعہ کرسکتے ہیں —

" جنونی گیت "

" ہر شخص میں کوئی نہ کوئی فطری کمزوری ضرور ہے -
اور میری کمزوری یہ ہے کہ مجھے شاعری سے رغبت ہے —
میں نے زندگی کی ہزاروں قیود سے آزادی حاصل کر لی ہے -

مگر ابھی تک شاعری کا خبط نہیں گیا —
جب کبھی کسی خوشنما منظر کو دیکھتا ہوں —
یا کسی دوست سے ملاقات ہو جاتی ہے —
تو میں بلند آواز سےکوئی نظم پڑھتا ہوں —
اور ایسا خوش ہو جاتا ہوں کہ گویا میں نے خدا کا جلوہ دیکھ لیا ۔
جب سے میں جلا وطن کرکے " سون یانگ " بھیجدیا گیا —
میں اپنا آدھے سے زیادہ وقت پہاڑوں میں گذارتا ہوں —
اور اکثر ۔ جب کوئی نئی نظم تیار کرتا ہوں —
تو میں " مشرقی پہاڑ " کی جانب چلا جاتا ہوں ' —
سفید چٹانوں پر لیٹ جاتا ہوں ' —
جنگلی درختوں کی کسی سر سبز شاخ کو اپنی طرف جھکا لیتا ہوں '
اور میرا جنونی گیت پہاڑوں اور وادیوں میں گونج اُٹھتا ہے —
وحشی جانور ' اور چڑیاں قریب آ کر میرے نغمے سنتی ہیں —
دنیا کی طنز آمیز ہنسی سے بچنے کے لئے '
میں ایسی جگہ پسند کرتا ہوں جہاں انسان کا گزر ہی نہیں " —

" لانبا کمبل "

" کتنے غریب لوگ سردی سے ٹھٹھرتے ہونگے ! ہم اُنہیں کیسے بچا سکتے ہیں ؟

صرف ایک آدمی کو سردی سے محفوظ رکھنا کافی نہیں ہے —
کاش میرے پاس ایک بڑا سا کمبل ' ہوتا ۔ دس ہزار فیٹ لانبا جس سے میں بیک وقت سارے شہر کو ملفوف کر لیتا "

" یوان چن " کو خواب میں دیکھہ کر "

(یہ نظم " یوان چن " کی وفات کے آٹھہ سال کے بعد ' " پو " نے کہی تھی)

' میں نے تم کو خواب میں دیکھا ہم دونوں ہاتھہ میں ہاتھہ ڈال کر اِدھر اُدھر سرگرداں رہے '

جب صبح کے وقت میں بیدار ہوا ' کوئی اُن آنسوؤں کو روکنے والا نہ تھا جو میرے رومال پر گر رہے تھے '

دریائے ' پینگ ' کے کنارے میرا جسم زار تین بار بیمار پڑ چکا ہے *

' سین یانگ † ' میں تمھاری قبر کے سبزوں کے لئے آٹھہ بار موسم خزاں آ چکا ہے —

تم زمین کے نیچے دفن ہو اور تمھاری ہڈیاں خاک میں مل گئی ہیں -

میں انسانوں کی بستی میں رہتا ہوں - میرے بال برف کی مانند سفید ہو گئے ہیں —

' آوی ' اور ' ہاں لانگ ' ‡ نے یکے بعد دیگرے تمھاری اقتدا کی — عالم بالا میں تم نے اُنھیں بھی دیکھا تھا ؟ " —

جدائی

" کل میں نے سنا کہ فلاں ابن فلاں اس دار فانی سے کوچ کر گیا -
آج صبح مجھے معلوم ہوا کہ فلاں شخص اپنے اعزا کو داغ جدائی دے گیا -

---

* " یوان چن " کی وفات کے بعد

† ' چانگ آن ' کے قریب - اس شہر کا جدید نام ' سی نھگاں فو ' ہے -

‡ ' ای چن ' اور ' سوئی سوان لیانگ ' کے معروف نام جن سے ' پو ' انھیں یاد کرتا تھا —

دوستوں اور ملاقاتیوں کا دو تہائی حصہ ،

عالم ارواح میں چلا گیا —

جو گزر چکے ہیں انہیں پھر کبھی دیکھنے کا موقعہ نہیں ملیگا —

افسوس ! اُن کا ، ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا —

جو باقی ہیں ۔ وہ کہاں ہیں ؟

وہ سب منتشر ہیں ۔ ہزاروں میل کے فاصلہ پر

جن سے میں زندگی بھر صحبت کرتا رہا —

ان کو میں اپنی انگلیوں پر گن سکتا ہوں ۔ وہ کتنے ہیں ؟

صرف ' تنگ ' ۔ ' کؤو ' ۔ ' لی ' اور ' فینگ ' صوبوں کے

حاکم ۔ صرف چار اشخاص *

ایک دوسرے کی یاد میں ہمارے بال سفید ہوجاتے ہیں —

اس بزم فانی میں ہم سمندر کی موجوں کی طرح اُفتاں و

خیزاں رہتے ہیں —

آہ ! وہ اگلی صحبتیں ۔ وہ محفلیں ۔ وہ بزم آرائیاں،

ہمیں اس بُرا گندہ حالت میں چھوڑ کر فنا ہوگئیں !

ہم پھر کب ملینگے ! اور ساتھ شراب پیئں گے —

اور مسکراکر ایک دوسرے کو محویت سے دیکھیں گے ؟"

---

* " پو " کے چار دوست جن کا تذکرہ اس مضمون میں ہے، " یوان چن"
" سوئی سوان لھانگ " ۔ " لیوریو سی " ۔ " لی یون "

(آرزو جلیلی)

اُردو کے اَن پڑھ شاعر

از

[جناب مرزا ندا علی صاحب ' خنجر ' لکھنوی]

قدرت علی

ان کا نام میر قدرت علی تھا - عہد شاہی میں ' لکھنؤ میں پیدا
ہوئے - پڑھے لکھے بالکل نہ تھے مگر نہایت با وضع' احباب پرست ' زندہ
دل ' مرنجاں مرنجاں ' خلق مروت میں اگلوں کا صحیح نمونہ' وضع قطع بوی
قدیم شرفاے لکھنؤ کی سی تھی - بوکا پائجامہ' کبھی مشرو یا گلبدن کا'
سفید کرتا اُس پر باریک انگرکھا یا اچکن' جامدانی کی ٹوپی' جاڑوں میں یہ
لباس سرمائی کپڑوں سے بدل جاتا تھا - گھر سے نکلتے تو هاتھہ میں جریب
ضرور رهتی - چکن کا کارو بار کرتے تھے' قرب و جوار کے کاری گروں سے مال
تیار کراتے اور جب ذخیرہ جمع هو جاتا تو ممالک هند میں دورہ کرکے تجارت
کرتے - اکثر بلاد هند کی سیاحی کرچکے تھے - گفتگو میں الفاظ فصیح اور
لب و لہجہ شیریں هوتا اور کچھہ ایسی دل کشی و دلچسپی هوتی کہ سننے والا گھنٹوں
سنا کرتا لیکن سیری نہ هوتی - حافظہ حد سے زیادہ قوی تھا - شعراے
ماضی و حال کے هزار ها اشعار از بر تھے - اردو هو یا فارسی اچھا شعر ان کی

بیاض حافظہ میں محفوظ رہتا - " محشر صاحب " کا بیان ہے کہ ان دنوں ان کا بارہ تیرہ برس کا سن اور طالب علمی کا زمانہ تھا، شاعری کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ تھی اور میر صاحب اپنے شباب کو شیب سے بدل چکے تھے - جناب " محشر " کے نانا مرحوم سے نہایت درجہ خلوص و ارتباط تھا ' اکثر صحبتیں رہا کرتیں - بچوں سے بہت مانوس تھے، جب کبھی ان میں آ نکلتے تو ایسی باتیں کرتے جو ہم سن کو زیبا ہیں - پھر لطف یہ کہ وہ باتیں ایسی با اثر اور مزے دار ہوتیں کہ ان کا سلسلہ توڑنا گوارا نہ ہوتا - ایک مرتبہ میر صاحب تشریف لائے، حضرت " محشر " اور تین چار ان کے ہم سبق و ہم عمر طالب علم موجود تھے ' کتابیں کھلی ہوی آگے رکھی تھیں اور سبق یاد ہورہے تھے لیکن میر صاحب کے آتے ہی کتب درسیات گردان دئے گئے اور سب کے سب میر قدرت علی کی پر کیف باتیں سننے میں مصروف ہو گئے وہ کبھی ان کے قلوب کو اشتیاق کی چاشنی سے بھر دیتے، کبھی لب و لہجہ اور انداز بیان ظریفانہ ہو جاتا جس پر ہنسی ضبط کرنا دشوار تھا - اثناے گفتگو میں شعر و سخن کا چرچا چلا تو فرمایا " تم لوگوں کو اپنے حافظے پر بڑا ناز ہے، ایک دن مجھ بوڑھے سے بہت بازی ہو جائے میں بھی تو دیکھوں تم لوگ کتنے پانی میں ہو، لیکن شرط یہ ہے کہ دو میدان ہوں ایک دن اردو اور ایک دن فارسی کے اشعار پڑھے جائیں ' اردو ' فارسی شعروں کو کوی کھچڑی کرکے پڑھنا مجھے پسند نہیں - یہاں کیا عذر تھا ' یہ تو ہیں خواہش تھی فوراً اس ادبی الٹیمیٹم کو قبول کر لیا - دن بتاے گئے - میر صاحب حسب وعدہ تشریف لائے ۹ بجے کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر شعر خوانی شروع ہوئی - چار ذہین طالب علم ایک جانب اور ایک اسی مگر طباع

شاعر ایک طرف - اسی شغل میں آدھی رات گذر گئی لیکن میر صاحب کی یاد کا خزانہ اُسی طرح پر تھا! چار نوجوان طالب علم عاجز ہونے لگے - نتیجہ یہ ہوا کہ صبح چار بجے هزیمت قبول کرنا پڑی —

یہ تو اُس زبان کا حال تھا جس کی آغوش میں پرورش پا رہے تھے ' اب فارسی کا مآل کار سنئیے ' وہ میدان بھی میر قدرت علی کے ہاتھ رہا! —

میر قدرت علی محض حافظ اشعار ہی نہ تھے بلکہ انھیں قدرت نے طبع سلیم و ذہن رسا عطا کیا تھا - فی البدیہہ گوئی میں اتنا زبردست کمال حاصل تھا کہ اساتذہ فن بھی مقابلے میں لائے جائیں تو میر صاحب کا پلہ گراں رہے - طبیعت میں دریا کی سی روانی تھی - کہنے پر آتے تو بر جستہ نظم کے موتی پروتے چلے جاتے - مذاق سخن ستھرا تھا لیکن نام و نمود کی خواہش مطلق نہ تھی - کبھی اپنے آپ کو زمرۂ شعرا میں داخل کرنا پسند نہ کیا نہ کلام جمع کرنے کی فکر ہوئی - اُن کی شاعری محض تفنن طبع اور اقتضائے وقت پر موقوف تھی - جب کہیں اشعار پڑھے جانے لگے ' اُن کی حاضر طبیعت نے درفشانی شروع کردی - ادھر صحبت برخاست ہوئی اور اُدھر وہ اشعار بھی نابود ہو گئے - حضرت محشر کا قول ہے کہ میں نے بارہا اصرار کیا کہ آپ اپنے اشعار لکھوالیا کیجئے ' بلکہ اُن کی یہ خدمت خود انجام دینے کا وعدہ کیا لیکن میر صاحب نے قطعی انکار کرتے ہوئے منع کیا کہ میرے شعر نہ لکھنا ' یہ بھی فرمایا " میاں! میں جاہل آدمی ' شاعری کیا کروں گا ' یہ جو کچھ ہے تم لوگوں کو خوش کرنے کا سوانگ ہے ' بھلا! میرے اشعار بھی اس قابل ہیں جو لکھے جائیں - اب " محشر صاحب "

اُس وقت کو یاد کر کے متاسف ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں " مجھ سے یہ ایسی غلطی ہوئی جس کا قلق ہمیشہ کانٹے کی طرح دل میں کھٹکا کرتا ہے کیوں کہ مجھے ایسے موقع حاصل تھے کہ اگر چاہتا تو میر قدرت علی کا بہت ساکلام لکھ لیتا ' لیکن اُس زمانے میں بالکل خیال نہ آیا اور اب حافظہ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ لاکھ لاکھ غور کرتا ہوں لیکن اُن مرحوم کا کوئی شعر یاد نہیں آتا ۔

میر قدرت علی نے کبھی اس منشا سے شعر نہیں کہا کہ وہ اُس کے ذریعے سے شاعر متصور کئے جائیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسی اُستاد فن کے سامنے زانوئے شاگردی تہ نہیں کیا جو کچھ کہتے تھے اُس سے صرف تفریح منظور ہوتی یا سامعین کی ضیافت طبع مراد ہوتی ۔ اُن کا سارا کلام ضایع ہو چکا اب ایک شعر بھی دستیاب نہیں ہوتا ۔ جس طرح عرصہ ہوا ہوائے اجل نے اُن کا چراغ حیات گُل کر دیا دنیا کے پردے پر اب وہ شریف ہستی موجود نہیں اُسی صورت سے باد مخالف نے اُن کا سرمایۂ زندگی (کلام) بھی ناپید کر دیا ــــ

جب سے جناب محشر نے اِن مرحوم کے حالات بیان کئے تھے مجھے اُسی روز سے میر صاحب مرحوم کے کلام کی تلاش و جستجو تھی ۔ چوں کہ اُن کے پس ماندوں سے ناواقف محض تھا ۔ لہذا تذکروں کی ورق گردانی شروع کی ۔ اس کام میں تحصیل حاصل کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا ۔ یہ بھی گوارا نہ تھا کہ ایسے ذہین شخص کے احوال سے تذکرہ خالی رہے ۔ حسن اتفاق سے ایک پرانی بیاض (دیمک خوردہ) ہاتھ لگ گئی جس میں کسی شوقین نے اکثر شعرا کے کلام کا انتخاب لکھا تھا ' اس کی سیر میں ایک شعر نظر پڑا جو دیمک کے زہریلے اثر

ہے کسی قدر محفوظ تھا شعر کے اوپر " میر قدرت علی چکن فروش " تحریر تھا ' فوراً میرا خیال میر صاحب کی جانب متوجہ ہوا - نہ معلوم وہ یہی بزرگ ہیں یا کوئی اور مگر قیاس کی بنا پر انھیں میر صاحب کو فرض کرتے ہوئے اِن کے نام سے وہ شعر لکھتا ہوں - اِس سے میری غرض یہ ہے کہ حالات زندگی کے ساتھہ ایک شعر بھی ناظرین تذکرہ کو اِن کی یاد دلاتا رہے —

بتلائیے تو دل کو سرے کیا کیا حضور
مشکل میں ہے کہ آپ کی زلف رسا میں ہے

کبیر

اس مشہور و معروف عالی دماغ و نازک خیال شاعر نے سنہ ۱۳۹۸ ع میں بمقام کاشی پوری (بنارس) مسمی نورعلی یا نیرو کے گھر میں جنم لیا (جو کپڑا بننے کا پیشہ کرتا تھا) اور رفتہ رفتہ قوت شاعری کی استمداد و استعانت سے او تار کا مرتبہ حاصل کر کے ' ترقی کی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا شہرت و نا موری کی اُس حد تک پہنچ گیا جس کا ڈانڈا حیات جا وید کی پگڈنڈی سے جا ملتا ہے

کبیر کی ولادت کے باب میں مختلف روا یتیں وارد ہوئی ہیں ؛ اہل ہنود مورخین کا بیان ہے کہ یہ ایک بیوہ کا ہو نہار فرزند ہے جو در اصل گرو " راما نند جی " کی دعا کا خوش گوار نتیجہ ہے اور جسے بیوہ نے بد نامی کے خوف اور سو سائٹی کی طعنہ زنی کے خیال سے لہری تالاب (لہر تارہ) معروف بہ کبیر تلائی میں ڈال دیا تھا - حسن اتفاق سے اُسی روز نیرو جلا ہا اپنی دلہن کو اُس

کے میکے سے رخصت کراکے اپنے مکان لئے جاتا تھا - راستے میں دلہن کو پیاس معلوم ہوئی اور وہ اپنے خاوند کی اجازت سے تالاب پر پانی پینے گئی - وہاں بچہ کو پڑا پایا اور گود میں لئے ہوئے شوہر کے پاس واپس آئی - نیرو نے ابتداً ' تو بچہ کو اپنی حمایت و نگرانی میں قبول کرنے سے پس و پیش کیا لیکن بعد میں رضا مند ہو گیا اور گھر لاکر کبیر علی یا کبیر نام رکھا - آگے چل کے یہی خوش نصیب بچہ اہل ہنود کی عقیدت مندی سے کبیر داس کے لقب سے روشناس ہوا —

نیرو کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اُس نے کبیر کو (جو خواہ صلبی فرزند ہو یا بقول اہل ہنود دستیاب شدہ بچہ) مثل اولاد کے پرورش کیا - اُس کے گھر میں پشتہا پشت سے کپڑے بننے کا کام ہوتا آتا تھا لہذا کبیر کو بھی بجائے علمی تعلیم کے آبائی پیشہ سکھایا اور وہ نیرو کی طرح جلاہے کا کام کرنے لگا - اس کے علاوہ بھی بہت سی روائتیں ہیں جن میں کثرت سے عقائد شامل ہیں اور اُن سے مور خانہ طریقہ پر کوئی نتیجہ اخذ کرنا بہت دشوار ہے —

اس وہبی شاعر نے جس گھر میں جنم لیا تھا وہاں اصولاً علم و فضل کا چرچا مطلق نہ تھا ' شب و روز تانے بانے اور کرگہے کا مشغلہ جاری رہتا اور یہی اُن لوگوں کی معاش تھی - لیکن مبداء فیاض نے کبیر کو فطری ذہانت و ذکاوت عطا کی تھی اُس کی فلسفیانہ طبیعت قدرت کے لا تعداد مناظر کو عمیق نظروں سے دیکھتی اور اُن سے قابل قدر و سبق آموز نتائج پیدا کرتی - یہ سچ ہے کہ خیالات عالیہ کسی کی میراث نہیں ' خزانۂ قدرت جسے یہ دولت عطا کرتا ہے اُسے ملتی ہے - چنانچہ کبیر صغر سنی ہی میں ایسے ایسے نادر تخیلات پیش کرنے لگا

کہ اُس عہد کے علما و فضلا افراط حیرت سے انگشت بدنداں ہوگئے ۔ طبیعت میں تصوف حد درجہ موجود تھا، اخلاقی و تمدنی مضامین سیلاب کی طرح اُمڈا کرتے، معمولی معمولی باتوں سے بڑے بڑے نتائج نکال لینا اس کی طبع خدا ساز کا ادنیٰ کرشمہ تھا ۔ یہی سبب ہے کہ منھ سے نکلتے ہی اُس کی بانیاں اور دوہے زبان زد خاص و عام ہوجاتے، گلی کوچوں میں اشعار پڑھے جاتے پھر لطف یہ کہ ہر طبقے میں اُس کا کلام مقبول اور دل نشین تھا ۔ اگر عوام کی صحبتیں اس کی بانیوں سے گونجتی سنائی دیتیں تو خواص کی مجلسیں بھی اُس کے دوہوں سے رشک گلزار نظر آتیں ۔ ایک طرف عشق طینت طبائع اُس کے کلام سے لطف اندوز ہوتے تو دوسری جانب مرتاض زاہد اور خشک طبیعت پنڈت بھی اُس کے اشعار کو شمع معرفت الٰہی تصور کرتے ۔ مختصر یہ کہ اُس کے کلام کی دھوم تھی اور زمانہ شوق کا دامن پھیلائے اُس کے چمنستان مضامین کی گل چینی میں مصروف تھا —

کبیر مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا اور اہل ہنود کے طبقے میں قابل پرستش ٹھہرا ۔ اس کی بڑی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اُس میں تعصب کا نام تک نہ تھا ۔ جس طرح مسجد کے سامنے سر عبودیت خم کرنا اُس کا اصل ایمان تھا اُسی طرح مندروں اور شوالوں کو پرنام کرنا واجب و لازم جانتا تھا ۔ اُس نے کبھی بھولے بسرے بھی ہندو مسلم قوموں میں تفریق نہیں کی ۔ مخلوق کو ایک خالق کی خلقت تصور کیا اور ہر ایک سے برادرانہ سلوک سے پیش آیا جیسا کہ خود اُس کے مندرجۂ ذیل کلام سے ثابت ہے —

آؤں کا نہ جاؤں کا مروں کا نہ جیوں کا ۔ گرو کے ساتھ امیرس پیوں کا
کوئی پھیرے مالا کوئی پھیرے تسبی ۔ دیکھو رے لوگو دونوں کسبی

کوئی جاوے مکہ کوئی جاوے کاشی دونوں کے گلے بیچ پر گئی پھانسی
کوئی پوجے مڑھیاں کوئی پوجے گوراں دو او کی مڑھیاں ھیر لیئی چوراں
کہتے کبیر سنو نرلوئی
ھم نہ کسی کے نہ ھمارا کوئی

کبیر اُن لوگوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا جو مذہبی تعصبات کی زنجیروں میں جکڑے ھوئے ھیں - اُس کی یہی بے تعصبی بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ گئی کہ وہ اہل ھنود کے اعتقاد میں واجب التکریم و قابل پرستش دیوتا اور مسلمانوں میں اہل اللہ کے مرتبے پر فائز ھوا —

کبیر کے مزاج میں اول سے فقیری کا رنگ بیش بیش تھا جس نے بعد میں اُس کا آبائی پیشہ ترک کرا کے سجادہ نشین اور عابد و زاہد بنادیا —

کبیر کی شادی بھی ھوئی اور دو اولادیں بھی پیدا ھوئیں لیکن خرق عادات نے اُسے جس درجۂ عالیہ پر پہنچا دیا تھا اُسے دیکھتے ھوئے بہتوں نے اُسے نوع انسانی سے جدا کرکے خلقت ملکوتی تسلیم کیا اور جو رسوم خاکی نژاد انسانوں میں رائج ھیں اُن سے کلیتہً مستثنا خیال کیا - اسی وجہ سے ایک بڑا گروہ کبیر کے عیال دار ھونے کا منکر ھے - جس طرح بیسیوں روایتیں اُس کی ولادت کے بارے میں پیش کرتا ھے اُسی طرح مناکحت کے معاملے میں بھی بہت کچھ اختلاف سے کام لیتا ھے اور اُس کے کلام کا وہ حصہ ثبوت میں پیش کرتا ھے جو عورتوں کی طرف سے نفرت و حقارت پیدا کرنے کو تصنیف ھوا ھے اور اسی دلیل سے اُس کے دامن کو علائق کی آلودگی سے بری ثابت کرنے کی سعی سے کام لیتا ھے - اس جگہہ کچھہ کلام نقل کیا جاتا ھے —

ناری کی جھائیں پڑت، اندھا ہوت بھجنگ
کبیر تن کی کون گت (جو) نت ناری کے سنگ

کامنی، سندر سرپنی، جو چھیڑے تاہی کھائے
جو گرو چرنن راچیا، تن کے نکٹ نہ جائے

ایک ناری ایک ناگنی، اپنا جایا کھائے
کبھوں سر پر ہینکسی، اوچے ناگ بلائے

نینن کاجر پائی کے، گاڑھے باندھے کیس
ہاتھوں مہندی لائے کے باگھنی کھایا دیس

پر ناری پونی چھری مت کوئی لاوے انگ
راون کے دس سر گئے، پر ناری کے سنگ

اسی طرح اکثر اشعار سے وہ نفرت ظاہر ہوتی ہے جو کبیر کے دل میں جنس اُناث کی طرف سے موجود تھی —

کبیر کی شاعری میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ الفاظ کے عام معنی سے قطع نظر کرکے دوسرے معنی پیدا کر دیتا ہے - جو کلام تحت میں دیا جاتا ہے اُس سے کبیر کا طبیعی رنگ معلوم ہو گا ادنی باتوں سے اعلی نتائج نکالنا ہی وہ وصف ہے جس نے اس کے کلام کو حسن قبول عطا کر دیا —

تھگنی کا نیدا جھمکاوے تیرے ہاتھہ کبیر نہ آوے

کتھو کات سرد نگ بنایا ، نیہو کات مجیرا
پالتر تریا منگل گاوے ، ناچے بالم کھیرا

بھینس پدمنی چوہا عاشک ، مینڈک تال بجاوے
چولا پہر گدھیا ناچے ، اونت بسن پد گاوے
روپا پہرے روپ دکھاوے ، سونا پہن رجھاوے
گلے ڈال تلسی کا مالا ، تین لوک بھر ماوے
آم چڑھے مچھلی پھل توڑے کچھوا چن چن لاوے
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو برلا ارتھ لگاوے

اس میں شک نہیں کہ کبیر کے صوفیانہ مذاق نے اُسے مجرد زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی ہو گی مگر اُس کے عقیدت مند کر وہ سے روگردانی کرکے دیکھا جائے تو کبیر کی شادی ہونا امر مسلمہ ہے —

' کبیر ' کی بیوی کا نام ' لوئی ' تھا جس کے معنے ' کمبل ' کے ہیں اور لوئی ایک قسم کے پھول کو بھی کہتے ہیں - اس کے متعلق بھی مختلف باتیں مشہور ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ ایک روز ایک سادھو نے اُسے دریا سے نکالا تھا جو کمبل میں لپٹی ہوئی کہیں سے بہتی چلی آتی تھی - اسی سادھونے اس لڑکی کو اولاد کی طرح پال پوس کر بڑا کیا - جب ' لوئی ' سن تمیز کو پہنچی اور سادھو کا آخیر وقت آ پہنچا تو اُس نے بطور وصیت لوئی کو چند ہدایتیں کیں اور کہا کہ وہ اُس وقت تک اس جگہ سے کہیں نہ جائے جب تک اس کا جائز لے جانے والا نہ آئے - جو شخص اسے لینے آئے گا وہی اس کا شوہر ہوگا اور اس کی شناخت یہ بتائی کہ وہ اس کے تمام سوالوں کا جواب صرف ایک کلمے سے دے گا - چنانچہ سادھو کی وفات کے بعد بھی لوئی وہیں مقیم رہی - اس کا دستور تھا - کہ جو

مسافر یا فقیر راستہ سے گزرتا اُسے اپنی جھونپڑی میں مہمان کرتی، خاطر و مدارات سے پیش آتی اور رخصت کردیتی - ایک دن تین چار سادھو مہمان تھے اور کبیر بھی پہنچ گئے تھے - لوئی نے ہر سادھو کے سامنے علحدہ علحدہ دودھ کا ایک ایک پیالا پیش کیا اور سب نے تو اپنا اپنا ظرف خالی کرکے رکھہ دیا لیکن کبیر نے اپنے حصے کے دودھ کو ھاتھہ بھی نہیں لگایا - جب لوئی نے دعوت قبول کرنے کا اصرار کیا تو جواب دیا - " دریا پار سے ایک سادھو آرھا ھے یہ اس کے واسطے بچا رکھا ھے "- جملہ تمام ہوتے ھی ایک سادھو وارد ھوا اور وہ دودھ اُسے دیا گیا - لوئی کبیر کی اس غیب دانی سے نہایت متاثر ھوی اور دریافت کیا " آپ کا نام " جواب ملا کبیر، پتہ ٹھکانا اور کئی سوالوں کا جواب صرف لفظ کبیر سے دیا گیا - جس سے لوئی کو اس سادھو کی وصیت یاد آ گئی اس نے اسی وقت جھک کر کبیر کے چرن چھوئے اور کل حال بیان کیا اور کبیر کے ساتھہ چلی آئی —

کبیر سے لوئی کے یہاں دو بچے پیدا ھوئے ایک بیٹی اور ایک بیٹا - بیٹے کا نام کمال اور بیٹی کا نام کمالی تھا - اس میں کلام نہیں کہ کبیر عیال دار تھا - اگرچہ عورتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی نہ تھا نہ ان سے محبت کرنا پسند کرتا تھا جیسا کہ خود کہتا ھے —

ناری تو ھم بھی کری، جانا نہیں بچار
جب جانا تب پیر ھری، ناری بڑی بکار

جہاں جرائی سنہ ری - تو جلی جائے کبیر
اُوڑی کہ بھسم جو لاگ سی، سونا ھوئے سریر

چھوٹی موٹی کا منی ، سب ہی بس کی بیل
بئیری مارے داؤں دے ، یہ مارے ہنس کھیل

———

کبیر نے بعض ممالک کی سیر بھی کی ہے اور سیاحت میں جو تجربات حاصل ہوئے اُنھیں فلسفیانہ رنگ سے دل چسپ پیرائے میں بیان کیا ہے - کبیر نے ایک سو بیس برس کی عمر پائی اور شاعری کو شعار بنایا - سن کے ساتھہ خیالات عالیہ بڑھتے گئے اور زمین سخن میں ایسی ایسی نادر میناکاری کی جو اپنا مثل و نظیر نہیں رکھتی - کلام میں ہر طرح کا رنگ موجود ہے - تصوف تو خاص چیز ہے جو ہر نظم میں جھلک دکھاتا ہے - اس کے ماسوا اخلاق ، تمدن ، معاشرت ، پند و نصائح کی بھی کچھہ کمی نہیں - اس ذہین و طباع اور وہبی شاعر نے ضلع بستی کے ایک گاؤں مگھہ میں ایک سو بیس سال کی عمر پا کر سنہ ۱۵۱۸ ع میں وفات پائی اور اپنی یادگار میں اپنا زندۂ جاوید کلام چھوڑ گیا - چوں کہ بھاشا زبان کا شاعر تھا جو اُردو سے ملتی جلتی ہے اس لئے نمونتاً تھوڑا کلام نقل ہوتا ہے - حسن تخیل و ندرت مضامین قابل لحاظ ہے —

رنگی کو نارنگی کہیں ، بنے دودھ کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں ، دیکھہ کبیرا رویا

———

من کو ہارے ہار ہے ، من کو جیتے جیت
کہہ کبیرا پیو پائیے من ہی کی پرتیت

———

من پانچھوں کے بس پڑا من کے بس نہیں پانچ
جت دیکھوں تت دؤں لگی چھٹ بھاگوں تت آنچ

من مرید سنسار ہے ' گرو مرید کوی سادھ
جو مانے گرو بچن کو ' تا کا متا آگادھ

من چلے سو مانبا ' بے حد چلے سو سادھ
حد بے حد دونوں تجے ' تا کا متا آگادھ

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ ماں ثابت رہا نہ کوئے

چلوں چلوں سب کوی کہے ' پہنچے برلا کوئے
ایک کنک ارد کامنی ' در گم گھاٹی دوئے

پر ناری کے راچنے ' سدھا نرکئے جائے
تنکو جم چھوڑے نہیں ' کوٹن کرے اُپائے

آپو آپ چیتے نہیں ' کہو تو رسوا ہوئے
کہیں کبیر جو آپو نہ جاگے نا ست آست نا ہوئے

پر گت کہوں تو ماریا ' پردے لکھے نہ کوئے
سنہا چُھپا پوار تر ' کو کہہ بیرائی ہوئے

کلی کہوتا جگ انہ ہیرا شبد نہ مانے کوئے
جا ہی کہوں ہت اپنا ' سو اُٹھہ بیری ہوئے

من کے متے نہ چالئے ' من کے متے انیک
جو من پر اسوار ہے ' سو سادھو کوئی ایک

گلشن

گلشن بیگم نام گلشن تخلص - لکھنؤ کی باشندہ ' شریف خاندان ' عفت پرست و عصمت مآب - نکبت و افلاس نے امارت کے خواب فراموش کردئے - عسرت و تنگ دستی میں بسر ہوتی - جوانی میں غم بیوگی نصیب ہوا - مدت تک کس مپرسی کے عالم میں پر الم زندگی تیر کی - سنا جاتا ہے سینے پرونے کے کاموں میں کافی دستگاہ تھی - چکن خوب کاڑھتیں ' کتاؤ کے فن میں کامل ملکہ رکھتیں ' ایام ضعیفی اُجرتی کپڑے سی سی کر بسر کئے - اولادیں اُن کے سامنے ہی دنیا سے چل بسیں جس سے دل دردمند اور کلیجہ چھلنی ہو گیا - کچھہ مدت ہوئی دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا —

شاعری کا شوق بہت کم تھا لیکن حسن اعتقاد کبھی کبھی نوحہ و سلام کہوا دیتا - مدت العمر میں چند مرتبہ غزل کہنے کا بھی اتفاق ہوا شاید

یہی ابتدا اور یہی انتہائے غزل گوئی ہے - دو شعر دستیاب ہوئے جو لکھے جاتے ہیں —

تقدیر کی جفائیں ' ستم آسماں کے ہیں
کب تک لڑیں گے ان سے هم ایسے کہاں کے هیں

چپ چاپ کر بلا کی طرف بس چلی چلو
' گلشن ' یہ کیوں کہو کہ ارادے کہاں کے هیں

ادبیات

(از ٹیگور)

۲

ادبیات کا مسالا

(جس کا ترجمہ اصل بنگالی سے پنڈت ونشی
دھر صاحب ودیا لنکار ' لکچرار اورنگ آباد کالج نے دیا)

صرف اپنی مسرت کی خاطر لکھنے کا نام ادبیات نہیں ہے بعض لوگ نظم لکھ کر کہتے ہیں کہ جس طرح ایک پرندہ اپنی مسرت کی ترنگ میں چہچہاتا ہے اسی طرح شاعر کے کلام کا وجود اُسی کے اپنے واسطے ہوتا ہے گویا پڑھنے والے اُسے چھپ کر سنا کرتے ہیں —

یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ کسی پرندے کا خیال گاتے وقت اپنی ہم جنس جماعت کی طرف نہیں ہوتا اگر ایسا نہیں ہے تو نہ سہی - اس بات پر بحث کرنا فضول ہے لیکن مصنف کے کلام کا مطمح نظر پڑھنے والوں کی جماعت ہوتا ہے —

اِسی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مصنف کا کلام بناوٹی ہو جاتا ہے اور نہ یہ کہنے میں ہمیں کوئی اعتراض ہو سکتا ہے کہ ماں کا دودھ اپنی اولاد کے لئے ہے اور اسی وجہ سے وہ جوش مار کر خود بخود نکلتا ہے -

بعض لوگ خاموش شعر گوئی اور اندرونی جذبات کے تلاطم ھی کو شاعری خیال کرتے ہیں جو لکڑی جلتی نہیں ہے اگر اسے آگ کہیں تو جو انسان آسمان کو دیکھ کر اسی کی طرح خاموش ہوجاتا ہے اسے شاعر کہنا بھی ویسا ھی ہے - اشاعت ھی

ادبیات ھے - دل کی اندرونی تہ میں کیا ھے اور کیا نہیں ھے اس پر غور کرنے سے دوسرے انسانوں کو کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچتا - بھنڈار میں کیا جمع ھے اس کا اندازہ لگانے میں دوسرے لوگوں کو کوئی نفع یا نقصان حاصل نہیں ھوتا - ان کو تو متھائی دست بدست ملنی چاھئے --

ادبیات میں دلی جذبات کے اندرونی جوش کی بھی یہی حالت ھے - ھمیں یہی تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ تسلیم کرکے ھی غور کرنا پڑے گا کہ کلام خود مصنف کے لئے نہیں ھوتا --

ھمارے دلی جذبات کا یہ ایک قدرتی رجحان ھے کہ وہ بہت سے دلوں تک پہنچنا چاھتے ھیں - ھم قدرت میں دیکھتے ھیں کہ حیوانات کے اندر بڑھنے اور ھمیشہ قائم رھنے کی مسلسل کوشش جاری ھے جو حیوان اپنی اولاد کے ذریعہ خود کو جتنا بڑھا کر جتنی زیادہ جگہ گھیر سکتا ھے اتنا ھی زیادہ اس کی زندگی کا حق بڑہ جاتا ھے گویا وہ اپنی ھستی کو اتنا ھی زیادہ حقیقی بنالیتا ھے --

انسان کے دلی جذبات میں بھی ایسی ھی ایک تحریک ھے - فرق صرف اتنا ھے کہ حیوانات کا حق ملک اور وقت پر ھوتا ھے اور دلی جذبات کا حق دل اور وقت پر - دلی جذبات کا کام بہت سے دلوں کو ایک عرصہ تک اپنے زیر اثر رکھتا ھے --

صرف اسی خواھش کو پورا کرنے کے لئے کتنے ھی قدیم زمانے سے، کتنے ھی اشاروں میں، کتنی ھی زبانوں میں، کتنے ھی قسم کے خطوں میں کتنے ھی پتھروں کی کھدائیوں میں، کتنی ھی دھاتوں کی ڈھلائیوں میں، کتنے ھی چمڑوں کی بندھائیوں میں، کتنے ھیں پیڑوں کی چھالوں میں، پتوں میں، کاغذوں میں، کتنی ھی رنگ کار برشوں میں، کتنی ھی چھینیوں سے، قلموں سے، کتنی مصوری اور کیا کچھہ کوشش نہیں کی گئی ھے - بائیں طرف سے دائیں طرف اور دائیں طرف سے

بائیں طرف، اوپر سے نیچے کو ایک سطر سے دوسری سطر میں کیا کیا نہیں کیا گیا؟
میں نے جو کچھہ سوچا ھے، میں نے جو کچھہ محسوس کیا ھے وہ نہت رھے گا،
وہ ایک دل سے دوسرے دل میں، ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں منقش ھوتا ھوا
محسوس ھوتا ھوا اور بہتا ھوا چلے گا - ھمارا گھر، ھمارا سامان وغیرہ، ھمارا جسم،
ھمارے سکھہ دکھہ کے اسباب سب کچھہ مٹ جائیں گے، صرف میں نے جو کچھہ
غور کیا ھے، جو کچھہ محسوس کیا ھے وہ ابدالاباد تک انسان کے جذبات اور انسان
کی عقل کا سہارا لے کر ذی روح دنیا میں زندہ رھے گا —

وسط ایشیا کے ریگستان گوبی کے ریتیلے ڈھیر میں سے جب معدوم فلسفی
جماعت کے متعلق بھولے ھوے قدیم زمانے کی ایک پھٹی پرانی کتاب باھر نکل پڑتی
ھے تب اس کی غیر معروف زبان کے غیر معروف حروف کے بیچ میں سے کونسا درد
ظاھر ھوتا ھے کس وقت کی کس زندہ دل کی تحریک آج ھمارے دل کے اندر داخل
ھونے کے لئے بے تاب ھے؟ جس نے لکھا تھا وہ نہیں ھے، جس بستی میں لکھا گیا تھا
وہ بھی نہیں رھی لیکن انسان کے دل کا جذبہ انسان کے راحت و الم کے اندر پرورش
پانے کے لئے ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں آکر خود کو روشناس نہیں کرسکتا،
اپنے دونوں بازوں کو پھیلا کر منہ کی طرف دیکھہ رھا ھے —

دنیا کا سب سے نیک شہنشاہ اشوک اپنی جو باتیں مسلسل آنے والی دنیا
کو ھمیشہ سنانا چاھتا تھا ان کو اس نے پہاڑ کے جسم میں کھودیا تھا - وہ سوچتا
تھا کہ پہاڑ کسی وقت مرے گا نہیں، ھٹے گا نہیں، ابد کے راستے کے کنارے ھمیشہ
کھڑا رہ کر نئے نئے زمانے کے مسافروں کو ایک بات ابد تک دھرا دھرا کر سناتا
رھے گا - اس نے پہاڑ کو اپنی بات کے کہنے کی ذمہ داری سونپ دی تھی —

پہاڑ وقت اور بے وقت کا کچھہ بھی خیال نہ کرکے اس کی زبان کا حامل بنتا
چلا آیا ھے - کہاں اشوک؟ کہاں پاٹلی پتر؟ کہاں فرض کا احساس رکھنے والے ھندوستان

کا وہ شاندار زمانہ؟ لیکن پہاڑ اس زمانہ کی ان کتنی ہی باتوں کو غیر معروف رسم الخط میں، غیر مروج زبان میں آج بھی بول رہا ہے - کتنے دنوں تک وہ جنگل کو اپنی داستان سناتا رہا ہے ۔ اشوک کی وہ عظیم الشان زبان بھی کتنی صدیوں تک انسانی دلوں کو گونگے کی طرح اشاروں سے بلاتی رہی ہے ۔ راستے سے راجپوت گئے، پٹھان گئے، مغل گئے، برگی * کی تلواریں بجلی کی طرح نہایت تیزی سے ایک سمت سے دوسری سمت میں عدم کے چابک لگاتی ہوئی گزر گئیں لیکن کسی نے پلٹ کر ان اشاروں کا جواب نہیں دیا - سمندر پار کے جس معمولی سے جزیرے کا اشوک نے کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا - اس کے کاریگر جب پتھروں کی بڑی بڑی چٹانوں میں اس کے احکام کو کھود رہے تھے اُس وقت اُس جزیرے کے جنگل میں پھرنے والے " ڈروئڈ " لوگ اپنی پرستش کے جذبے کو بے زبان پتھروں کی لاٹوں میں تعمیر کیا کرتے تھے —— کئی ہزار سال کے بعد اسی جزیرے سے ایک پردیسی نے آکر قدیم زمانے کے اس گونگے اشاروں کے جال میں سے اس کی زبان کو آزاد کرکے زندہ کردیا - اس طرح شہنشاہ اشوک کی خواہش اتنی صدیوں کے بعد ایک پردیسی کی مدد سے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے قابل بنی وہ خواہش اور کچھ نہیں ہے - اشوک خواہ کتنا ہی بڑا شہنشاہ کیوں نہ ہو ، وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں ، اسے کونسی چیز پسند ہے اور کونسی ناپسند ؟ یہ باتیں اسے ایک راستہ کے مسافر کو بھی بتانی پڑیں گی - اس کے دل کا جذبہ اتنے زمانوں سے تمام انسانوں کے دلوں کا آسرا دیکھتا ہوا راستے کے ایک طرف کھڑا ہوا ہے - شہنشاہ کی اس خواہش کے مرکز کی طرف کچھ مسافر دیکھتے ہیں اور کچھ مسافر بغیر

* مرہٹوں کی حملہ کرنے والی مشہور سوار فوج —

دیکھے چلے جاتے ھیں —

یہ کہہ کر میں اشوک کے احکام کو " ادبیات " کہتا ھوں ایسی بات نہیں ھے - اس سے اتنا پتہ لگتا ھے کہ انسان کے دل کی بہت بڑی خواھش کونسی ھے ؟ ھم جس مورت کو گھڑ رھے ھیں، جس تصویر کو بنا رھے ھیں، جس نظم کو لکھہ رھے ھیں، پتھر کے جس مندر کی تعمیر کر رھے ھیں اور اس طرح ھر ملک میں ھمیشہ سے جو ایک انتھک کوشش جاری ھے وہ اور کچھہ نہیں ھے، انسان کا دل دوسرے انسان کے دل سے زندۂ جاوید ھونے کی خواھش کر رھا ھے —

جو ھمیشہ رھنے والی چیز انسان کے دل میں زندۂ جاوید بننے کی کوشش کرتی ھے عام طور پر وہ ھماری وقتی ضروریات اور حرکات سے مختلف طور پر امتیازی حیثیت اختیار کرلیتی ھے - ھم اپنی ضروریات کے لئے ھی چاول، جو، گیہوں وغیرہ بوتے ھیں - لیکن اگر ھم جنگل قائم کرنا چاھیں تو ھمیں جنگلی نباتات کے بیجوں کو اکھٹا کرنا پڑتا ھے —

ادبیات میں یہی ھمیشہ قائم رھنے کی کوشش ھی انسان کی دلپذیر کوشش ھے - اس لئے ملک کے خیر خواہ نقاد یہ کہہ کر کتنا ھی جوش کیوں نہ دلائیں کہ ملک میں مفید ادبیات کی کمی ھے صرف ڈراموں، ناولوں اور دیوانوں سے سارا ملک بھرتا چلا جارھا ھے، پھر بھی لکھنے والے ھوش میں نہیں آتے کیونکہ مفید ادبیات سے وقتی ضروریات پوری ھوجاتی ھیں لیکن غیر مفید مطالب ادبیات میں یعنے ایسی ادبیات میں جو وقتی ضرورت کو پورا نہیں کرتی قائم رھنے کا زیادہ امکان ھے —

جو باتیں علمی ھیں شائع ھو جانے پر ان کا مقصد پورا ھو جاتا اور وھیں ختم بھی ھوجاتا ھے - انسانوں کے علم میں نئی نئی ایجادوں کے

ذریعے سے پرانی ایجادیں روپوش ہوتی چلی جا رہی ہیں - کل جو چیزیں پنڈتوں کے لئے نا قابل فہم تھیں وہ آج کے بچوں کے لئے بھی نئی نہیں ہیں - جو حقیقت نئی شکل میں انقلاب انگیز ہوتی ہے وہ پرانی شکل میں حیرت بھی نہیں پیدا کرتی - آج جو حقیقت ایک معمولی سے شخص کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کسی زمانے میں بڑے بڑے عالم اس کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے - اس پر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے —

لیکن دلی جذبات کی حقیقت اشاعت کے ذریعے سے پرانی نہیں ہوتی - کسی علمی حقیقت کو ایک دفعہ جان لینے کے بعد دو بارہ جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی - آگ گرم ہے، سورج گول ہے، پانی مائع ہے یہ سب باتیں ایک مرتبہ جان لینے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں - دوسری دفعہ اگر کوئی شخص انہیں باتوں کو بطور نئی تعلیم کے ہمارے سامنے پیش کرے تو ہمیں اپنی قوت برداشت کو قابو' میں رکھنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن جذبات کی حقیقت کو بار بار محسوس کرنے پر بھی تکان معلوم نہیں ہوتی - سورج مشرق سے نکلتا ہے اس بات میں ہمارے دلوں کے لئے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی لیکن سورج کے نکلنے میں جو حسن اور مسرت ہے اس میں ازل سے لے کر آج تک بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی - احساس جس قدر قدیم زمانے سے اور جتنی مختلف نسلوں میں سے گزرتا ہوا آتا ہے اتنا ہی وہ ہمیں آسانی سے متاثر کر سکتا ہے —

اس لئے اگر انسان اپنی کسی چیز کو ہمیشہ کے لئے انسانوں کے دلوں میں روشن اور نئے جذبات میں زندۂ جاوید کرکے رکھنا چاہتا ہے تو اُسے جذبات کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے - اسی وجہ سے ادبیات کا خاص انحصار علمی مضامین پر نہیں ہے بلکہ جذبات پر ہے - اُس کے علاوہ علمی مباحث

کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے سے کام چل جاتا ہے - اصل تصنیف کو دوسری زبان میں بدل دینے سے بعض اوقات اُس کی خوبی اور بھی بڑھ جاتی ہے - اُس کے مضامین کو لے کر مختلف قسم کے لوگوں میں مختلف زبانوں کے ذریعے طرح طرح سے شائع کیا جا سکتا ہے' اسی طرح اس کا مقصد حقیقی طور پر پورا ہوتا رہتا ہے —

لیکن جذبات کے بارے میں یہ بات نہیں ہو سکتی - وہ جس شکل میں ڈھلے ہوئے ہیں پھر اُس سے الگ نہیں ہو سکتے —

علمی باتوں کو ثابت کرنا پڑتا ہے اور جذباتی کیفیات کو متحرک کرنا ضروری ہوتا ہے - اس کے لئے مختلف قسم کے اشارے کنائے اور طرح طرح کی شوخیوں اور انداز کی ضرورت ہوتی ہے - اسے صرف سمجھا کر کہہ دینے سے کام نہیں چل سکتا اسے خود پیدا کرنا پڑتا ہے —

یہ صنائع کی خوبیوں سے بھری ہوی تصنیف جذبات کا جسم ہوتی ہے - اس جسم میں جذبات کے قائم کرنے سے مصنفؔ کی حقیقت معلوم ہوتی ہے - اسی جسم کی فطرت اور ساخت کے مطابق ہی اس میں قائم کئے ہوئے جذبات انسانوں کے پاس عزت پاتے ہیں —— اس جسم کی قوت کے مطابق ہی یہ جذبات انسانی دلوں اور زمانوں میں پھیل سکتے ہیں —

روح کا انحصار صرف جسم پر ہے - پانی کی طرح اُسے ایک برتن سے دوسرے برتن میں ڈھالا نہیں جا سکتا - جسم اور روح آپس میں ایک دوسرے کو بڑھا چڑھا کر اک جان ہو کر رہتے ہیں —

جذبات ' اور حقائق تمام انسانوں میں یکساں ہوتے ہیں اگر انھیں ایک انسان ظاہر نہیں کرتا تو وقت آنے پر دوسرا انسان کرے گا - لیکن تصنیف مصنف کی بالکلیہ اپنی ہوتی ہے - وہ جس طرح ایک انسان کی ہو گی بالکل

اُسی طرح دوسرے کی نہیں ہوگی - اس لئے مصنف حقیقی طور پر اپنے کلام ہی میں زندہ رہتا ہے - جذبات اور مضمون میں نہیں —

" تصنیف " کے لحاظ سے " جذبات اور جذبات کو نمایاں کرنے کا طریقہ " ان دونوں باتوں کا ایک ساتھہ علم ہوجاتا ہے لیکن لکھنے کا طریقہ خاص طور پر لکھنے والے کا ہوتا ہے —

تالاب کھلے سے پانی اور کھودا ہوا قطعہ زمین ان دونوں باتوں کا ہمیں ساتھہ ساتھہ علم ہوتا ہے لیکن ان دونوں میں فضیلت کس کو ہے ؟ پانی انسان کی بنائی ہوی چیز نہیں ہے وہ ایک دوامی شے ہے - اسی پانی کو خاص طور پر زمانۂ دراز تک لوگوں کے استعمال کے لئے حفاظت کرکے قائم رکھنے کا جو طریقہ ہے وہ انسان کا اپنا ہے اور اسی وجہ سے لوگ بنانے والے کے گن گاتے ہیں - اسی طرح جذبہ بھی تمام انسانوں میں مشترک ہے لیکن اسے ایک مخصوص شکل میں تمام انسانوں کے لئے خاص لطف کا سرمایہ بنانے کا طریقہ ہی مصنف کی تعریف ہے —

اس لئے جذبہ کو اپنا بنا کر سب کا بنا دینا ہی " ادبیات " ہے اور یہی فن لطیف ہے - حرارت پانی میں ' خشکی میں ' ہوا میں ' مختلف چیزوں میں عام طور پر سب میں یکساں ہے لیکن درخت اور بیلیں وغیرہ اس کو مخفی طاقت کے زور سے پھلے پھل خاص شکل میں اپنا بنا لیتی ہیں اور اسی طریقہ سے زمانہ دراز تک وہ سب کے کام آنے والی چیز بن جاتی ہے - اس کا استعمال صرف کھانے پکانے اور گرمائی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعے سے خوبصورتی ' حفاظت اور صحت بھی حاصل ہوتی ہے —

اس وجہ سے دیکھا جاتا ہے کہ عام لوگوں کی چیز کو خاص طور پر اپنا بنا کر اُسی طریقہ سے پھر اُس کو عام لوگوں کا بنا دینا

ادبیات کا کام هے —

ایسا هونے پر علاوہ چیز ادبیات میں سے خود بخود نکل جاتی هے کیونکه انگریزی میں جسے " Truth " کہتے هیں اُسی کو هم اپنی زبان میں " سچ " کہتے هیں - یعنی جو چیز همارے فہم میں آسکتی هے اس کے لئے یه نہایت ضروری هے که اُس کو ذاتیات کے اپناپے سے الگ کرکے لکھا جائے - سچائی هر حال میں شخصیت سے بالا تر' بے داغ اور بے لاگ هوتی هے - قانون کشش ثقل جیسا همارے لئے هے ویسا هی دوسرے کے لئے هے یہاں اس کا کوئی موقع هی نہیں که انسان خواه وه کیسے هی مختلف اور عجیب دلوں کے هوں' اسے اپنے رنگ میں رنگ سکیں سایه پڑنا آسان نہیں هے —

جو چیزیں دوسروں کے دلوں میں حرکت اور جوش پیدا کرنے کے لئے ایسے دلوں سے جو فطرتاً ذهین هوتے هیں' سروں' رنگوں' اور اشاروں سے مالا مال هونے کی التجا کرتی هیں —— جو همارے دلوں کے ذریعے سے جب تک خلق نہیں هوجاتیں تب تک دوسروں کے دلوں میں نہیں بیٹھ سکتیں —— وهی چیزیں ادبیات کا مسالا هیں - وه شکل میں' طریقے میں' جذبے میں' زبان میں' سروں میں' بحروں میں اسی صورت میں جی سکتی هیں —— وه انسان کی بالکلیه اپنی هیں وه ایجاد نہیں هیں وه نقل نہیں هیں وه انسان کی خلق کرده هیں - اس لئے اُن کے ایک دفعه نمایاں هوجانے پر انهیں دوسری شکل یا حالت میں بدلنا ممکن هی نہیں - اُن کے هر جز پر اُن کے کل کا پورا انحصار هے - جہاں اس کے برخلاف دیکھا جاتا هے وهاں وه جز ادبیات میں سے خارج کردینے کے قابل هے —

ترکی ادبیات کا احیاء

(۲)

(نوشتہ ڈاکٹر جولی یس جرمانوس استاد اسلامیات بڈا پسٹ یونیورسٹی)

مترجمۂ

مولوی سید وہاج الدین صاحب لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد

سنہ ۱۸۲۶ ع کا ایک نہایت ابر آلود اور تاریک دن تھا - قصر توپ قاپو میں ' جو قسطنطنیہ میں نہایت پر فضا جگہ پر واقع ہے ' سلطان محمود ثانی نے اپنی سلطنت کے مدبرین ' علماء اور فوجی افسروں کو جمع کیا اور ترکی کے افسوس ناک حالات کے متعلق ان سے گفتگو کی - ملک سرکش ہو چلا تھا ' اور فوج ہزیمت خوردہ ' نظم و نسق ابتر تھا ' اور رعایا مفلوک الحال - سرکش جانثاری افواج سلطنت کی بربادی کے در پے تھیں ' اور کسی میں اتنی جرات نہ تھی کہ ان کی سرکوبی کرے - اس عالم یاس و نا امیدی میں ایک شخص عبدالرحمن آفندی اپنی جگہ سے اٹھا ' اور ایک مختصر لیکن دل ہلا دینی والی تقریر کی - دوران تقریر میں وفور جوش سے اس کی تسبیح اس کے ہاتھہ سے چھوٹ کر میز پر گر پڑی اور اس کے دانے بکھر گئے - اس نے کہا :—

" اگر خدا کی مرضی یہی ہے کہ ہمارا مذہب "

" اور ہماری سلطنت قائم رہے ' تو ہم ان بد کرداروں "
" کا قلع قمع کردیں گے ' نہیں تو اپنی سلطنت "
" اور اپنے مذہب کے نام پر خود قربان ہو جائیں گے "

اس کی یہ تقریر اپنا اثر دکھا گئی - تامل اور پس و پیش کی جو حالت پہلے تھی وہ جاتی رہی اور چند ہی روز میں 'ات میدان' پر چن چن کر ایک ایک جانثاری قتل کردیا گیا —

اسی واقعہ سے ترکی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے - پہلے یہ جانثاری عثمانی شوکت و عظمت کی بنیاد اور اس کے ستون تھے ' لیکن بعد کو یہی سلطنت کے حق میں سب سے زیادہ پر خطر بن گئے تھے ' اور جب ترکی جمہور نیند سے چونکی اور اس میں خودی کا احساس پیدا ہوا تو اس نے مستقبل کی بنیادیں رکھنے کے لئے ماضی کو مسمار کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا - ترکی قوم نے جس طرح اپنے دل کو سخت اور ارادہ کو مضبوط بنا کر جانثاریوں کو قتل کیا ہے ' وہ ان کی آئندہ کی تاریخ کے لئے بطور ایک مثال کے ہے ' اور اس کے بعد سے ہم ہمیشہ یہی دیکھتے ہیں کہ ترکوں نے اپنی مٹی ہوئی عظمت اور شوکت کے کھنڈروں ہی پر ایک تازہ روح اور ایک نئی زندگی کی بنیادیں رکھی ہیں - اگر کسی قوم کی تاریخ محض درباری سازشوں ' سیاسی ناکامیوں ' اور میدان جنگ میں شکست کھانے کی کہانی نہیں ' بلکہ جمہور کی روحانی زندگی اور تخلیقی قوت ارادی کی داستان ہوتی ہے ' تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ترکی تاریخ بھی زوال کی رام کہانی نہیں ' بلکہ ایک مقررہ منزل مقصود کی طرف برابر ترقی کرتے رہنے کی روئداد ہے - اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدی میں یکے بعد دیگرے متعدد صوبے ترکی کے ہاتھ سے نکل گئے '

لیکن اس کے سپوتوں نے لڑائی کے میدانوں میں ایسی ایسی جیوٹ دکھائی کہ ان کے جانی دشمن بھی ان کا لوھا مان گئے ' اگر ایک طرف ترکوں نے ظالم یورپ کے سیاسی حوصلوں کا مقابلہ تلوار سے کیا ' تو دوسری طرف ان کی ذھانت اور فراست نے ماضی کے نقوش کو ذھنوں سے محو کرکے ' یورپ کے مایۂ ناز مفکرین ' شعراء اور نغز گویوں کی روح کو اپنے اندر جذب کرلیا - ترکوں کی یہ جنگ مذھب کے واسطے نہیں ' بلکہ آزادی اور حریت کے لئے تھی ' جس میں کمال ھمت اور استقلال سے کام لے کر عہد رفتہ کے بہتر سے بہتر سرمایہ کو مستقبل کے فائدہ کے لئے بے دریغ قربان کردیا گیا —

ترکوں کی نشاۃ ثانیہ اور ترکی ادبیات کا تجدد مشرق کی تاریخ کا ایک عجیب و غریب واقعہ ھے - ترکوں کے پاس پہلے ھی سے ادبی سرمایہ موجود تھا ' جو ان کی تاریخ اور ان کے نظم معاشرت سے بہت قریبی مناسبت رکھتا تھا ' لیکن بعد کو جب سلطنت کے اختلال کے بعد پرانی معاشرت کا چولا بدلا ' تو لوگوں میں ایک دوسرا ھی ذوق اور ایک جدید روح پیدا ھوگئی ' جس نے انہیں تہذیب و شائستگی کے میدان میں آئندہ نئی نئی جولانیوں کے لئے تیار کردیا - سلطنت عثمانی کو بے شک زوال ھوا ' لیکن جمہور کی روح مردہ نہیں ھوئی —

قدیم ترکی ادبیات کی جڑیں اس زمانے کی معاشرت کی گہرائیوں تک پہنچی ھوی تھیں - اس ادب کا مرکز اور محور خاص خاص شخصیتیں ھوا کرتی تھیں - قصر شاھی ' سلطان اور اس کے ندماء - یہی شعراء و مصنفین کے سرپرست اور ان کا ماوی اور ملجاء تھے ' اس لئے ادبیات میں بھی انھی کی تحریک کام کرتی تھی - چونکہ رعایا کی حیثیت محض طبقہ اعلی کے ایک اقتصادی

آلہ کار کی سی تھی ، اور لفظ " قوم " کا اطلاق ان پر نہ ہوسکتا تھا ، اس لئیے ادبیات کا روے سخن بھی ان کی طرف نہ تھا ، اور ان کے مذاق اور ان کی ضروریات کا اس میں کوئی لحاظ نہ رکھا جاتا تھا —

قدیم ترکی ادبیات کا محور مذہبی الہامات ہوا کرتے تھے - شعراء کے کے دواوین اگر ایک طرف بنی نوع انسان کے اعلی سے اعلی اور شریفانہ جذبات کے راگ گاتے تھے ، تو دوسری طرف ہوسناکی کی پستیاں بھی ان میں اکثر نظر آتی تھیں - تصوف کو اعلی سے اعلی یا بدتر سے بدتر معنے پنہانا محض مصنفین یا قارئین کے ذوق پر منحصر تھا - ناسق کمال نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ دواوین سے جو شیطانی خیالات پیدا ہوگئے ہیں ، ان کی بنا پر یہ قیاس کرنا کچھہ زیادہ نا مناسب نہیں ہے کہ لفظ دیوان فارسی " دیو " سے نکلا ہے —

پرانا ترکی ادب محض مصنوعی اور تقلیدی تھا - اس میں معنی آفرینی کے بجاے سارا زور فکر صنایع لفظی پر صرف کیا جاتا تھا - ایسے دور از کار استعارے جو صرف انہیں لوگوں کی سمجھہ میں آسکتے یا پسند ہوتے تھے جو زبان کی باریکیوں سے واقف ہوں ، اس ادب کا مایۂ ناز تھے - ظاہر ہے کہ ایسا طرز نبھنے والا نہیں ہوتا - اس میں ترقی کی صلاحیت نہیں ہوتی ، نتیجہ یہ ہوا کہ بند پانی کی طرح یہ ادبیات بھی صرف چند مخصوص طبقوں میں محصور ہوکر رہ گئی - نثر کا ادب تو اس خصوصیت میں نظم سے بھی بدتر تھا ، اس لئیے کہ بحر و قوافی کی پابندیاں پھر بھی مہمل الفاظ کی بھرتی اشعار میں زیادہ نہیں ہونے دیتیں - شعر کا موضوع البتہ تنگ اور محدود تھا - نبی نے ذیل کے اشعار میں اسی کی شکایت کی ہے :—

باقسہ اءے اکثر سخن شاعرخام سنبل و زلف و مے و بلبل و جام
چیقا سان دائرہ دلبردن خط و خال و لب و چشم تردن
(الخ)

(اگر غور کرو تو اکثر شعراء کے سخن کو خام پاو گے —
اس میں صرف سنبل و زلف و مےء و بلبل و جام ہوتا ہے۔
ان کے نقوش دلبر کے دائرہ سے باہر نہیں آنے پاتے۔
بس اس کے خط و خال ہیں ' یا لب یا نشیلی نگاہیں۔ ایک سبزہ زار پر کلیلیں کرتا ہے۔ دوسرا بہار کے مزے لوٹتا ہے۔ کوی نئے راستوں میں قدم نہیں رکھتا —
بلکہ پرانے جانے پہچانے رستوں پر پڑے ہوے چلے جارہے ہیں)۔

مذکورہ بالا چند اشعار پڑھ کر ہم قدیم ترکی ادبیات کی اچھی خاصی تصویر اپنے ذہنوں میں قائم کرسکتے ہیں۔ یہ قدیم مذہب ادبیات کلاسک ' لکیر کا فقیر ' اور لفاظی سے بھرا ہوا ہے ' لیکن یہ بات چنداں تعجب خیز نہیں ہے ' اس لئے کہ اس زمانے کی معاشرت اور زندگی بھی ایسی ہی تھی ' انسانوں کی اُمنگیں پست اور اغراض محدود تھے ' چنانچہ ادبیات کے بھی جو تھوڑے بہت اصناف تھے ' وہ بھی انہیں کی ہمنوائی کرتے تھے۔ پرانا مذہب ادبیات تمثیلی تھا۔ حقیقت نگاری اس میں نہ تھی ' اس میں نری تخیل آفرینی تھی اور وہ بھی چند بندھی تکی اصناف میں۔ جزئیات اپنی اپنی جگہ پر بہت پرشکوہ ہوتی تھیں ' لیکن مجموعی حیثیت سے ساخت ناقص ہوتی تھی۔ اس زمانہ کی ادبیات میں تم کو جذبات کا تلاطم نظر نہ آئے گا ' بلکہ ہلکے اور دھیمے تاثرات' اور ایسے پیش پا افتادہ استعارات ملیں گے' جن کا حقیقی زندگی سے کوئی لگاؤ ہی نہیں۔ مختصر

یہ ہے کہ یہ ادبیات ایک مصنوعی اور خود ساختہ طبقہ کے مذاق کی آئینہ دار تھی، اور اس لئے خود بھی مصنوعی تھی - شعراء جمہور کے درمیان رہتے سہتے تھے، لیکن جمہور کو شعراء کے دیوانوں میں کوئی جگہ نہ ملتی تھی - ان کے پر شکوہ قصیدوں اور عاشقانہ غزلوں میں تمہیں عام انسانوں، کھیتوں میں کام کرنے والوں، کسی دور دراز میدان جنگ میں خون میں نہاکر مرنے والوں کے جذبات، ان کی امنگیں، ان کے صدمات، ان کی خوشیاں، ان کے غم و الم، ان کے حوصلے —— ان میں سے کسی ایک کی بھی صداے بازگشت سنائی نہ دے گی - اس ادبیات میں کسی قسم کی انفرادیت یا شخصیت تمہیں نظر نہ آے گی، اس لئے کہ اس نے اپنے سانچے روز مرہ کی معمولی زندگی سے نہیں لئے تھے، بلکہ ایک سانچہ پسند کرلیا تھا، اور اسی کو ہر موقع پر استعمال کیا جاتا تھا - تمام قدیم ترکی شاعروں کے معشوق ہو بہو ایک سے ہیں، اور تمام شعرا کی مثنویوں میں جو جذبات رنج و الم بیان کئے گئے ہیں وہ سب کے سب ایک ہی فرضی اور خیالی شکستہ دل سے نکلے ہیں —

انقلاب فرانس نے حریت کے انفرادی جذبات پیدا کرکے مشرق قریب کو بھی خواب سے بیدار کردیا - نپولین جب مصر میں پہنچا، تو نئی نئی حربی چالوں کے ساتھ نیا عربی چھاپہ خانہ بھی اس کے ساتھ وہاں داخل ہوا - انقلابی خیالات اور یورپی باشندوں کی بیداری نے ترکوں کے تخیلات اور احساسات میں بھی حرکت پیدا کی فرانسیسیوں سے تو وہ پہلے ہی سے واقف تھے، اور جب انہوں نے دیکھا کہ فرانسیسی فوجوں نے یورپ کے صدیوں کے جمے ہوے تخت الٹ کر رکھدئے ہیں، تو مشرق کی کہنہ اور خواب آلود فضا میں بھی انفرادیت، تشکیک اور نئی تحقیق و تلاش کا شوق

تیزی کے ساتھہ سرایت کر گیا - سر زمین فرانس ترکوں کی نظروں میں
ایک نیا جہان اور نیا عالم بن گئی، اور جس طرح وہ صدیوں سے مشرقی
خیالات پر ثابت قدم تھے، اسی طرح اب صرف فرانس کے مطیع و معتقد اور ثناخواں
بن گئے - فرانسیسی تخیلات، فرانسیسی افکار کے نمونے، فرانسیسی مذاق ادبی،
فرانسیسی معاشرت - ان کی کشش نے ترکی کے بہترین دل و دماغ کو
اپنی طرف مائل کرلیا، اور انھوں نے اس کی کوشش کی جس طرح ہوسکے،
فرانس کے خیالات کو مشرق کی فضا کے موافق اور مطابق بنالیا جاے -
سلطان محمود کو جن مشکلات و حوادث کا سامنا کرنا پڑا تھا، ان کا تقاضہ بھی
یہی تھا کہ یورپی طور طریقے اختیار کرلئے جائیں، چنانچہ سلطان عبدالمجید خان
نے فرمان گل خانہ صادر کرکے ایک نئے دور کی داغ بیل ڈالی - اس فرمان
میں مساوات کو قانون، نظم و نسق مملکت، اور عدل، سب سے پہلے جگہ دی
گئی تھی - اگرچہ یہ کار روائی اتنی ہی اندیشہ ناک اور پر خطر تھی جتنا کہ
جانثاریوں کا قلع قمع لیکن بتدریج اس کے بعد دوسری کار روائیاں بھی
کی گئیں، جن سے پرانی بنیادیں اکھڑ گئیں، اور نئی تعمیر کے لئے جگہ
پیدا ہوگئی - اسی فرمان گل خانہ کی بدولت ' شناسی ' کو اپنا اخبار " تصویر افکار "
نکالنے کا موقع ملا ' اور نامق کمال اپنا ڈراما " وطن " لکھہ سکا -
لیکن بدقسمتی سے ترکی جمہور اور حکمران طبقہ دونوں دنیا کے حالات
سے ہنوز با خبر نہ تھے ' اور بہت جلد سازشوں کا بازار ایسا گرم ہوگیا
کہ اصلاح کی ساری تجویزیں بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں - "رشید پاشا" نے ' جسے
یورپی اصلاح کا بانی مبانی کہا جا سکتا ہے ' عوام کی تعلیم کا کام شروع کیا،
لیکن اس کے صلہ میں اسے قتل کی دھمکی دی گئی ' وجہ یہ تھی کہ جو لوگ
پرانی وضع پر اڑے ہوے تھے ' انھیں رشید پاشا کے مدارس کی جدید تعلیم کی

طرف سے خوف اور بدظنی تھی - اسی نے اخبارات جاری کروائے ' جن کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ ترکی زبان جو پہلے بعید از فہم تھی ' عام فہم بن گئی - اسی نے اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کے لئے ' انجمن دانش ' قائم کی - لیکن ان اصلاحات کا رد عمل نہایت عجیب و غریب ہوا - اس پر ہر طرف سے لعن طعن ہونے لگی کہ بچوں سے جغرافیہ کے نقشے کھنچوا کر وہ انہیں تصویر کشی سکھاتا ہے ' اور اس کے رسوخ کے مٹتے ہی یہ تمام نقشے تلف کر دیے گئے - اسی طرح سے جب اس نے یہ تجویز پیش کی کہ نوجوان ترک سپاہی اعلیٰ فنون حربی کی تعلیم کے لئے یورپ روانہ کئے جائیں ' تو جو بد ترین بد معاش اور بد اخلاق آدمی مل سکتے تھے ' ان کا انتخاب کیا گیا ' اس میں مصلحت یہ تھی کہ ترکی کے ہونہار فرزند یورپ کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے نہ پائیں گے ' اور باقی رہے خود یہ لوگ ' تو یہ پہلے ہی سے اتنے خراب ہیں کہ یورپ جا کر ان کے اور زیادہ بگڑنے کا اندیشہ نہیں !

اس طرز عمل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ترکی میں آپس کی شکر رنجیوں کو دور کرنا اور جہالت کی تاریکی کو مٹانا کتنا مشکل کام تھا - اراکین نظم و نسق مملکت بھی ان جدتوں اور بدعتوں سے خائف تھے ' اور اسے اپنی ہوس پرستیوں کے حق میں پیام مرگ تصور کرتے تھے —

اس زمانہ میں ادبیات کے اوا بردار ' عاقف پاشا ' اور ' پرتو پاشا ' تھے - عاقف یورپی زبانوں سے واقف نہ تھے ' اور انہوں نے بالقصد و ارادہ ادبیات میں کوئی جدت نہیں پیدا کی - دفتری مراسلات میں تو ان کا طرز تحریر اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے بھی ترقی یافتہ نہیں کہا جا سکتا ' البتہ ان کے خانگی خطوط اور ان کے بعض بعض اشعار میں ایک خیال ایسا نظر آ جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نئی روشنی کی کرن

پڑنے والی ھے :—

" وہ اپنی تحریروں میں اپنے دل کی ترجمانی اوراپنی "

" اصلی روح کا نقشہ اتارنا چاھتے ھیں "

' پرتو پاشا ' نے ' روسو ' (Rousseau) اور ' وکٹر ھیو گو ' (Victor Hugo) کی کتابوں کے ترجمے شروع کئے ' اسی طرح ' اپنی نظموں میں انھوں نے یورپی طرز کی مخلوط بحریں استعمال کیں اور ترکی کے عامیانہ گیتوں کے بول (ہنگل) گننا شروع کئے - لیکن ان جدتوں میں سے کوئی بھی بہت زیادہ کامیاب نہیں ھوی - وہ زمانہ ان اصلاحات کے لئے ساز گار نہ تھا ' ابھی تک ایسی کوئی ہستی پیدا نہیں ھوئی تھی ' جو جمہور کو بیدار کرے اور ان میں قومی احساس پیدا کرے - ایک صدی قبل ترکی میں جو کچھہ اصلاحات ھوئیں ' وہ خود سلاطین نے اپنے تخت و تاج کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی تھیں ' مثلاً سرکاری ملازمتوں اور عہدوں میں کچھہ رد و بدل ' اور یہ پہلے بھی کئی مرتبہ کیا جا چکا تھا - لیکن وہ نئی روح جو رفتہ رفتہ رعایا کے اندر سرایت کر گئی سلاطین اور پاشاؤں کی پیدا کی ھوئی نہیں تھی ' بلکہ خود جمہور میں سے ایک شخص کی تھی ' جسے ترکی قومی ادبیات کا سب سے پہلا نمائندہ کہا جا سکتا ھے ' یعنی ' شناسی آفندی ' - ادبیات کے متعلق شروع سے ایک خاص مقصد ' شناسی ' کے پیش نظر تھا - اس کی تحریریں محض تفنن طبع کے لئے نہ ھوتی تھیں - وہ قدیم سے جدید کی طرف زینہ بہ زینہ اور درجہ بہ درجہ ترقی پسند نہیں کرتا تھا بلکہ خیال کی ایک دوسری ھی فضا پیدا کرنا اس کا مقصد تھا ' وہ انقلاب پسند تھا ' اور وھی ترکی کا سب سے پہلا معاشرتی اور تمدنی انقلابی تھا - پانچ سو برس پہلے کے قدیم ایشیائی مذھب خیالات کی جگہ وہ ایک نیا مذھب

خیالات پیدا کرنا چاہتا تھا ' اور اسے اور اس کے احباب کو جس آسانی سے اس کام میں کامیابی ہوئی ' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مسلک کتنا فرسودہ اور بے جان ہوکر رہ گیا تھا —

شناسی سنہ ۱۸۲۶ ع میں پیدا ہوا - اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ جو لوگ سرکاری ملازمتیں چاہتے تھے وہ دفتر کلم (Kalem) کے مدرسہ میں بھیج دئے جاتے اور جو لوگ کسی علمی خدمت پر جانا چاہتے وہ " مدرسہ " میں شریک ہوتے - لیکن رعایا کی بہت بڑی تعداد ناخواندہ اور جاہل رہتی - شناسی نے سرکاری ملازمت کو پسند کیا ' اور اپنے فرائض کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان بھی سیکھی - عنفوان شباب ہی میں وہ پیرس بھیج دیا گیا ' اور یہیں سے اس نے وہ یاد گار خط اپنی والدہ کے نام لکھا جس کے آخری الفاظ یہ ہیں :—

" میں ہمیشہ شریفانہ کاموں میں مشغول رہوں گا "

" اور مذہب اور ملک 'وطن اور ملت پر اپنی جان فدا کردوں گا "

شناسی ہی وہ پہلا ترک ہے ' جس نے سب سے پہلے ' اور وہ بھی صرف سترہ سال کی عمر میں " وطن " اور " ملت " کے الفاظ کو ان معنوں میں استعمال کیا - چونکہ اسے ادبیات سے خاص شغف تھا ' اس لئے اسے فرانسیسی مصنفین کی صحبت مل گئی ' اور لامارتی نے (Lamartine) ارنست رینان (Ernest Renan) اور ساسی (Sacy) کے علمی حلقہ تک اس کی رسائی ہو گئی - چند سال کی تعلیم کے بعد وہ ترکی واپس آیا ' اور یہاں پہنچ کر مصلح اعظم رشیدپاشا نے اسے " انجمن دانش " کا رکن بنادیا ' لیکن جیسے ہی رشیدپاشا کا رسوخ مٹا ' شناسی کو محض اس وجہ سے کہ وہ " داڑھی منڈا " تھا وہاں سے نکال باہر کیا گیا ! اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ پھر

پیرس واپس چلا گیا ' اور اگرچه اسے کئی خدمتیں پیش کی گئیں ' لیکن اس نے ان کے قبول کرنے سے انکار کردیا اور سنه ۱۸۷۰ ع میں ایک ترکی اخبار نکالا ' جس میں یورپی طرز اختیار کرنے پر زور دیا جاتا تھا - قدامت پرستوں نے اس کی مخالفت شروع کی ' لیکن جوان همت شناسی ' اپنے گنتی کے چند دوستوں کی رفاقت میں ' آخر تک ان کے مقابله میں پامردی سے جما رها - اس کا انتقال قبل از وقت یعنی ۴۶ سال کی عمر میں هوا ' لیکن جو بیج اس نے بویا تھا ' وہ اس کی زندگی هی میں ایک چھتنار درخت بن چکا تھا - سیاسی حیثیت سے ' وہ مشروطه خواہ تھا - ادبیات میں اس کا مسلک یه تھا که متقدمین کی فرسودہ رسمیت کو توڑ دیا جاے ' اس نے اپنے ملک کی بہت بڑی خدمت کی هے اس کی دلیری ' پا مردی ' اور اخبار نویسی کی قابلیت نے تجدد میں جتنا حصه لیا اور اس تحریک کو جتنا آگے بڑھایا ' وہ کسی اور سے نه هوسکا - لیکن اس کے اغراض و مقاصد اس قدر بلند اور شریفانه تھے که اس کی ادبی قابلیت ان کا ساتھه نه دے سکی - اسے خود بھی اس کا احساس تھا که میرا طرز کسی قدر سطحی اور خشک هے اور میرے معتقدات کی ترجمانی پوری طرح نہیں کرسکتا :-

اینجه در کرچه بو فکرم قابا دوشدی تعبیر
ایلدم صانکه موکب ایله حوری تصویر

(افسوس میرے خیالات سطحی هیں اور ان کی زبان ناقص -
گویا میں نے قلم دوات سے حور کی تصویر اتاری هے) -

لیکن ان کوتاهیوں کے باوجود ' محض شناسی کے خلوص اور صداقت کی کی وجه سے ' ایک ایسی تحریک شروع هوگئی ' جو اس کے تہذیبی اور سیاسی رجحانات کے عین مطابق تھی ' یعنی ترکی زبان کی پاکی اور صفائی -

اسلام کی همہ گیری ' اور عجمی اور عربی تہذیب کی مقبولیت کا نتیجہ یہ هوا تھا کہ ترکی زبان ایک کار آمد مخلوط زبان بن کر رہ گئی تھی ' جو ' اگر سنجیدگی اور اعتدال کے ساتھہ استعمال کی جاتی ' تو یقیناً شان و شوکت کے اعتبار سے ' دنیا کی تمام زبانوں کی ' خواہ زندہ هوں یا مردہ ' همسری کرسکتی تھی ' لیکن اگر بے احتیاطی سے استعمال کی جاتی — اور بدقسمتی سے اکثر یہی هوتا تھا — تو اس کی حیثیت محض ایک بے معنی طومار لفظی کی سی هوجاتی تھی - شناسی نے اپنے اخبار میں جس ٹھیٹ طرز تحریر کی ابتدا کی تھی ' اس کے متبعین اس کو نہ پہنچ سکے - شایستہ اور شستہ زبان لکھنے کے لئے عربی اور فارسی الفاظ کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا ' اور شناسی کی تحریر سے بلند پایہ تحریروں میں ان کا استعمال ناگزیر تھا - اس کے شاگرد اور متبعین مثلاً نامق کمال ' اکرم اور عبدالحق حامد جن میں صحافت نگاری کی بجاے ' شاعری کا رجحان غالب تھا ' زبان کے بارے میں اتنا ٹھیٹ مذاق نہ رکھتے تھے ' جتنا شناسی —

شناسی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ھے کہ اس نے ایک ترکی اخبار " ترجمان احوال " نکالا - چونکہ ٹھیٹ ترکی کے استعمال کا اسے خاص طور پر شوق تھا ' اس لئے اس نے ایک صرف و نحو کی کتاب اور ایک ترکی لغت بھی مرتب کی - چونکہ طبیعت ایجاد پسند تھی ' اس لئے اس نے ایک طنزیہ ناٹک " شاعر کی شادی " بھی تصنیف کیا ' جس میں ترکی کی شادی کی رسموں کا خاکہ اڑایا گیا تھا —

ترکوں میں جو سیاسی بے چینی اور هیجان پیدا هوگیا تھا ' اس کا رنگ ان کی ادبیات پر بھی بہت گہرا چڑھا ھے - ان کی تصنیفات میں وطنی اور ادبی دونوں رنگوں کی ایک عجیب و غریب ملی هوی جھلک نظر آتی

ہے - وہ ترکی ادب، جو متقدمین کے زمانہ میں روز مرہ کی جیتی جاگتی چیزوں سے بالکل بے تعلق اور بے نیاز رہتا تھا، وہی اب جمہور کے جذبات کا ترجمان بن گیا - ضیا پاشا، جو اسی زمانے کا شاعر ہے، اور جس کے اشعار سب سے زیادہ نقل کئے جاتے ہیں، نوجوان ترکوں کی اس خفیہ جماعت کا رکن تھا، جو طرز حکومت کا انقلاب چاہتی تھی، اور جس نے آخر میں چل کر عبدالعزیز کو معزول کردیا تھا - پہلے وہ کئی سرکاری ملازمتوں پر، مثلاً والی صوبہ، منشی‌السلطان وغیرہ رہ چکا تھا - اس کے بعد وہ بھاگ کر یورپ چلا گیا، اور جب واپس آیا، تو مورد عتاب سلطانی بنا اور کسی صوبہ کے شہر میں نہایت کس مپرسی کی حالت میں اس کا انتقال ہوا - اس پر اس قدر مظالم کئے گئے تھے کہ جب وہ مرا ہے تو کسی شاعر کی اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ تاریخ وفات لکھ کر اس کی قبر پر کندہ کراتا - اس کے ادبی مشاغل بکثرت تھے - اس نے فرانسیسی زبان سے کتابیں ترجمہ کیں اور دوسروں کے ترجموں کی عبارت کو مثلاً " تاریخ اندلس " پر شکوہ بنایا، لیکن اس کا اصلی کمال اس کے مقالات سے ظاہر ہوتا ہے، جو اس کی دور اندیشی اور فراست کے ثبوت ہیں - ان مقالات میں اس نے بہت جرأت کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ فارسی عروض ترکی زبان کے لئے موزوں نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے عروض کی بجائے بول (پنگل) گننا زیادہ مناسب ہے - ترکوں کی حقیقی روح نے اپنے آپ کو جن مصنوعی اور خود ساختہ زنجیروں میں مقید کرلیا تھا، ان کے خلاف وہ علم بغاوت بلند کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کا "ترکیب بند"، جو روحی بغدادی کے تصوفانہ ترکیب بند کے جواب میں لکھا گیا، اور وہ ہجو جو اس نے اپنے سیاسی دشمن علی پاشا پر لکھی یہ دونوں فارسی بحروں ہی میں ہیں، اور کہیں کہیں تو اتنی ہی بعید از فہم ہیں، جتنی اس کے پیش روؤں

کی نظمیں - اس کے اشعار آج تک ترکوں کی زبان پر ہیں' اور ان میں سے اکثر تو ضرب المثل بن گئے ہیں —

جس طرح افق مشرق پر ایک کرہ آتشین نمودار ہوتا اور اپنی جگمگاہٹ سے دنیا میں اجالا کردیتا ہے' اسی طرح اب ایک نیا شاعر اور مصنف عرصہ شہود پر جلوہ افگن ہوا' یعنی نامق کمال - اصل میں ترکی ادبیات کا دور جدید اسی سے شروع ہوتا ہے - اگرچہ وہ شناسی کا شاگرد تھا' لیکن ادبی اصلاح کے خیالات کو اس نے انتہائی حد تک پہنچادیا - اس کی ادبی زندگی کا تعلق' بہ نسبت کسی دوسرے شعبہ کے' سیاسیات سے بہت زیادہ تھا - اس کی بے چین اور سیمابی طبیعت نے جمہور کے دل اور تخیل کو مسخر کرلیا' اور اس نے اپنی فصاحت اور شیوہ بیانی سے عظمت رفتہ کو ایک اس سے بھی زیادہ با عظمت و پر شوکت مستقبل کا پیش خیمہ بنا کر پیش کیا - کمال ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا تھا' جس کے اکثر افراد ترکی کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں - عنفوان شباب میں اس نے ایک سرے سے لے کردوسرے سرےتک ترکی سلطنت کی سیاحت کی تھی' غربت اور فلاکت ' نا انصافیوں اور بے عنوانیوں کے جو مناظر اس کے سامنے آے تھے ' انہوں نے اس کے دل پر بہت گہرا اثر کیا تھا اور ملت کے لئے لڑنے کے عزم کو راسخ کر دیا تھا - وہ کم سنی ہی سے شعر کہنے لگا تھا ' اور قدیمی مرصع طرز کی غزلیں ' قصائد وغیرہ لکھتا تھا ' لیکن ان ابتدائی زمانہ کے اشعار میں بھی کہیں کہیں وطن پرستی کے رنگ کی جھلک نظر آ جاتی ہے - اس نے فرانسیسی کا مطالعہ شروع کیا اور اپنے دیوان کے آخری صفحہ پر بہت ہاتھ روک روک کر اور سنبھل سنبھل کر' اس نے بعض فرانسیسی مصنفین کے نام لکھے - یورپ نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے

غزلیں لکھنا چھوڑ دیا، وہ نوجوان ترکوں کی جماعت میں شریک ہو گیا۔ سلطان عبدالعزیز کی حکومت نے اسے گورنر کا سکریٹری مقرر کر دیا، لیکن وہ یورپ بھاگ گیا۔ لندن پہنچ کر، اس نے ضیا پاشاء کی شرکت میں اخبار "حریت" نکالا، اور چار برس تک وہاں رہا۔ جب ترکی میں عام معافی کا اعلان ہو گیا، تو وہ واپس آیا، اور قیام یورپ کی بدولت جو اضافہ معلومات اسے ہوا تھا، اس سے کام لے کر پہلے سے بھی زیادہ جوش کے ساتھ وطنی خدمت میں مشغول ہو گیا۔ لیکن اس عرصہ میں ترکی کا سیاسی مطلع مکدر ہو چکا تھا، اور ترقی خواہ نوجوان ترکوں نے، جو مشروطہ کے لئے جدو جہد کر رہے تھے، بہت جلد تاڑ لیا کہ سیاسی مطلع کی یہ گھنگور گھٹا اب برسنے ہی والی ہے۔ جذبہ آزادی نے جو ایک شریفانہ اور ہمدردانہ جذبہ ہونے کی حیثیت سے ہر شخص کو مرغوب ہوتا ہے، ترکی میں بسنے والی تمام قومیتوں، مثلاً رومانوی، سربی، بلغاری وغیرہ، غرض سب کے دلوں میں ایک سی امنگیں پیدا کر دی تھیں۔ سلطنت ترکی کی بدنظمی کا اثر ان سب پر یکساں پڑا تھا، لیکن جو رعایا مختلف المذھب اور مختلف النسل تھی، اس نے (مسلمان ترکوں کے مقابلہ میں) مظالم کو کہیں زیادہ محسوس کیا۔ علاوہ بریں ان غیر ملکی عناصر کو یورپ کی مسیحی دول پر بھی بھروسہ تھا، جن کی حکمت عملی، اگرچہ وہ نہایت کوتہ اندیشانہ تھی، یہی تھی کہ ترکی کے حصے بخرے کر دئے جائیں۔ سنہ ۱۸۷۶ ع میں سربیوں نے اعلان جنگ کر دیا، اور بلغاریوں نے بھی علم بغاوت بلند کر دیا۔ الگزینڈر بات چیف (Alexander Bothcheff) نے، جو ایک بلغاری وطن پرست اور شاعر تھا بمقام سلسترا (Sillistra) شاہ دانہ کی لکڑی سے بنی ہوئی بندوق سے پہلی گولی ترکی فوجوں پر چلائی۔

اصل میں بلغاریہ اور ترکی دونوں جگہوں کے شاعروں کے دلوں میں ایک ہی سا احساس تھا ' یعنی آزادی اور قومی احساس کی بے روک ٹوک ترقی ' لیکن سیاسی مدبرین اب تک اسی خواب خرگوش میں تھے کہ گرفتاریوں کے خوف اور آہستہ آہستہ اور جرعہ جرعہ اصلاحات دینے سے قومیت کی یہ رو تھم جائے گی —

کمال نے ایک ناٹک ' سلستر یا خود وطن ' (سلستر ' یعنی وطن) کے عنوان سے لکھا ' اور جب یہ قسطنطنیہ میں دکھایا گیا ؛ تو غیر معمولی طور پر مقبول ہوا - حاضرین پر اس کے طرز بیان اور سوز و گداز کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ بے اختیار ہو کر ' زندہ باد وطن ' " زندہ باد ملت " کے نعرے لگانے لگے - کمال کو دوسرے دن ہی گرفتار کرکے ' قبرس ' (Cyprus) پہنچا دیا گیا ' اور اس بطل جمہور ' اور پہلے ترکی ڈراما کے مصنف کی یہ قدر کی گئی کہ اسے ایک تیرہ و تار اور مرطوب کوٹھری میں ڈال دیا گیا ' جہاں سے اس کی رہائی اس وقت ہوئی جب عبدالعزیز معزول کیا گیا - جدید سلطان ' یعنی سلطان مراد اور اس کے بعد سلطان عبدالحمید یہ دونوں ترقی خواہ جماعت پر نظر عنایت رکھتے تھے ' لیکن بہت جلد جنگ روس کی بد بلا ترکی پر مسلط ہونے والی تھی ' عبدالحمید نے جو پارلیمنٹ بنائی وہ ترکوں کی آرزوؤں اور خواہشوں کے عین مطابق تھی - اب مستقبل کا راستہ صاف تھا اور ملک میں آزادی کا دور دورہ ہونے والا تھا ' لیکن جوشیلے شعراء اور مصنفین نے حقیقت کو نہیں دیکھا ' وہ دوسری ہی سلطنت کے خواب دیکھہ رہے تھے - ترقی خواہ ترکوں کا بہادر قائد ' یعنی نامق کمال خود آج کل کے معنوں میں قوم خواہ نہ تھا ' بلکہ ایک عثمانی وطن پرست تھا - وطن کے متعلق اس کا تصور یہ تھا کہ مسلمان ترکوں کی سلطنت قائم ہو '

پچھلے زمانہ میں جس طرح راہ اسلام میں جانبازی کی بدولت اسلام کو عروج نصیب ہوا تھا ' وہ انھیں مستقبل کے متعلق بھی ہمت دلا تا تھا - بالفاظ دیگر ترکی قوم پرستی کا منشاء و مدعا یہ تھا کہ انیسویں صدی کے یورپ کے اسلحہ اور طریقوں سے کام لے کر اسلام کا احیاء کیا جاے - نامق کمال کا طرز تحریر تھیٹ نہیں بلکہ کسی قدر مغلق تھا اس کی نثر کی کتابیں مثلاً جزمی ' ناولیں اور قصے مثلاً بارکۂ ظفر' قانچی' اس کے ڈرامے مثلاً " وطن " زاولی چوجق (غریب بچہ) ان سب میں کسی قدر لفا ظی نظر آتی ھے - سخن آرائی اب تک معنی آفریدی پر غا لب ھے ' اس کے قصو ں کے افراد اسی کی سی رنگین اور مرصع زبان بولتے ھیں اور ان کی سیرتوں میں جو رقت پسندی نظر آتی ھے وہ بھی کچھہ ایسی زیادہ مرغوب اور پسندیدہ نہیں - لیکن چاھے ھم یہ نہ ما نیں کہ کما ل فن کا بادشاہ تھا ' تاھم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ میدان عمل کا دھنی تھا ' اور اس کی ذات ھر تر کی محب وطن اور پر جوش انقلابی کے لئے نمونہ بن سکتی ھے - اس کی ادبی کوتاھیوں کے باوجود ' ترکوں کے دلوں میں کما ل کی جگہ بحیثیت ایک بلند پایہ اور بہترین مصنف کے ھمیشہ باقی رھے گی ' اس لئے کہ جس روح نے تر کی کو گرما دیا ' وہ کمال ھی کی پیدا کی ھوئی تھی —

کمال کے شاگردوں اور ثناخوانوں کا حلقہ بہت وسیع تھا - انھی میں سے ' اس کا مخلص دوست اور شاگرد رجائی زادہ اکرم بھی تھا ' جو ادبیات کا پروفیسر اور باب حکو مت کا ر کن تھا - اگر چہ و ہ ھمیشہ سلطنت کا وفادار رھا ' لیکن پو لیس کی بدظنی سے وہ بھی نہ محفوظ رہ سکا ' اور اسے اپنے تمام ادبی لکچروں کو محکمہ سیاسیات کو دکھانا پڑ تا تھا - اکرم ایک پر گو شاعر بھی تھا ' اس کی شاعری کا رنگ عاشقانہ تھا اور چونکہ

اس میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اس لئے اس کے اشعار زیادہ تر زندگی کے تاریک پہلوؤں کے متعلق ہوتے تھے - اس کے ہم عصر اسے موجد اور اعلی درجہ کا ذہین شخص سمجھتے ہیں، اور اس حیثیت سے وہ بے شک موجد کہے جانے کا مستحق ہے کہ فرانسیسی ادبیات کے اثر سے، اس نے متقدمین کے راستہ سے ہٹ کر شاعری کے لئے نئے نئے موضوعوں کا انتخاب کیا اور قدیم لفاظی اور صنعت بازی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کی، لیکن اس میں وہ اکثر نا کام بھی رہا - باقی رہی اس کی ذہانت اور ذکاوت، تو اس کے ماننے میں ایک خارجی نقاد کو کسی قدر کلام ہوگا، اس لئے کہ دوسرے شعر گویوں کے مقابلہ میں اس میں کوئی خاص ابداع یا اختراع، تخلیقی قوت، یا خیالات کی کوئی غیر معمولی خوبصورتی نظر نہیں آتی - اس کی زبان بھی ہمیشہ بے عیب اور اعتراض سے خالی نہیں ہے اور اس کے حریف معلم ناجی نے اس پر جو سخت تنقیدیں کی ہیں، وہ اکثر و بیشتر حق بجانب ہیں —

نوجوان ترکوں میں جو جذبہ وطن پرستی پیدا ہو گیا تھا، اس کا ایک اور با کمال ترجمان عبدالحق حامد ہے، وہ نامق کمال کا دوست اور شاگرد تھا، لیکن بہت جلد اپنے استاد پر چھا گیا، اور مشرق کے مشہور ترین مصنفین میں اس کا شمار ہونے لگا - وہ سنہ ۱۸۵۱ ع میں ایک شریف اور علمی مذاق رکھنے والے خاندان میں پیدا ہوا، اور اسے دنیا دیکھنے اور مشرق اور مغرب دونوں کی زبانوں اور ادبیات کی گہری واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا - اس نے بمبئی، میدرد، لندن غرض کہ یورپ اور ایشیا کے مختلف شہروں میں ترکی سفارت خانوں میں ملازمت کی، علوم مشرقیہ کے متعلق تو اس کی نظر پہلے ہی سے بہت گہری تھی، اب اس کے ساتھ

ساتھہ ' اس نے فرانس کے رومانی (Romantic) اور انگلستان کے شیکسپیری مذاہب ادبیات کا اثر بھی قبول کیا - وہی سب سے پہلا ترکی مصنف ہے ' جس نے بحیثیت شاعر ' نثار اور تمثیل نگار کے ' نو مشقوں کی سطح سے بلند ہوکر ' ترکی زبان کو ادبی خیالات کے اظہار کا ایک اعلیٰ درجہ کا وسیلہ بنادیا - عبدالحق حامد کی زبان میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں آورد اور تصنع کا کہیں نام نہیں ' اور لغت بازی اور تلاش لفظی کا اس میں شائبہ بھی نہیں پایا جاتا - اس کے الفاظ میں اس کے خیالات کی سی روانی پائی جاتی ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ محض زبان لکھنے کے شوق میں لفظ لکھے گئے ہوں —

عبدالحق حامد کا ادبی رنگ یہ ہے کہ وہ اپنے موضوعوں کے انتخاب میں رومانیت اور ان کے بیان کرنے میں حقیقت نگاری سے کام لیتا ہے' اس نے اپنے موضوعوں کو یا تو تاریخ مشرق سے لیا ہے تاکہ وہ انسانی قوتیں جو تاریخ کی تہ کے نیچے کام کرتی ہیں جیتی جاگتی بن کر قارئین کی نظروں کے سامنے آجائیں ' یا پھر حقیقی زندگی کے واقعات کو موضوع بنایا ہے ' تاکہ خاص خاص قسم کی عورتوں اور مردوں کی زندگیاں ' اور ان کے جذبات اور آلام کے نقشے پڑھنے والوں کی آنکھوں کے آگے آجائیں - بحیثیت تمثیل نگار (ترامانست) کے وہ اپنے ہم ملکوں میں پیش پیش ہے ' اور اگرچہ اس کے ترامے ہمیشہ کتابی شکل ہی میں رہیں گے ' کیونکہ اپنی پیچیدہ فنی حیثیت کی وجہ سے وہ اسٹیج پر دکھائے جانے کے لئے موزوں نہیں ہیں ' لیکن ان میں جو کھرے انسانی جذبات اور بلند پایہ اسلوب تحریر پایا جاتا ہے ' اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ ترکی ادبیات میں زندۂ جاوید رہیں گے - اس کی ذہانت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ باوجود اس کے کہ پہلے سے ترکی اسٹیج پر کوئی

نمونہ اس کے سامنے نہ تھا، تاہم محض غیر ملکی اثرات کے ماتحت اس نے ایسے ایسے ڈرامے لکھے، اور اپنے قصوں کے افراد کے ایسے ایسے نفسیاتی چربے اتارے جو بہترین یورپی نمونوں سے ٹکر کھاتے ھیں - اس کی تصنیفات تیس کے قریب ھیں - اس کے بعض ڈرامے نثر اور نظم دونوں میں ھیں، بعض محض نثر میں ھیں، اور بعض شروع سے آخر تک منظوم - لیکن ان منظوم ڈراموں میں اس نے فارسی عروض استعمال نہیں کی ھے بلکہ قدیم ترکی طریقہ یعنی پنگل (بول) گننے کا استعمال کیا ھے، اور اسی کے تقاضہ سے اس کی زبان زیادہ ٹھیٹ اور اس کا طرز تحریر سلیس تر ہو گیا ھے —

عبدالحق حامد کے بعض ڈراموں کے قصے ھندوستان سے لئے گئے ھیں - عنفوان شباب ھی میں، جب وہ ھندوستان آیا بھی نہ تھا، اس نے ایک ڈراما " دختر ھندو " لکھا تھا، جس میں ایک انگریز افسر اور ایک ھندوستانی لڑکی کے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ھے - انگریز افسر ھندوستان میں جس بے فکری اور عیش کی زندگی گزارتے ھیں، یہ قصہ اس کی ھو بہو نفسیاتی تصویر ھے - ھندوستانیوں اور انگریزوں کی معاشرت میں جو اختلافات پائے جاتے ھیں اس کے متعلق بھی ھمیں اس قصہ کو پڑھ کر بصیرت حاصل ھوتی ھے، اور آج سے پچاس سال پیشتر ھی، ھمیں (اس ڈرامے میں) جمہور ھندوستان کو آزاد کرنے کے متعلق ایک موثر اپیل نظر آتی ھے —

بمبئی کے قنصل خانہ کے قیام کی وجہ سے اسے ھندوستان کی معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا - وہ اسے " سبز و شاداب ملک " کہتا ھے " جس کے پرندے انسانی زبان میں باتیں کرتے ھیں " - اس گہری واقفیت ھی کی بنا پر اس نے سنہ ۱۸۸۶ ع میں، جب وہ لندن میں تھا، اپنا مقبول عام

ڈراما " فن ڈن " (Fin ten) لکھا - اور سب ڈراموں سے زیادہ اس کے اسی ڈرامے میں ہمیں جزئی سے جزئی باتوں میں خاص اہتمام نظر آتا ہے ' اور اس کے فنی نقوش اور نفس قصہ دونوں میں شیکسپیر کا اثر خاص طور پر نمایاں ہے - اس موقع پر اگر ہم اس ڈرامے کی تلخیص ناظرین کے سامنے پیش کریں تو شاید کچھ ایسا بے محل نہ ہوگا :-

مسز کراس (Mrs. Cross) ' جو " فن ڈن " کی ہیروئن ہے ' ایک حسین عورت ہے ' جس کی شادی آسٹریلیا کے ایک متمول شخص سے ہوئی ہے ' جو سونے کی کانوں کا مالک ہے - یہ عورت لندن میں مقیم ہے ' اور نظر بازیوں اور عشوہ طرازیوں میں اپنا وقت گزار رہی ہے - یہاں ایک لارڈ اس کے دام عشق کا اسیر ہوجاتا ہے ' مسز کراس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے ؛ جسے اپنا لڑکا سمجھ کر یہ لارڈ مسز کراس سے شادی کرنا چاہتا ہے - لیکن اس میں کئی دقتیں ہیں ' جنھیں دور کرنے کے لئے حوصلہ مند مسز کراس (فن ڈن) ایک نہایت جسارت آمیز ترکیب سوچتی ہے - پہلے اسے ایک مدقوقہ لڑکی کی تلاش ہے ' جس کی شادی لارڈ سے کردی جائے ' اور اپنے ناجائز اور کاودی لڑکے کو اس لڑکی کی جائز اولاد بنا دیا جائے - اس کے بعد وہ یہ چاہتی ہے کہ اپنے وفادار نوکر کے ہاتھوں اپنے شوہر کو مروا ڈالے - اپنے طبیب خاص کی مدد سے اسے مدقوقہ لڑکی تو ایک اسپتال سے مل جاتی ہے ' لیکن اس کا وفادار نوکر دولاجی راو ' جو ہندوستانی ہے ' راضی نہیں ہوتا ہے ' وہ اپنی مالکہ کا ہر حکم بجالانے کے لئے تیار ہے ' وہ اس کے لئے تیار ہے کہ جنگل میں جاکر شیرنی کے پنجے سے اس کے دودھ پیتے بچے اٹھالاے ' لیکن اپنے بوڑھے مالک ' مسٹر کراس ' کو مارنے کے لئے وہ آمادہ نہیں ہوتا - بہت کچھ

بحث مباحثہ کے بعد ' جس میں 'فن تن' 'دولاجی راو' کی محبت کا دم بھرتی ہے ' اور جس سے برسبیل تذکرہ یہ راز بھی آشکار ہوتا ہے کہ وہ نا جائز لڑکا دراصل اس نوکر کے عشق ہی کا نتیجہ ہے ' بالآخر نوکر نمک حرامی پر راضی ہوتا اور آسٹریلیا کی طرف روانہ ہوجاتا ہے -

لیکن یہاں سے پیچیدگیاں پڑنا شروع ہوتی ہیں - مدقوقہ لڑکی ' (جسے اسیٹج پر لاتے وقت شاعر نے گریز کرکے بیماروں ، ان کے آلام اور ان کی موت کے متعلق لمبے چوڑے اشعار لکھے ہیں) لارڈ سے محبت کرنے لگتی ہے ' اور اپنی مہلک بیماری سے اچھی ہو کر اس کے ساتھ 'بیروت' بھاگ جاتی ہے ' 'فن تن' آتش رقابت سے جل کر ان کا پیچھا کرتی ہے - لیکن اب وہ لارڈ دل و جان سے اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے جو پہلے مدقوقہ تھی ' اور وہ 'فن تن' کو منہ بھی نہیں لگاتا - اس کے بعد سمندر پر ایک طوفان خیز رات کا منظر پیش کیا گیا ہے ' 'فن تن' ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار ہو کر لارڈ کے تعاقب میں جاتی ہے اور قریب ہے کہ طوفان میں ہلاک ہوجائے ' لیکن دولاجی راؤ جو آسٹریلیا سے اپنے مالک کو قتل کرکے واپس آرہا ہے ' اس کی چیخیں سنتا ہے ' اور اسے بچا کر اپنے جہاز پر لے آتا ہے ' جس پر خود اس کی معشوقہ جو ایک کسان کی لڑکی ہے ' اس کے ساتھ سفر کررہی ہے - یہاں پھر کسان کی لڑکی اور فن تن کے درمیان رقابت کا منظر پیش آتا ہے اور دولاجی راؤ اس لڑکی کو قتل کرڈالتا ہے ' اور فن تن کو گود میں لیکر جہاز سے کود پڑتا ہے اور تیر کر صحیح و سلامت کنارے پر پہونچ جاتا ہے - اب یہ دونوں لندن میں زندگی بسر کرتے ہیں - فن تن لارڈ کو بھول جاتی ہے ' لیکن اپنے لڑکے کو واپس پانے کی غرض سے ' اسے مطلع کرتی ہے کہ اس

کا اصلی باپ دولاجی راؤ ہے - یہ دونوں شادی شدہ زندگی بسر کرتے ہیں ' لیکن دونوں میں سے کسی کو بھی اطمینان نصیب نہیں ہے - دولاجی راؤ قید ہو جاتا ہے ' اس کو وہاں سے چھڑانے کے لئے فن تن کئی روز گھر سے باہر رہتی ہے ' اور بالآخر اسے رہا کرا لاتی ہے ' لیکن دولاجی راؤ فن تن کی طرف سے بدظن ہو جاتا ہے اور غصہ میں آکر اپنے لڑکے کو مار ڈالتا ہے ' فن تن محبت مادری سے بے تاب ہو کر دولاجی راؤ کو گولی سے ہلاک کر دیتی ہے —

سیاہ فام دولاجی راؤ کی رقابت ہمیں آتھیلو کی رقابت یاد دلاتی ہے ' لیکن ڈرامے میں کچھہ ایسے فنی نقائص پائے جاتے ہیں کہ ہم ان دونوں (آتھیلو اور دولاجی راؤ) کا محض سطحی طور پر ہی مقابلہ اور موازنہ کرسکتے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈرامے کو مصنف نے بہت کچھہ محنت اور کاوش سے لکھا ہے ' لیکن اس کے بعض بعض اشعار میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے - ایک اور ڈراما ' جس کا قصہ تاریخ ہندوستان سے لیا گیا ہے ' ' اشبر ' ہے - اس کے لکھتے وقت ترکی مصنف کے سامنے کارنیلی کا ' جو رومانی طرز کا جید فرانسیسی استاد تھا ' قصہ ہوریس (Horace) بطور نمونہ کے تھا - اشبر کشمیر کا بادشاہ ہے - فاتح عالم سکندر رومی اس کی حسین بہن پر عاشق ہو جاتا ہے - یہ لڑکی جس کا نام ' سورو ' ہے اس خیال سے کہ اس کے بھائی اور سکندر میں جدال و قتال کی نوبت نہ آنے پائے ' معاملہ کو رفع دفع کرنے اور سمجھوتا کرانے کی کوشش کرتی ہے ' لیکن مغرور بادشاہ اس پر راضی نہیں ہوتا اور اپنی بہن کے قتل کا حکم دے دیتا ہے - اس اثنا میں سکندر ملک پنجاب کی طرف پیش قدمی کرتا ہے رکزن (Rokzan) دارا کی بیٹی ' جو خود سکندر پر عاشق ہے

اس کی کوشش کرتی ہے کہ وہ اپنی معشوقہ سمرو سے نہ ملنے پاے ' لیکن سکندر اسے ہاتھی کے قدموں کے نیچے روندواکر مار ڈالتا ہے ' اور بہادر اشبر کو شکست دیتا ہے ' جو شرم کے مارے خود تلوار مار کر مر جاتا ہے۔ اس کشت و خون کے دوران میں ارسطو بھی اسٹیج پر آتا ہے اور اس طنزیہ جملہ سے ڈرامے کو ختم کرتا ہے " اسی کا نام فتح ہے ! " —

اگر چہ اس ڈرامے کی فضا مصنوعی ہے ' جسے تاریخی ڈراما لکھنے والے فرانسیسی رومان نویسوں کا ورثہ سمجھنا چاہئے ' تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں تمثیلی توازن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے —

عبدالحق حامد کا ایک اور ڈراما بھی ہے ' جو کارنیلی (Corneille) کے " ای سد " (Le Cid) کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں مصنف نے پہلی مرتبہ پنگل کی بحروں کو استعمال کیا ہے ' لیکن چونکہ اسے اسٹیج کی زبان کا لحاظ بھی رکھنا پڑا ہے ' اس لئے اس کی موسیقیت جا بجا کسی قدر اکھڑی اکھڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس ڈرامے کا نام " نسترن " ہے۔ قصہ کا منظر کابل میں ہے اور اس میں تخت و تاج کے ایک جھوٹے مدعی کی ' اپنے باپ کے خلاف سازشوں کو دکھایا گیا ہے۔ قصہ میں جان ڈالنے کے لئے رومانی عشق و محبت کی چاشنی دی گئی ہے —

ایک اور رومانی ڈراما ' " زینب " ہے ' جس میں مافوق البشری قوتوں کی تاثیرات اور الہامات سے بحث کی گئی ہے۔ اس کا ماحول بھی مشرقی ' یعنی ہندوستانی اور افغانی ہے۔ اس کا کچھ حصہ منظوم ہے ، اور کچھ نثر میں ' نثر کا حصہ نسبتاً زیادہ بر جستہ اور جاندار معلوم ہوتا ہے—

اب ہم اس پرنویس مصنف کے بقیہ ڈراموں کے صرف عنوانات ہی

بتانے پر اکتفا کرتے ھیں - اس کی پرنویسی کا اندازہ اس سے ھو سکتا ھے کہ جب اس کی غیر معمولی طبیعت حاضر ھوتی اور آمد شروع ھوتی تو وہ ایک ایک دن میں ڈیڑہ سو شعر کہہ دیا کرتا تھا :—

' سر دنپل " آشوری زمانے کا ایک تاریخی ناٹک ھے طارق ' ابن موسیٰ ' طزر اور عبدالله الصیغر ' ان سب کے قصے عربی اندلس سے لئے گئے ھیں ' لبرتی ' یہ ایک مثالیہ قصہ ھے ' جس میں عبدالحمید کی استبدادی حکومت پر چوٹیں کی گئی ھیں : الخان اور ترخان ان میں مصنف نے تورانی ترکوں کی سابقہ عظمت کے گیت گائے ھیں - ان دونوں ڈراموں کو گویا اس تحریک " توران خواھی " کی منادی سمجھنا چاھئے ' جو بعد میں چل کر ظاھر ھوئی —

عبدالحق حامد صرف ایک پر زور تمثیل نگار ھی نہ تھا' بلکہ بیاینہ شاعری پر بھی اسے اعلیٰ درجہ کی قدرت حاصل تھی - اپنی نظم صحرا و بلدہ میں اس نے اس عشق کا اظہار کیا ھے جو اسے سبزہ زاروں ' مرغزاروں ' دھیمی ھوا میں ھلنے والے درختوں اور ان کی تر نم ریزیوں کے ساتھہ تھا - ان چیزوں کو وہ خالص الہامات سمجھتا ھے اور ان کے مقابلے میں شہروں کے تصنعات اور زر پرستیوں کو نام دھرتا ھے - حامد سے پہلے کسی ترکی شاعر نے نہ تو دیہات کی فضا کا اتنا گہرا اثر اپنے قلب پر لیا تھا ' اور نہ اس زور اور قدرت کلام کے ساتھہ اسے بیان کیا تھا - اد بیات کی یہ صنف خالص مغربی الاصل ھے ' اور اسی کی خاطر حامد نے مشرقی عروض کو چھوڑ کر ' فرانسیسی طرز کے مخلوط قوافی استعمال کئے ھیں - حامد کا اس طرح لوچ کے ساتھہ دیہاتی فضاؤں کی تصویریں اُتارنا خاص کر اس وجہ سے اور زیادہ قابل توجہ ھے کہ وہ شہروں کی زندگی '

ان کے شور شغب اور ان کی دلچسپیوں کا بہت شوقین تھا چنانچہ اپنی نظموں کے ایک مجموعہ " دیوانهلی کلمیرم " (میرا جنون شباب) میں اس نے انھی چیزوں کو بیان کیا ہے —

اس نے ایک منظوم قصہ " غرام " (جذبہ عشق) بھی لکھا ہے ' جس میں مذہب ' تصوف ' فنا وغیرہ کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں —

اپنی پہلی بیوی کی وفات کا ' جو بیروت میں واقع ہوئی تھی ' حامد پر اتنا اثر ہوا ' کہ وہ خود کشی کرنا چاہتا تھا ' اور اس کے اعزا و اقربا کو کامل چالیس دن تک اس کی نگرانی اور دیکھہ بھال کرنی پڑی - اس زمانہ میں اس نے مقبرہ کے عنوان سے اپنی بیوی کا ایک نہایت پر اثر اور دل ہلا دینے والا مرثیہ لکھا ' جو اس وجہ سے کہ اس میں رقت اور سوز و گداز کا عنصر بہت افراط سے تھا ' اُس زمانہ میں تو مقبول نہ ہو سکا ' لیکن اب اس نے ترکی ادبیات میں اپنی ایک مخصوص اور معزز جگہ پیدا کر لی ہے —

ترکی ادبیات کی تاریخ میں ایک اور نمایاں ہستی جو خاص کر ترکی ناول نویسی کے سلسلہ میں قابل ذکر ہے " سزائی بے " کی ہے - انھوں نے اپنی کتابوں ' ' کوچک شے لر ' (چھوٹی چھوٹی چیزیں) اور ' سر گزشت ' میں سب سے پہلی مرتبہ ایسے قصے لکھے جو بڑی بڑی حرم سراؤں اور ان کی کنیزوں کے حالات پر مبنی تھے - اگرچہ مصنف نے مشرقی زندگی کے اس رنگین رخ پر سخت سخت تنقیدیں کی ہیں ' تاہم ان کی قوت بیان بہت زبردست ہے ' اور ان افسانوں کے مختلف اجزا کے درمیان کمال کا تسلسل پایا جاتا ہے - یہ ایک عیب اس میں بے شک ہے کہ لمبے چوڑے جملے لکھہ کر عبارت کو خراب کر دیا گیا ہے - یہ ناول تمثیلی نہیں ہے -

اور اس اعتبار سے پرانی شاہراہ سے الگ ہے بر خلاف اس کے یہ حقیقت پر مبنی ہے ' اور اس میں مصنف نے مشرقی زندگی کے متعلق ایک نیا تصور قائم کرکے جدت کا ثبوت دیا ہے ۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادبیات کی یہ نئی روح پرانی روح کو ایک دفعہ ہی مٹا نہیں سکی ۔ جس طرح اب تک ہم نے مشرق کو مغرب سے ملانے والی ادبی کڑیوں کو (خصوصاً صنف نظم میں) دیکھا ہے ' اسی طرح ہم کو ' ینی شہرلی اونی ' ' ہر سک لی عارف حکمت ' اور ' لس کات‌چلی غالب بے ' کے ناموں کو بھی نہ بھولنا چاہئیے ' ان لوگوں نے اپنا ایک مخصوص ادبی حلقہ قائم کرلیا تھا اور ترکی شاعری کی پرانی روایات پر ثابت قدم تھے ۔ رجعت پسند طبقہ کا نمایندہ معلم ناجی تھا جس نے اپنے ادبی مشاغل کے ابتدائی دور میں نئے مذہب شاعری کے بے تکے پن ' خصوصاً اکرم اور عبدالحق حامد پر سختی سے تنقیدیں کیں - لیکن دوسرے دور میں ' جب وہ فرانسیسی زبان سیکھہ چکا ' تو ان ادبی بدعتوں کے متعلق اس کا رویہ کسی قدر نرم ہو گیا ' اور خود اس نے کئی اعلیٰ درجہ کی نثر کی تحریریں ' ٹھیٹ ترکی زبان میں اور اعلیٰ درجہ کی فصاحت کے ساتھہ لکھیں ترکی زبان کی صفائی ' اور صرف ٹھیٹ زبان لکھنے کے متعلق اس کی راے اس کے اس جملے سے معلوم ہوتی ہے :—

' اگرچہ ترکی زبان میں عربی و فارسی کے بے شمار '

' الفاظ ہیں ' لیکن ان کو صرف ایسے اجزا '

' سمجھنا چاہئیے جنھیں ترکی اپنے مخصوص '

' معنوں اور اپنے مخصوص تلفظ کے ساتھہ استعمال '

" کرسکتی ھے " - *

اسی زمانے میں " ترجمان حقیقت " اخبار جاری ہوا تھا ' اور اس کے ادبی نقاد کی حیثیت سے انھیں اپنے ہم وطنوں کو الفاظ کا صحیح استعمال سکھانے کا بہت کچھ موقع حاصل تھا - اپنی قوم میں وہ بجائے مصنف کے ' استاد زبان کی حیثیت سے زیادہ معروف تھے اور اسی وجہ سے انھیں " معلم " کا لقب دیا گیا - ان کا خاص کار نامہ یہ ھے کہ اپنے تنقیدی مضامین لکھ لکھ کر انھوں نے ' جوشیلے جدت پسندوں کی روک تھام کی ' جو اکثر اپنے جوش اختراع میں ادبی ذوق کی حد سے بھی متجاوز ہوجاتے تھے - ان کی خاص خاص تصنیفات یہ ھیں :-

آتش پارہ (چنگاری) - اس کتاب کے ذریعہ سے انھوں نے بقول خود —

" ویردم آتش دللرہ سوز دل آوارہ دن
ایلدم ایجاد بہ یک یا تعین بر آتش پارہ دن "

(ایک دل سوزاں و آوارہ سے میں نے کئی دلوں میں آگ لگائی ایک چنگاری سے ہزاروں دیا سلائیوں کو جلا دیا)

حمیت کے عنوان سے انھوں نے ارطغرل غازی کی ایک مقفیٰ تاریخ بھی لکھی ھے - ان کے منظوم کلام کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ھے کہ وہ کوئی بہت زیادہ بلند مرتبہ شاعر نہیں ھیں - ان کی نثر کی تصانیف مثلاً سنبلہ ' جو چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ھے اور بیچ بیچ میں کچھ نظمیں بھی ھیں —— اپنی سلاست کے اعتبار سے خاص طور پر

---

* انشاللہ خاں نے " دریائے لطافت " میں اردو زبان کے مختلف الاصل الفاظ کے متعلق بھی بعینہ یہی رائے ظاہر کی ھے —

قابل ذکر ہے —

اس ادبی زندگی اور جدوجہد کے ساتھہ ساتھہ' انیسویں صدی میں ترکوں کے علوم بھی خواب غفلت سے بیدار ہوے - علم کے میدان میں سب سے اعلیٰ اور افضل ذات ' احمد جودت ' کی تھی ' جو ماہر سیاسیات بھی تھا اور استاد اور مورخ بھی - اور اپنی زبان کی سب سے بڑی خدمت انھوں نے تاریخ ہی کے شعبہ میں انجام دی ہے' یعنی ان کی تاریخ ترکی جو بارہ جلدوں میں ہے اور سنہ ۱۷۷۴ ع سے سنہ ۱۸۲۵ ع تک کے زمانہ پر حاوی ہے - ترکی میں اس سے زیادہ مستند اور کوئی تاریخ نہیں اور اس کی زبان از اول تا آخر سیدھی سادھی اور تصنع سے بری ہے —

مغرب کی سمت سے جو ہوائیں آ رہی تھیں' انھوں نے ترکوں میں ایک خاص ادبی فضا پیدا کردی' اور انیسویں صدی کی رومانیت (Romanticism) سے مسحور ہو کر انھوں نے کمال شوق کے ساتھہ مختلف علوم کا مطالعہ شروع کردیا' اور ان میں ایک باکمال ذات ایسی پیدا ہوگئی جس نے اپنی قوم کی تلاش علم اور تفریح کی خواہش دونوں چیزوں کو پورا کردیا - یہ ذات ' احمد مدحت ' کی تھی - واضح رہے کہ ' احمد مدحت ' سیاست داں اور مدبر دوسرا شخص تھا : یہ ' احمد مدحت ' اپنے زمانہ کا قاموس نویس تھا - اسے ہر چیز کے متعلق تھوڑي بہت معلومات تھی' اور وہ اسے اپنے ہم وطنوں کو بھی فراہم کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا - جریدہ عسکریہ' 'جریدہ حوداث' اور ترجمان حقیقت کے مدیر کی حیثیت سے اس نے ہزاروں ہی مضامین لکھے' وہ نہایت پر نویس اور جامع الحیثیات تھا اور ہر موضوع پر' جس ضخامت کا مضمون اس سے کہا جاے لکھہ سکتا تھا - بحیثیت فلسفی کے' اس نے اپنی تمام تر توجہ رد مادئین پر مبذول رکھی' اور فلاسفہ مغرب کی

تردید سے تو اس کا قلم کبھی تھکتا ھی نہ تھا' اور اس موضوع پر اس کی تحریریں کئی جلدوں میں سما سکتی ھیں - اگرچہ بعض اوقات اس کا استدلال نہایت غیر فلسفیانہ ھوا کرتا تھا' لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اپنے زمانے میں (یعنی سنہ ۱۸۸۰ اور اس کے قریب) اسی کی دلچسپ کتابوں نے ترکوں کے ذھنی جمود کو توڑا' اور انھیں تعمق اور تفکر پر اُبھارا - اس نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اسلام کی اعلیٰ اور شریفانہ روح سائنس اور فلسفہ کی ترقی کے منافی نہیں ھے —

اگرچہ اسے ایک اعلیٰ درجہ کا ناول نویس نہیں کہا جا سکتا' تاھم اس حیثیت سے بھی اس کی خدمات کچھہ کم قابل لحاظ نہیں ھیں - اس کی کتابیں' نہ صرف ترکی میں' بلکہ تمام ایشیا کی ترکی بولنے والی اقوام میں پڑھی جاتی تھیں - اگر ھم صرف اس کی ناولوں کے عنوانات ھی لکھیں' جن میں سے کچھہ ترجمے ھیں اور کچھہ اپنی خاص چیز' تو اسی میں کئی صفحات خرچ ھو جائیں - کم از کم ان کی تعداد ایک سو سے تو ضرور اوپر ھے - اگر وہ کسی ناول کا ترجمہ کرتا' تو اس میں اپنی طبیعت سے بھی کچھہ نہ کچھہ اضافہ ضرور کردیتا تھا - اس نے ترکوں کو پڑھنا سکھایا اور ان کے دلوں میں ناول خوانی کا شوق پیدا کیا - شروع شروع میں وہ خیالی اور جالب توجہ قصے لکھا کرتا تھا' لیکن جب اس نے دیکھہ لیا کہ قارئین انھیں انتہائی شوق سے پڑھتے ھیں تو رفتہ رفتہ اس نے ناولوں میں حقیقت آمیزی اور تحلیل نفسی شروع کردی' تاکہ لوگوں کی اخلاقی تعلیم بھی ھوتی رھے' اور ان میں کمال پیدا ھوجائے - اس کے قصوں میں جتنے مجرم اور گنہ گار نظر آتے ھیں' وہ سب کے سب اپنے کیفر کردار کو ضرور پہنچ جاتے ھیں —

چونکہ وہ نہایت ہی وسیع المعلومات تھا' اس لئے اپنی ناولوں کے ذریعہ سے وہ اپنی قوم کا معلم اور استاد بن گیا - وہ مقابلہ میں فرانسیسی مصنف جولس ورن سے کسی طرح کم نہیں ہے ' بلکہ کہیں کہیں تو تخیل آفرینی میں وہ اس سے بھی آگے نکل گیا ہے - اس کی اکثر ناولوں کے واقعات دور دراز ممالک کے ہیں ' مثلاً امریکہ ' برےزیل ' ہندوستان وغیرہ ' اور ان ملکوں کے باشندوں کے عادات ' رسم و رواج وغیرہ کے جو حالات اس نے لکھے ہیں وہ ترکی قارئین کے لئے مدرسوں کی جغرافیہ کی تعلیم سے کہیں زیادہ سود مند ہیں - اس کی تیز نویسی کا ایک قابل افسوس نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس کا طرز تحریر عامیانہ ہے اور قدیم ادبی معیاروں تک نہیں پہنچتا ' لیکن غالباً اپنے طرز کی اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ اتنا مقبول بھی ہوا ' اور پڑھنے والوں پر اتنا زیادہ اثر ڈال سکا —

لسانیات کے شعبہ میں جس شخص نے شہرت پیدا کی ' وہ ' احمد وفیق پاشا ' تھا ' وہ مدبر تھا ' لیکن تحریر کا ایک خاص مذاق رکھتا تھا ' اور اپنی فرصت کے اوقات میں اس نے ایسی ایسی لسانیاتی کتابیں تصنیف کیں ' جو ترکوں کے لئے نہایت اہم اور ضروری تھیں - وہی سب سے پہلا ترکی ماہر لسانیات تھا ' جس نے یورپی ماہرین السنہ مثلاً ردھاوس (Redhouse) کے اصول تحقیق پر کاربند ہوکر ایک ترکی لغت " لہجہ عثمانیہ " مرتب کی ' اور " جگتاے لغاتی " یعنی وسط ایشیا کی ترکی زبانوں کی ایک شرح لکھی - اپنی ان تصنیفات کے ذریعہ سے ' اس نے عثمانی ترکوں میں نسل پرستی کا احساس پیدا کیا ' اور ان کے دلوں میں جذبہ توران خواہی کی بیداری میں حصہ لیا - اس نے " ابوالغازی بہادر خاں " کی ' شجرات ترک ' کا بھی ترجمہ

کیا - لیکن مذکورہ بالا ادبی خدمات سے بھی کہیں زیادہ قابل قدر اس کے وہ اعلی درجہ کے تراجم ہیں' جو اس نے فرانسیسی کتابوں کے کئے - اگرچہ اس سے پہلے بھی یوسف کیامل پاشاہ نے ' فےنی لان (Fenelon) کی مشہور کتاب تے لی ماک (Telemaque) کا ترجمہ کیا تھا ' لیکن اس میں مغلق اور متروک الفاظ و عبارات کی کثرت تھی ' اس کے مقابلہ میں احمد وفیق پاشا کے تراجم آج تک ترکی زبان کے کلاسک بنے ہوئے ہیں - اس نے مولی یر (Moliere) کے ناٹکوں کو اس طرح پر "اپنایا" کہ ان کے ہیروؤں کو بطور نمونہ لے کے انھیں ترکی بساط پر بٹھا دیا - اب ترکی میں یہی فیشن ہوگیا ہے کہ غیر ملکوں کے ناٹکوں کو اپنا لیا جاے ' یعنی خاص خاص افراد قصہ کی سیرتیں وہی رہیں - جو اصل میں تھیں ' اور قصہ کا عام رنگ بھی وہی ہو ' لیکن افراد قصہ کو ترکی نمونوں میں اور غیر ملکی ماحول کو ترکی ماحول سے بدل ڈالا جاے * - البتہ یہ بات کسی قدر افسوس ناک ہے کہ یہ تراجم اسٹیج پر نہ دکھائے جاسکے - عبدالحق حامد کو بھی ہر نئی چیز کی طرف سے کچھہ ایسا خوف (جدت ترسی !) تھا کہ ترکی میں اسٹیج کے قابل کھیلوں کی ترقی نہ ہوسکی ' بلکہ زیادہ تر ناٹک صرف

---

* اردو کے افسانہ نویس بھی اگر اسی اصول پر کاربند ہوں تو بہتر ہے - خاکسار نے بھی مولی یر کے ڈرامے (Forced Marriage) کو " نکاح بالجبر " کے عنوان سے ' علی‌ھذا گو گول کے ڈراموں " Marriage " اور " Inspector - General " کو نیز چخوف کے چند افسانوں کو اپناکر اس کا تجربہ کیا ہے ' اور اکثر احباب اور نقادان فن نے انھیں پسند کیا ہے - یہ ڈرامے اسٹیج پر بھی دکھاے جاچکے ہیں —

کتابی صورت هی میں رهے —

اس دور کے مورخین میں 'مراد بے' سب سے بڑا هے - چونکہ اصل کے اعتبار سے وہ روسی ترک تھا' اس لئے تاریخ کے غیر ملکی مآخذ تک بھی اس کی دست رس تھی - اس کی ضخیم کتاب تاریخ عالم جو چھ جلدوں میں هے' فاحش اغلاط سے پر هے' علی هذا اس کی تاریخ آل عثمان میں جس کا عنوان " تاریخ ابوالفاروق " هے قیاسی کلیات اور تعمیمات سے بہت زیادہ کام لیا گیا هے - ایک عرصہ تک' یعنی اس وقت تک جب کہ نئی انجمن تاریخ نے ترکی تاریخ کے مآخذ کی طباعت شروع کرکے تقابلی مطالعہ تاریخ کے علمی اصول قائم نہیں کئے تھے —— 'مراد بے' کی تاریخ هی مستند ترین سمجھی جاتی تھی —

اسی سلسلہ میں ' ابوالضیا توفیق ' کا ذکر کرنا بھی ضروری هے' اس لئے کہ وہ چاهے بلند پایہ مصنف کی حیثیت سے معروف نہ هو' تا هم ایک پر جوش وطن خواہ اور واقف فن ناشر کتب کی حیثیت سے ضرور ممتاز هے - تمام بڑے بڑے ترکی مصنفین کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات تھے' اور اس نے ان کی تصنیفات کو جس اهتمام اور خوش ذوقی کے ساتھ شایع کیا هے' اس کا جواب ترکی طباعت میں آج تک پیدا نہیں هوا هے - اس کی کتاب " نمونۂ ادبیات" تاریخ ادبیات ترکی کا سب سے پہلا نمونہ هے - شمس‌الدین سامی' یعنی قاموس سامی کے مشہور مدون نے بھی اپنی کتاب میں عربی اور فارسی محاورات کے علاوہ عوام کی بول چال اور محاورات کے نمونے جمع کئے هیں اور اس حیثیت سے اس کی قاموس زبان کے متعلق ایک اعلی درجہ کی حوالہ کی کتاب اور سند کا حکم رکھتی هے —

ترکی جمہور کی بیداری اگر چہ آهستہ آهستہ اور بتدریج هوئی' لیکن

اس کے ساتھہ ساتھہ قطعی اور واقعی بھی تھی - حوادث کے تازیانہ نے اس کے روحانی جمود کو توڑا' مثلاً عیسائی رعایا میں قومی احساس کا پیدا ہو جانا اور حقوق کے مطالبات' سیاسی مظالم کی کثرت' جن کی بدولت' عبدالحمید کے زمانے میں مصنفین جلا وطن کئے گئے اور اس طرح ان میں یورپی تخیلات و افکار کا غیر معمولی شوق پیدا ہوگیا - قوم کے بہترین دماغوں نے بھی اس نئی روشنی کی صرف ہلکی سی جھلک دیکھی تھی' اور اسی لئے جن خیالات کا انھوں نے اپنی تصانیف میں اظہار کیا' ان میں بھی ماضی کی یادداشتیں بکثرت نظر آتی ہیں - جس دور کو اصلاحی دور کہا جاتا ہے' اس میں قوم پرستی کو خلافت کا مرادف سمجھا جاتا تھا - خود عبدالحق حامد نے اپنے ڈراموں میں اندلس کے حالات لکھے ہیں' اور اسے محض اس وجہ سے ایک قومی موضوع بحث قرار دیا ہے کہ یہ ایک اسلامی چیز تھی - اسلام اور تحریک عثمانیت یہ دونوں مل کر ایک تصور ہوگئے ہیں اور ترکی کے روشن خیال مصنفین کا تخیل قومی آزادی کے متعلق ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اسلام کی عظمت رفتہ کو زندہ کرکے اور خلفاے عثمانی کی سرکردگی میں' یورپی علوم اور یورپی مذاق کے ذریعہ قوم کو آزاد کیا جاے - ان لوگوں کی معلومات مشرق کے متعلق غالباً اتنی ہی غیر مکمل اور ناقص تھی' جتنی کہ مغرب کے متعلق - لیکن اس کے ساتھہ ہی ان کی نیت نیک تھی' اور انھوں نے خلوص اور صدق دل کے ساتھہ اس کی کوشش کی کہ زندہ رہیں' اور دریاے ڈینوب (Danube) سے لیکر خلیج فارس تک ملت اسلامیۂ عثمانی پر جو روحانی بے حسی طاری ہوچکی تھی' اسے دور کریں - فلسفہ تاریخ کی رو سے یہ بات محال نظر آتی ہے کہ ایک ایسا زبردست انقلاب' جیسا کہ سلطنت عثمانی کی روحانی اور سیاسی زندگی میں ہونے والا تھا' دفعتاً ہوجاے- یہ

نہیں ہوا، بلکہ ایک درمیانی زمانہ ایسا گزرا ہے جس میں قدیم اور جدید کا سنگم ہوا، پرانے اور نئے دونوں زمانوں کی کوتا ہیاں ایک دوسرے سے مل گئیں، اور یہ درمیانی دور گویا اس بات کی قطعی ضمانت تھی کہ ہنوز ترکوں کی روحانی تاریخ کا خاتمہ نہیں ہوا ہے - اس دور میں اخبارات جاری ہوے، ترکی بحروں میں نئی شاعری شروع ہوئی، ناول اور ڈرامے تصنیف ہوے، ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جو فرانسیسی اصل سے (جس کے یہ سب نمونے تھے) بڑھی چڑھی ہو- ترکی زبان بہت زیادہ انگھڑ تھی، اور اس پر صدیوں سے پرانا رنگ چڑھا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ ان نئے اور غیر مانوس خیالات اور احساسات کے اظہار کا اچھا ذریعہ نہ بن سکی - تاہم ترکوں نے کوشش میں کمی نہیں کی اور ضیا پاشا کے زمانے سے لیکر عبدالحق حامد کے دور تک جس قدر ترقی ہوئی، وہ واقعی تعجب خیز ہے - نوجوان مصنفین کے دل جوش اور فتح مندی کے احساس سے لبریز تھے، اور جب سلطان عبدالحمید کو معزول کیا گیا، تو تاریخ کے استیج پر ایک نئی ترکی قوم نے قدم رکھا - اس نئی قوم کو سخت سے سخت ناکامیوں اور شدید سے شدید مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا - جنگوں کے لامتناہی سلسلے اور اقتصادی مشکلات کی وجہ سے اس کی صفیں کی صفیں تہ و بالا ہوگئیں، لیکن مصائب کے باوجود ترکی روح فنا نہیں ہوئی، ترک بدستور اپنی شاندار شاہراہ ترقی پر گام زن رہے، اور انھوں نے اگلے زمانہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ شاندار کام کر دکھاے - انھوں نے ان ذہنی بندھنوں کو جو متقدمین سے انھیں ورثہ میں ملے تھے، توڑنا شروع کیا، اور تہذیب و شائستگی کے ایک نئے شاندار اور تاریخی دور میں داخل ہوگئے - بالآخر قومی احساس بیدار ہوکر رہا !

ادب

گوئٹے کا فاؤسٹ

(مترجمۂ جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم – اے ، پی ایچ – ڈی –
صفحات ۳۵۰ ، قیمت مجلد چار روپے غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے -
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن)

گوئٹے کا فاؤسٹ اُن کتابوں میں سے ہے جن کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی اور دنیا کے حوادث اور تغیرات اُن کی فضیلت اور شوکت کو کبھی مدھم نہیں کر سکیں گے - اس کتاب میں جرمنی کے سب سے بڑے شاعر اور نقاد نے ڈرامے کے پیرائے میں نظام ہستی کے اُن مسائل اور اسرار پر روشنی ڈالی ہے جس کی توہ میں بنی نوع انسان کے برگزیدہ لوگ ہمیشہ رہے ہیں اور آیندہ بھی رہیں گے - شاعر نے اس میں انسان کی روحانی زندگی کی کشمکش کی داستان بیان کی ہے - ایک طرف انسان ہے اور دوسری طرف شیطان - وہ کائنات کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ اُسے مادی لذتوں کی طرف مائل کرنا چاہتا ہے —

یہ کتاب یورپ کے ادب میں بہت بڑا پایہ رکھتی ہے اور اس کا ترجمہ یورپ کی ہر زبان میں ہو چکا ہے - انگریزی میں اس کے متعدد ترجمے موجود ہیں - ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اصل جرمن زبان سے اس کا ترجمہ انجمن ترقی اردو کے لئے کیا ہے اور انگریزی ترجمے بھی پیش نظر رہے ہیں - ڈاکٹر صاحب کے ترجمے کی تعریف میں کچھ کہنا لاحاصل ہے - اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اردو میں نہ تو ایسی اعلیٰ پایہ کی

کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں اور نہ ایسا اعلیٰ درجے کا ترجمہ ہوا ہے - فاضل مترجم نے شروع میں ۱۱۷ صفحے کا مقدمہ لکھا ہے جس میں گوئٹے سے قبل کے جرمن ادب ، گوئٹے کی زندگی کے حالات اور اس کی تصانیف ، فاؤسٹ کے ماخذ ، فاؤسٹ کی تدریجی نشو و نما ، قصے کے خلاصے اور کتاب کی تنقید پر نہایت خوبی اور تحقیق کے ساتھ بحث کی ہے - اس ڈرامے نیز جرمن ادب کے سمجھنے کے لئے اس مقدمے کا مطالعہ بہت ضروری ہے —

تاریخ ادبیات ایران

(مصنفہ پروفیسر براؤن مرحوم و مترجمہ سید سجاد حسین صاحب ایم - اے مددگار پروفیسر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن - قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے - غیر مجلد چار روپے - انجمن ترقیٔ اردو سے مل سکتی ہے)

یہ کتاب کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں ہماری زبانوں میں تو کیا یورپ کی بھی کسی زبان میں فارسی ادب کی تاریخ پر اس پایہ کی کتاب نہیں لکھی گئی - یہ حصہ جو اس وقت شایع کیا گیا ہے خاص طور پر نہایت قابل قدر ہے کیونکہ لسانی تحقیق سے ابھی تک ہماری زبان محروم ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ زبان کی تاریخ کا کیونکر کھوج لگایا جاتا ہے اور کہاں کہاں سے اور کیونکر اس کا مسالا جمع کیا جاتا ہے - جسے ہم اب فارسی زبان کہتے ہیں وہ کیا تھی ، کیونکر بنی ، کیا کیا تغیرات ہوئے اور کن کن قوتوں اور اسباب نے اس کے بنانے اور بدلنے میں مدد کی - غرض یہ تمام مسائل غور اور مطالعہ کرنے کے قابل ہیں - ترجمہ قابل مترجم نے بہت صاف اور شستہ زبان میں کیا ہے —

شاعر کی رات

(از حضرت جوش ملیح آبادی - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ - اعجازالحق قدوسی صاحب نام پلی جدید (۱۷۶) حیدر آباد دکن

یہ حضرت جوش ملیح آبادی کی اُن نظموں کا مجموعہ ہے جن میں مست رات ،

سنہری رات ' برسات کی رات ' صلح کی رات ' اندھیری رات ' وغیرہ وغیرہ عنوانوں کے تحت میں عجیب عجیب کیفیتیں بیان کی گئی ہیں - اب تک حضرت جوش صبح کے شاعر سمجھے جاتے تھے لیکن اب معلوم ہوا کہ رات کی کیفیتیں وہ صبح کی کیفیتوں سے کہیں زیادہ لطف اور دلکشی سے بیان کرسکتے ہیں - رات پردہ پوش ہوتی ہے اور انسان کی آزادی اور تخیل کی جولانی میں زیادہ وسعت پیدا ہوجاتی ہے - جوش جیسے آزاد منش شاعر کو رات دن سے زیادہ عزیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں ان کا خاص انداز زیادہ اجاگر نظر آتا ہے اور ان میں ایک والہانہ اور مستانہ کیفیت پائی جاتی ہے یہ نظمیں بہت دلکش اور پر لطف ہیں اور پڑھنے کے قابل ہیں —

رفیق تنہائی اور دیگر فسانے

(مصنفۂ سید علی عباس حسینی صاحب ایم - اے ' ایل - ٹی ' جوبلی کالج لکھنؤ - قیمت ایک روپیہ — ملنے کا پتہ سید نثار مہدی صاحب گدڑی پٹنہ سٹی - سید عظم حسین صاحب مدیر ادب لکھنؤ

اس مجموعے میں نو فسانے ہیں جن میں سے بعض مختلف رسالوں میں شایع ہوچکے ہیں - ان فسانوں کو پڑھ کر خوشی ہوئی - قابل مصنف نے ہر فسانے میں تناسب کا بڑا خیال رکھا ہے ' کہیں اعتدال سے آگے قدم نہیں بڑھایا - بعض بعض موقعوں پر نفسیاتی نکات بڑی خوبی سے بیان کر گئے ہیں - زبان بہت شستہ اور اچھی ہے اور موقع محل کے لحاظ سے بہت موزوں ہے اگرچہ آج کل مختصر فسانوں کے لکھنے کا عام رواج ہوگیا ہے لیکن بہت کم اس میں کامیاب ہوئے ہیں اور ہماری رائے میں خوش نصیب کامیاب مصنفوں میں سید علی عباس حسینی صاحب کا بھی شمار ہے —

دختر فرعون

(حصہ دوم مترجمہ لطافت حسین خاں صاحب صفحات ۳۳۴ قیمت دو روپے - انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے)

ایک جرمن ناول کا ترجمہ ہے اس کے پہلے حصے پر اس سے قبل تبصرہ

ہوچکا ہے یہ اسی کا دوسرا حصہ ہے - مصنف (جارج مارٹز ایبرس) مصریات کا بڑا ماہر ہے - اس نے مصر و ایران کے قدیم تمدن کو ناول کے پیرائے میں نہایت خوبی سے دکھایا ہے - جو معلومات اس ایک ناول کے پڑھنے سے حاصل ہوتی ہیں وہ بڑی بڑی کتابوں کے مطالعہ سے بھی ممکن نہیں۔ یہ ایک خاص قسم کا ناول ہے اور اپنے طرز کا بے نظیر ہے - ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مطالعہ نہایت دلچسپ اور مفید ہوگا - یہ شروع سے آخر تک عجیب و غریب معلومات اور واقعات سے لبریز ہے اور اس کے ساتھہ ناول کی دلچسپی میں کہیں فرق نہیں آتا —

ارمغان محبوب

اس رسالے کے شروع میں راجہ نرسنگھہ راج بہادر عالی نے اپنی کچھہ رباعیات جو حمد میں ہیں درج کی ہیں - اس کے بعد اپنے عزیز بھائی راے محبوب راج محبوب کا مرثیہ اور نوحے ہیں - آخر میں مرحوم کے دوست اور عزیز و اقربا نے اُن کی وفات کی جو تاریخیں کہی ہیں وہ درج ہیں - ان تاریخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کس قدر مقبول اور ہر دلعزیز تھے —

گلزار عثمانی

یہ مولانا محمد عبدالقوی فانی ' ایم - اے ' معلم شعبۂ فارسی و اردو جامعۂ لکھنؤ کے نو فارسی قصائد کا مجموعہ ہے - ان میں سے آٹھہ قصیدے اعلیٰ حضرت بندگان عالی حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی مدح میں ہیں اور آخری قصیدہ شہزادوں کی کدخدائی کی تہنیت میں ہے - بعض قصائد قاآنی کی تتبع میں لکھے ہیں اور خوب لکھے ہیں - اِن کے کلام میں زور اور بلندی پائی جاتی ہے اور فارسی زبان پر پوری قدرت حاصل ہے —

فرانسیسی افسانے

مرتبہ عزیز احمد صاحب طالب علم کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن - چھوٹی تقطیع صفحات ۸۲ - لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی - قیمت ۱۲ آنے، ملنے کا پتہ :- مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن

دنیا کے شاہکار افسانوں کے سلسلے کے تین حصوں پر اس سے قبل تبصرہ ہو چکا ہے - یہ اس سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے - اس کے مرتب عزیز احمد صاحب ہیں، اس میں کل نو افسانے ہیں، جو مختلف فرانسیسی مصنفوں کے لکھے ہوئے ہیں - افسانے مشہور ہیں - ان کے ترجمے یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں - ان میں سے اکثر مرتب کے ترجمہ ہیں اور بعض دوسروں کے، جو کہیں سے نقل کر لئے گئے ہیں، اور حصوں کے مقابلے میں ان افسانوں کے ترجمے اچھے ہیں، حالانکہ انگریزی سے ترجمہ ہوئے ہیں تاہم ترجمہ در ترجمہ میں اصل سے قریب معلوم ہوتے ہیں - زبان اور بیان دونوں افسانوں کے لحاظ سے نامناسب نہیں —

(چ)

اِنقلاب دهلی

مرتبہ جناب مولانا نظامی بدایونی ایڈیٹر ذوالقرنین - چھوٹی تقطیع صفحات ۱۲۰ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ - قیمت ڈیڑہ روپیہ - مرتب کے پتے (بدایوں یوپی) سے مل سکتی ہے -

مغل اعظم عالمگیر کی وفات ہی سے مغلیہ سلطنت کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگی تھیں، باہمی نفاق امرا کی سازشوں اور ارکان حکومت کی خود غرضیوں اور کوتاہ اندیشیوں نے رفتہ رفتہ اس عظیم الشان سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا یہاں تک کہ قلمرو مغلیہ کا نام صرف قلعہ معلیٰ کی چار دیواری تھی - پونے دو سو سال قبل ہی بقول 'سودا' ہند کی وسیع و عریض سلطنت کے بائیس صوبوں کا شہنشاہ کول (علی گڈہ) کی فوجداری کے اختیار سے

محروم تھا :—

کیا ھے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند جو ایک شخص تھا بائیس صوبہ کا خاوند
رھی نہ اُس کے تصرف میں فوجداری کول

اس عرصے میں پیہم کشت و خون اور قتل و غارت کے ھنگامے برپا ھوتے رھے ' دھلی جو پایہ تخت تھی اور تمام ھندوستان کی جان ' ھر وقت ان حوادث کا نشانہ بنی رھی ' اس کی رونق و آبادی اور چہل پہل ھر آن گھٹتی گئی یہاں تک کہ سنہ ۵۷ کی شورش ھوئی ' اور وہ تخت و تاج جس کو بابر و ھمایوں نے بڑی الوالعزمی اور جانبازی سے حاصل کیا تھا نہایت بزدلی اور کمزوری سے چھن گیا ۔ اس کے ساتھ ھی دھلی جو علوم و فنون کا مرکز ' تہذیب و تمدن کا گہوارہ ' مال و دولت کا گھر تھا ' بے رونق ' مفلس سنسان اور ڈراونا جنگل بن گیا —

آغاز انحطاط سے لے کر اس شورش تک اکثر شاعروں نے دھلی کی تباھی و بربادی کا رونا رویا ھے ' یہ شاعر دھلی کے خراب و برباد اور تباہ و تاراج ھونے کا دکھڑا نہیں سناتے ھیں بلکہ اس عظیم الشان سلطنت کے ملیا میٹ اور تباہ و غارت ھونے پر خون کے آنسو روتے ھیں جس کا پایہ تخت دھلی تھی ۔ یہ نظمیں دراصل دکھ بھری آواز ھے جو عبرت اور غیرت دلاتی ھے اور آئینہ ھے جس میں ایک الوالعزم قوم کے ادبار و انحطاط اور زوال و نحوست کی تصویر نظر آتی ھے ۔

حضرت نظامی بدایونی نے یہ بہت مفید کام کیا کہ ایسی نظمیں جس قدر مل سکیں جمع کرلیں اور ان کو خاص اھتمام سے طبع کرکے شائع کیا ھے ۔ اس میں (۴۷) شاعروں کی (۹۷) نظمیں ھیں ۔ یہ بجائے خود ھماری شاعری کا عمدہ نمونہ ھے ۔ اس میں بعض نظمیں بہت بلند پایہ رکھتی ھیں ۔ 'سودا' کی نظمیں پونے دو سو سال قبل لکھی گئی ھیں لیکن جو حال اس زمانے کا تھا اس کو ھو بہو بیان کیا ھے ' یہ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں بعض نظموں میں تغزل کا رنگ غالب ھے ۔ لیکن بہت کم درد اور اثر سے خالی ھیں مولانا حالی کی نظم بہت دلدوز ھے —

حضرت نظامی بدایونی نے سنہ ۵۷ کی شورش کے بعد کے شاعروں کی نظمیں جمع کی ھیں اور قدیم شعرا میں سودا کو لیا ھے ۔ جب قدیم شاعروں کو

انھوں نے اس بزم میں جگہ دی تو کیا مناسب نہ تھا کہ بعض مشہور شاعروں کے کلام سے مسلسل نظمیں نہ ملتیں نہ سہی مختلف اشعار ہی جمع کرلئے جاتے - مثال کے لئے ' میر کے ضخیم کلیات میں متعدد شعر ایسے ہیں جو اس موضوع سے تعلق رکھتے ہیں - ان میں ایک شعر کئی کئی نظموں سے زیادہ پرتاثیر ہے - کہا کہا ہے —

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آی تصویر نظر آی

اس قسم کے اشعار کے علاوہ میر کے کلیات میں دو مخمس ایسے ہیں جو کم و بیش اسی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں میر کے علاوہ ان کے مشہور معاصرین کے کلام میں اور بعد کے شعرا کے کلام میں بھی ایسے اشعار اور نظمیں موجود ہیں - اگر تلاش سے ان کو جمع کر لیا جاتا تو بہت اچھا مجموعہ تیار ہو جاتا —

موجودہ کتاب میں بھی کافی نظمیں ہیں اور عمدگی سے مرتب اور طبع ہوئی ہیں - لایق مرتب نے ہر شاعر کے مختصر سے حالات بھی لکھے ہیں ٹائٹل بہت خوبصورت ہے ' اس پر ' سودا ' غالب ' ظفر ' حالی ' مجروح اور داغ کی تصویریں ہیں —

کتاب میں ایک جگہ رگت (بمعنی خون) کو رکت لکھا ہے - اور کلیات کو بجاے مذکر کے مونث ' صفحہ ۴۹ " ان کی ایک کلیات .... بدایوں میں طبع ہوئی ہے " —

(چ)

———

تصوف

صبغتہ اللہ

(یعنی مرقعۂ تصوف کا پہلا مقدمہ مصنفۂ شیخ غلام محمد احمد ایم - اے ' ایم - او - ایل ' مجسٹریٹ جموں صفحات ۱۸۴ قیمت قسم اول ایک روپیہ دس آنے' قسم دوم ایک روپیہ چھ آنے ملنے کا پتہ نواز بک ایجنسی محلہ جو لاکہ جموں توئی)

فاضل مصنف نے تصوف اسلام پر جو کتاب لکھنی شروع کی ہے یہ اس کا پہلا مقدمہ ہے - باقی مقدمے اور حصے کچھہ تو لکھے جا چکے ہیں اور کچھہ زیر تالیف ہیں - ان کا ارادہ ان سب حصوں کو انگریزی فارسی اور عربی ترجمہ کرنے کا ہے - انہوں نے ایک بہت بڑا کام اپنے ذمے لیا ہے اور بڑے خلوص اور مستعدی سے انجام دے رہے ہیں - وہ مستشرقین کے اس خیال سے سخت خفا اور بیزار ہیں کہ اسلامی تصوف کے اکثر اصول اس کے اپنے نہیں یعنی اسلامی نہیں بلکہ اوروں کے نظام فلسفہ سے لئے گئے ہیں - اس مقدمے میں انہوں نے اس خیال کی تردید کی ہے - فاضل مصنف رموز تصوف کو حقایق اسلام سمجھتے ہیں اور کسی حال میں بھی اُسے اسلام سے جدا خیال نہیں کرتے - اور اس دعوے کو غلط کہتے ہیں کہ شرائع اسلام میں ابتداً حقائق و دقائق تصوف کا وجود نہ تھا —

اس مقدمے میں تصوف کے بہت سے ابتدائی اور ضروری مسائل پر بحث آگئی ہے - جو لوگ تصوف سے ذوق رکھتے ہیں یا اسلامی تصوف کو سمجھنا چاہتے ہیں اُنہیں یہ کتاب ضرور مطالعہ کرنی چاہئے - قابل مصنف کے طرز بیان میں جوش اور خلوص پایا جاتا ہے - انہوں نے مستشرقین اور انگریزی دان طلبہ پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کی ہے اور ان کے خیالات سے بیحد سوء ظنی کا اظہار کیا ہے - ہماری رائے میں اس قسم کے مباحث میں اس قدر سوء ظنی اور تشدد مناسب نہیں - اور یہ کہنا کہ اسلامی تصوف پر بیرونی اثر مطلق نہیں بڑا زیادتی ہے - جب کہ مذاہب ایک دوسرے کے اثر سے نہیں بچے تو دوسرے عقائد اور تعلیمات کا کیا ذکر ہے —

انتخاب دیوان شمس تبریز

(از ڈاکٹر نکلسن مرتبہ جناب عبدالمالک آروی صاحب
دفتر ایوان اشاعت گورکھپور - قیمت دو روپے آٹھہ آنے)

جناب عبدالمالک صاحب آروی نے پروفیسر نکلسن کے انتخاب دیوان شمس تبریز پر نہایت محققانہ مقالہ لکھا ہے اور اس ضمن میں تصوف، صوفی شاعری اور شعرا اور دوسرے اہم مسائل پر جن کا تعلق تصوف سے ہے بڑی قابلیت سے بحث کی ہے - ان کے ماخذ زیادہ تر انگریزی اور فارسی تذکرے اور کتابیں ہیں - اس کتاب کے مطالعہ سے فاضل مرتب کی وسیع نظری اور تنقیدی قوت کا اظہار ہوتا ہے - آخر میں مولانا روم کے دیوان کا (جو دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے) انتخاب دیا ہے - انتخاب تو صرف پچیس چھبیس صفحے پر ہے لیکن باقی تمام کتاب یعنی تقریباً ۲۰۹ صفحات پر دوسری متعلقہ بحثیں ہیں جو محققانہ معلومات سے لبریز ہیں - لیکن تعجب ہے کہ فاضل مصنف نے سند میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور غوث الاعظم عبدالقادر جیلانی (رح) کے اشعار جا بجا پیش کئے ہیں حالانکہ دیوان جس میں سے یہ اشعار نقل کئے گئے ہیں اُن سے خواہ مخواہ مسلوب کردئے گئے ہیں - ہمارے ہاں بارہا ایسا ہوا ہے کہ بڑے بڑے بزرگوں اور اولیا کے نام سے کتابیں لکھ کر شائع کردی گئیں اور غلطی سے انھیں کی سمجھی گئیں - محققانہ بحثوں میں ان سے سند لینے میں احتیاط کی ضرورت ہے —

آئینۂ معرفت

(مصنفۂ سید اعجاز حسین صاحب ایم - اے،
لکچرر شعبہ اردو - الہ آباد یونیورسٹی - مجلد قیمت
دو روپے لالہ نراین لعل بک سیلر، کٹرہ روڈ، الہ آباد) —

دراصل مصنف کا یہ وہ مقالہ ہے جو انھوں نے سنہ ۱۹۲۹ ع میں الہ آباد یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے تحریر فرمایا تھا اور اب کتاب کی صورت میں شائع ہوا ہے - پہلے باب میں تصوف کی ابتدا اور ترقی

اور فرقۂ غلاتہ کا ذکر ہے - دوسرے میں شریعت ' طریقت ' معرفت ' حقیقت اور صوفیوں کے فرقوں کا بیان ہے - تیسرے میں فارسی صوفیانہ شاعری اور شعرا اور چوتھے میں پرانی اردو شاعری اور پانچویں میں ولی سے اکبر اب تک کی صوفیانہ شاعری اور شعرا سے بحث ہے - تمہیدی بحثوں اور فارسی صوفیانہ شاعری پر ۱۷۶ صفحے لکھے ہیں ' اردو شاعری پر جو اصل موضوع ہے ' ۱۱۰ صفحے ہیں —

اگرچہ ابتدائی تین باب میں جو اصل موضوع کا مقدمہ ہیں تمام بحثیں سرسری ہیں لیکن اصل موضوع یعنی اردو صوفیانہ شاعری پر جو بحث ہے وہ بھی کافی نہیں —

صوفیوں کی تین قسمیں ہوسکتی ہیں ایک تو عملی ' دوسرے علمی اور تیسرے رسمی - عملی تو وہ ہیں جنھوں نے ریاضت اور محنت سے اپنے نفس کا تزکیہ کیا ہے اور اعلیٰ مقامات پر پہنچے ہیں اور یہی اصل صوفی ہیں علمی وہ ہیں جنھیں تصوف کے علم و اصطلاحات پر عبور ہے مگر عملی طور پر کبھی اسے حاصل نہیں کیا - رسمی وہ ہیں جن میں عمل ہے نہ علم چند سنی سنائی باتیں یا اصطلاحیں جانتے ہیں اور بس —

اردو زبان کے دکنی یا گجراتی صوفیوں میں بیشک بہت سے حقیقی صوفی تھے لیکن شاعر کہلانے کے مستحق صرف چند ہی تھے - وہ شعر اس لئے کہتے تھے کہ یہ تعلیم کی اشاعت کا مقبول طریقہ تھا اور نثر کا نہ زیادہ رواج تھا اور نہ یہ مقبول تھی - اس میں مصنف نے سلطان قطب شاہ کو بھی شریک کر لیا ہے - اگر قطب شاہ صوفی شاعر تھے تو پھر اردو کا کوئی شاعر بھی غیر صوفی نہیں ہوسکتا —

دوسرے اور بعد کے دور میں انھوں نے میر درد ' میرتقی ' آتش ' غالب اور زندہ شعرا میں آسی ' عزیز اور اقبال کو لیا ہے - اصل یہ ہے کہ ان میں سوائے میر درد کے کوئی بھی صوفی یا صوفی شاعر نہیں - میر درد پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردوے معلیٰ کی اردو شاعری میں تصوف کا رنگ پیدا کیا وہ اعلیٰ درجے کے درویش اور صوفی تھے اور اُن کا کلام صحیح صوفیانہ شاعری کا نمونہ ہے - اور انہیں کا اثر تھا کہ بعد کے شعرا مثلاً میر تقی وغیرہ نے اس روش کو کسی قدر اختیار کیا - زندہ شاعروں میں

عزیز ' اقبال اور آسی کو صوفی شاعر کہنا ظلم ہے - ان سے تو کہیں زیادہ بے نظیر شاہ اس کے مستحق ہیں - اور جب آتش صوفی شاعر ہے تو کیوں نہ نظیر کو صوفی شاعر کہا جائے —

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ قدیم اردو کے صوفی شعرا میں مصنف نے قطب شاہ کو بھی داخل کیا ہے لیکن جو کلام نقل کیا گیا ہے وہ قطب شاہ کا نہیں ہے بلکہ اس کے چچا سلطان قلی قطب شاہ کا ہے - اس باب کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان قدیم شعرا کا کلام نہیں پڑھا ' اس لئے لازم تھا کہ وہ صحیح طور پر حوالے دیتے کہ یہ چیزیں انہیں کہاں سے دستیاب ہوئیں ہیں ہر مصنف اور مولف کے لئے مگر خاص کر ایک ری سرچ اسکالر (ادبی محقق) کے لئے یہ بیحد ضروری ہے کہ وہ ہر خیال اور کلام کے لئے جو اس نے کسی دوسری جگہ سے حاصل کیا ہے ٹھیک ٹھیک حوالہ درج کرے - اس سے (جیسا کہ اکثر کم علم اور محدود نظر کے مولف خیال کرتے ہیں) اُن کی کم علمی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ان کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے —

خاتمے پر مصنف نے لکھا ہے کہ " اردو شاعری میں عشق و حسن کے چرچے کا ایک بڑی حد تک ذمہ دار تصوف ہے " - ممکن ہے ایسا ہو لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اردو شاعری میں یہی چرچے نہیں بلکہ دوسرے مضامین بھی بھی جنہیں وہ تصوف کا اثر سمجھتے ہیں فارسی شاعری سے آے ہیں اور ہمارے شاعروں نے اکثر و بیشتر فارسی شعرا کی تقلید کی ہے —

حکمت و معاشرت

ریاست

(از افلاطون مترجمۂ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

ایم - اے ' پی ایچ - ڈی پرنسپل جامعۂ اسلامیہ دہلی - صفحات
۶۶۸ ' قیمت فی جلد مجلد پانچ روپے ساڑھے چار روپے غیر مجلد
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے)

بقول فاضل مترجم کے یہ " دنیا کے سب سے بڑے مصنف کی سب سے اہم کتاب اور " فلاطون کے شجر علم کا پختہ ثمر " ہے - اس سے بڑھ کر اس کتاب کی کوئی تعریف نہیں ہوسکتی اور یہ سچی تعریف ہے - اس کتاب کا موضوع کیا ہے - وہ بھی ہم قابل مترجم کے مقدمے ہی سے نقل کرتے ہیں کیونکہ اس سے بہتر طور پر یہ حقیقت ادا نہیں ہوسکتی --

" اِن ناموں سے (ریاست اور تحقیق عدل) یہ سمجھ لینا کہ یہ سیاست یا قانون پر ایک تصنیف ہے غلط ہوگا - سچ یہ ہے کہ اس میں انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے ' البتہ زیادہ توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر ہے ' اس لئے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پر معلوم ہوتا ہے - لیکن یہ نہیں ہے کہ فکر و خیال کی دنیا کو یک قلم نظر انداز کر دیا گیا ہو - فلسفہ کی بلندیاں دیکھنی ہوں تو عین خیر میں سب چیزوں کے اتحاد کا جلوہ بھی اس کتاب میں دکھائی دیتا ہے ' اخلاق کا سبق لینا ہو تو اس میں روح انسانی کے محاسن کی گہری اور لطیف تحقیق موجود ہے : تعلیم کے مسائل پر روشنی درکار ہو تو بقول روسو فن تعلیم پر آج تک جتنی کتابیں لکھی گئیں اُن میں یہ سب سے بہتر ہے ' - سیاسی زندگی میں رہنمائی کے لئے یہ ایک جدید ہئیت اجتماعی اور اس کے اداروں کی جیتی جاگتی تصویر لا کھڑی کر دیتی ہے اور انسانی جماعتوں کے تغیر ' عروج و زوال کے اسرار سر بستہ کی کنجی کی تلاش ہو تو فلسفۂ تاریخ کے یہ مشکل مسائل بھی اس میں بیانی کر دئے گئے ہیں " --

اس کے بعد بھی اگر کوئی پڑھا لکھا شخص (خصوصاً جب کہ اس کا ترجمہ اردو میں ہوگیا ہے) اس کتاب کو نہ پڑھے تو اس کے حق میں سوائے اس کے کہ دعائے خیر کی جائے اور کچھ نہیں کہہ سکتے --

اس قسم کی حکیمانہ قدیم کتابوں کا ترجمہ نہایت دشوار ہوتا ہے لیکن یہ ترجمہ ایسی صاف ' شستہ اور پختہ زبان میں کیا گیا ہے کہ فاضل مترجم

کی محنت کی داد دینے کو بے اختیار جی چاہتا ہے —

نفسیات عنفوان شباب

(تصنیف پروفیسر اشپرانگر ' استاد فلسفۂ تعلیم و فلسفۂ تمدن برلن یونیورسٹی - مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم - اے ' پی ایچ ' ڈی - صفحات (بڑی تقطیع) ۳۰۸ - مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

شباب کی منزل زندگی میں سب سے زیادہ کٹھن ہے اور اس کا جاننا اور سمجھنا اس سے بھی زیادہ کٹھن ہے - پروفیسر اشپر انگر ہی سا عالم متبحر اس دشوار کام کو انجام دے سکتا تھا - کیونکہ وہ علاوہ فاضل اجل ہونے کے فلسفۂ تعلیم اور فلسفۂ تمدن کے نامور پروفیسر بھی ہیں - ان کو پندرہ سولہ سال سے ہزارہا نوجوانوں سے سابقہ رہا ہے - نیز انھیں جرمنی کی " تحریک شباب " سے جس میں یونیورسٹی کے طالب علموں کے علاوہ اسکولوں کے لاکھوں لڑکے شامل ہیں ' بہت گہرا تعلق ہے - انھوں نے بڑے غور سے ان نوجوانوں کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے اور سالہا سال کی محنت اور فکر کا نتیجہ یہ کتاب ہے - اس کتاب کے موضوع کے متعلق کچھ کہنا بیجا طول ہوگا - یوں سمجھئے کہ یہ شیخ سعدی کے اس جملہ کی تشریح ہے " در ایام جوانی چنانکہ افتد تو دانی " مگر یہ محض حسن و عشق تک محدود نہیں بلکہ نوجوانوں کی زندگی کے ہر شعبے اور ہر پہلو کو حکیمانہ انداز میں بڑی صفائی اور سلاست سے بیان کیا ہے —

مترجم اس کے ڈاکٹر عابد حسین صاحب ہیں - یہ فاضل پروفیسر کے شاگرد ہیں اور ان میں استاد کی بعض خوبیوں کی صاف جھلک نظر آتی ہے - یہ ادیب بھی ہیں اور حکیم بھی اور اس کے علاوہ مترجم بھی بے نظیر ہیں - ترجمے کو لوگ معمولی چیز سمجھتے ہیں لیکن اعلیٰ پایے کی تصانیف کا ترجمہ معمولی تالیف و تصنیف سے کہیں زیادہ مشکل اور صبر طلب اور

کہیں زیادہ مفید اور بیش بہا ہوتا ہے —

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ اصل جرمن زبان سے کیا ہے اور ابھی یورپ کی دوسری زبانوں میں ترجمہ نہونے پایا کہ اردو میں ترجمہ ہوگیا اس پر ہم جامعۂ ملیہ اور قابل مترجم کو مبارک باد دیتے ہیں - جب مصنف ایسا اور مترجم ایسا ہو ' ایک اُستاد اور دوسرا شاگرد اور دونوں ادیب ' حکیم اور معلم تو اس کے بعد کتاب یا ترجمہ کی تعریف میں کچھہ کہنا لا حاصل ہے —

جرمنی میں اس کتاب کی اتنی قدر ہوئی کہ پہلا اڈیشن چند مہینے میں چھپ کر فروخت ہوگیا - دیکھیں یہاں اس کی کیا قدر ہوتی ہے —

سہاگ رات یا

بھوانی کو سیکھہ

(مصنفہ پنڈت کرشنا کانت مالوی صاحب ' مترجمہ جگمت موہن لعل صاحب " رواں " ایم - اے ایل ایل بی چھوٹی تقطیع ' صفحات ۴۶۵ درمیانی ٹائپ ' طباعت اور کاغذ عمدہ - قیمت درج نہیں - پنڈت جی کے پتہ (الہ آباد) سے مل سکتی ہے —)

اصلاح معاشرت کے باب میں ہندوستان کو ابھی بہت کچھہ کرنا ہے ' خصوصاً صنف نازک کے خیالات اور اعتقادات کی اصلاح نہایت ضروری ہے - سہاگ رات اسی قسم کی کوشش کا نتیجہ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ کس طرح ایک نوجوان لڑکی مکمل عورت اور کامل انسان بن سکتی ہے ' اور ازدواجی زندگی کو خوش گوار و سود مند بناکر زندگی کی مہم کامیابی کے ساتھہ سر کرسکتی ہے - اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوے لایق مصنف نے خط

و کتابت کے پیرائے میں اس کو تحریر فرمایا ہے ' بڑی بہن اپنی چھوٹی چچا زاد بہن کو جس کی حال میں شادی ہوئی ہے خطوں کے ذریعہ از دواجی زندگی کے رموز سے آگاہ کرتی ہے - اس میں کل ۲۶ خط ہیں جو ۴۵۶ صفحوں پر مشتمل ہیں ' شادی سے لے کر صاحب اولاد ہونے تک اور اس کے بعد کے زمانے سے متعلق تمام ضروری اور لازمی باتیں درج ہیں - ان میں معاشرتی ' اخلاقی ' مذہبی ' طبی غرض زندگی سے متعلق ہر قسم کے معاملات سے بحث کی ہے - یہ تمام باتیں کوئی نئی اور اجنبی نہیں ' تا ہم ان کو جس دلچسپ اور موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ بہت ہی موثر اور سبق آموز ہے - ہر شعبہ زندگی اور مبحث و موضوع کے لحاظ سے جگہ جگہ رشیوں ' مقدس کتابوں اور مغربی مشاہیر خواص تنقید کے حوالے دئے ہیں جن سے کتاب کا پایۂ اعتبار بلند تر ہوگیا ہے اکثر مقامات اس کتاب میں ایسے تھے جہاں اندیشہ تھا کہ مصنف کا قلم عریانی اختیار کرے ' لیکن لائق مصنف نے پردہ ہی پردہ میں نہایت موثر طریقہ سے ان مقامات کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہیں متانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا —

کتاب ختم کرتے ہی آخر میں مولانا " حالی " کی مشہور نظم " چپ کی داد " پر نظر پڑتی ہے جس میں عورتوں کی عظمت و سر بلندی کو نہایت موثر انداز میں جتایا گیا ہے اور ان کو اس پردے میں نہایت دل نشین سبق دئے ہیں - یہ نظم بہت ہی مناسب محل درج کی گئی ہے —

کتاب در اصل ہندی میں لکھی گئی تھی - ہندی داں طبقے میں اس کی کافی شہرت ہوئی ضرورت تھی کہ اردو میں بھی منتقل ہو جاتی ' مقام مسرت ہے کہ خود پنڈت جی نے اپنے ایک دوست جناب " رواں " صاحب سے اس کا ترجمہ کرایا ہے - زبان کی چند غیر اہم فرو گذاشتوں کے قطع نظر ترجمہ بہت صاف ستھرا اور رواں ہے - ترجمہ میں اصل کتاب کے تیور نظر آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کا طرز تحریر مربوط و مدلل ہے —

امید ہے کہ یہ کتاب نوجوانوں کے لئے مفید اور سبق آموز ثابت ہوگی —

(چ)

———

مذہب

دربار رسالت

مولفہ جناب فضل اللہ خاں صاحب شاہ جہاں پوری
ناظم مدرسہ ہاشمیہ بمبئی نمبر ۳ چھوٹی تقطیع '
صفحات ۱۳۶ ' لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجے کے
قیمت ۸ آنے ' مولف کے پتہ سے مل سکتی ہے —

اس مختصر کتاب میں آنحضرت صلعم کی حیات و سیرت اور تعلیمات کا ذکر ہے - کل سترہ باب ہیں ' پہلے باب میں ظہور نبوی سے قبل کے عرب کی حالت کا نقشہ دکھایا گیا ہے - اس کے بعد ۱۵ ابواب میں رسول اکرم کی حیات ' اسلام کی تعلیم اور اس کی اشاعت کے واقعات ہیں ' آخری باب میں غیر مسلم مشاہیر کی آرا درج کی گئی ہیں جو آنحضرت اور اُن کی تعلیم کے باب میں ظاہر کی گئی ہیں —

کتاب گو مختصر ہے لیکن اس میں تمام ضروری اور قابل ذکر واقعات درج ہیں ' کتاب کی تہذیب و ترتیب بھی اچھی ہے - ہر باب کے آخر میں چند سوالات طالب علموں کے آموختے اور یاد تازہ کرنے کے لئے دئے ہیں - کہیں کہیں یوروپین مصنفین کے اقتباسات دئے ہیں ' جن کی ضرورت اس کتاب میں نہ تھی ' ان سے بہتر ' وقیع مستند اور اصل ماخذ موجود ہوتے ہوے بچوں

کی اس مختصر کتاب میں ان کا داخل کرنا کچھہ مناسب نہیں —

اگر زبان و بیان میں کسی قدر سلاست و سہولت کا خیال رکھا جاتا تو چھوٹی جماعت کے بچوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوتی ' بحالت موجودہ مڈل کلاس کے طالب علموں کے لئے مفید ہے —

(چ)

اعمال محمود

(مصنفۂ مولوی حافظ علی خاں صاحب عزیز ' اسدی سابق ناظم دینیات مسلم اسکول جے پور - قیمت مجلد بارہ آنے ' غیر مجلد آتھہ آنے - هیڈ ماسٹر صاحب مڈل اسکول جے پور سے مل سکتی ہے) —

قابل مصنف نے قصے کے پیرائے میں جو سراسر حقیقت پر مبنی ہے بڑی خوبی سے اسلام کی خوبیوں کو بیان کیا ہے - محمود کوئی فرضی نام نہیں اس پردے میں آنحضرت صلعم کی زندگی کے حالات اور اُن کے زبردست کیریکٹر کو بیان کرکے اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا ہے - زبان بہت اچھی اور شستہ اور پیرایۂ بیان بہت خوب ہے —

اردو کے جدید رسالے

طبیہ کالج میگزین

یہ سہ ماہی رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڈہ کے طبیہ کالج سے شایع

ہونا شروع ہوا ہے - اگرچہ اڈیٹر اس کے طالب علم ہیں لیکن نگران کالج کے قابل پرنسپل ڈاکٹر عطا اللہ بھٹ ایم - ڈی (برلن) ہیں اور اڈیٹوریل بورڈ میں کالج کے فاضل طبیب اور ڈاکٹر شریک ہیں —

رسالہ حسن صورت اور حسن سیرت دونوں اعتبار سے قابل تعریف ہے اور ہم رسالے کے کارکنوں کو اُن کے سلیقے ' محنت اور خوبی مضامین پر دل سے مبارک باد دیتے ہیں —

تمام مضامین تحقیق اور غور کے بعد لکھے گئے ہیں - حکیم عبدالطیف (فلسفی) صاحب کا مضمون تجدید طب کے تحت عناصر پر بہت محققانہ ہے اور قدیم و جدید معلومات پر نہایت عالمانہ اور منصفانہ بحث کی ہے اسی طرح دوسرے مضامین مثلاً محمد زکریا رازی ' احتباس لحمث ' تحذیر صحت و مختلف امراض میں کیفیت الدم وغیرہ خاص حیثیت رکھتے ہیں علاوہ ان کے عام فائدے اور معلومات کے متعلق قبض ' حیاتین ' تمباکو ' مکھی وغیرہ کے مضامین بہت مفید ہیں - زبان اور طرز بیان حتی الامکان ایسا ہے کہ صاحب فن اور عام لوگ دونوں مستفید ہوسکتے ہیں —

یوں تو طبی رسالے ہمارے ملک میں متعدد شایع ہوتے ہیں لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اس سے بہتر رسالہ اب تک شایع نہیں ہوا - اگر اس کا معیار یہی رہا تو اس میں شک نہیں کہ یہ طب کی بہت بڑی خدمت کرے گا اور اہل ملک کو بہت کچھہ فائدہ پہنچاے گا - ہمارے ملک میں صحت و امراض سے متعلق ضروری اور معمولی باتوں سے عام ناواقفیت ہے اگر اس قسم کی معلومات کی جیسی کہ اس رسالے میں درج ہیں عام اشاعت کی جاے تو اس سے نہ صرف ہمارے علم میں اضافہ ہوگا بلکہ ہم اپنی صحت کو بہت بہتر بناسکیں گے اور بہت سی تکلیفوں سے نجات پا جائیں گے —

رسالہ کا حجم بڑی تقطیع پر ۱۷۰ صفحے ہے - لکھائی چھپائی کاغذ اعلی درجے کا - چندہ سالانہ چار روپے ' جو رسالے کی خوبیوں کے مقابلے میں

کچھ بھی نہیں —

جہانگیر

یہ نیا ادبی ماہانہ رسالہ لاہور سے شایع ہوا ہے - اڈیٹر محمد احمد خاں صاحب درانی اور سید شبیر حسین صاحب قیس حیدرآبادی ہیں زیادہ تر نظمیں اور فسانے ہیں - شعرا میں حضرت جوش ملیح آبادی ' حضرت اصغر گونڈوی ' ایم - حسن لطیفی صاحب ' حضرت جاہل کی نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں - لطف ذوق کے لئے بعض غیر زبانوں کی نظموں کے ترجمے کئے گئے ہیں - حجم بڑی تقطیع پر ۱۲۰ صفحہ ہے - قیمت سالانہ صرف تین روپے —

مورخ

یہ چھوٹی سی تقطیع کا چھوٹا سا ماہانہ رسالہ فیض آباد سے مولوی سید علی اظہر (عابدی) کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے - تاریخ میں تحقیق کی بہت گنجائش ہے اور اگر محنت اور قابلیت سے کام کیا جاے تو بہت مفید اور بڑا کام ہوسکتا ہے - اس رسالے میں طویل مضامین کی گنجائش نہیں - اور اگرچہ اس میں محققانہ مضامین درج نہیں ہیں تاہم جو مضامین اس کے لیے لکھے گئے ہیں وہ دلچسپ اور مفید ضرور ہیں - تاریخی مضامین میں صحت واقعات کا خاص لحاظ رکھنا چاہئے اور جو واقعہ بھی لکھا جاے اس کے لیے سند حوالہ درج کرنا لازمی ہے - سالانہ چندہ دو روپے چار آنے ہے —

الضیا

یہ عربی زبان کا ماہانہ رسالہ لکھنؤ سے مولوی مسعود عالم صاحب ندوی کی زیر ادارت ماہ محرم سے شایع ہونا شروع ہوا ہے - لکھنؤ سے پہلے بھی ایک

رسالہ اسی قسم کا شایع ہوا تھا لیکن وہ کچھہ بہت دنوں تک نہ چلا لیکن اِس رسالے نے اپنے معاونین ایسے پیدا کئے ہیں جس سے یہ توقع ہوتی ہے کہ یہ رسالہ کامیابی سے چلے گا - شاید یہ وقت بھی اس کے لئے مناسب ہے - یہ ادبی اور علمی رسالہ ہے جیسا کہ اس کے مضامین سے ظاہر ہے - جو لوگ عربی زبان کے دلدادہ ہیں انہیں اس سے بہتر رسالہ ہندوستان میں نہیں مل سکتا - افسوس ہے کہ رسالہ لیتھو میں چھپتا ہے حالانکہ عربی کے ٹائپ بہت اچھے موجود ہیں اگر ٹائپ میں چھپتا تو اس کا حسن ظاہری بھی بڑھ جاتا --

سالانہ چندہ تین روپے آٹھہ آنے ہے —

مطالعہ

یہ ہفتہ وار جریدہ لدھیانہ سے ایم - حسن لطیفی صاحب بی - اے (ڈپلوما یافتہ لندن اسکول آف جرنلزم) کی زیر ادارت اسی سال جاری ہوا ہے پورا جریدہ خود حضرت اڈیٹر لکھتے ہیں - تنہا نگاری کی یہ پہلی مثال ہے - یہ ہر شخص کا کام نہیں - ہم لطیفی صاحب کے عزم و ہمت کی داد دیتے ہیں - انہوں نے خوب سمجھہ کر اس کام کو اپنے ہاتھہ میں لیا ہے - وہ اپنے ہم وطنوں کو اپنے خیالات سے فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں - اُن کا مقصد نیک ہے اور اپنی کامیابی پر وثوق رکھتے ہیں - یہ ہفتہ وار ہے اور اس سے یہ دھوکا نہ ہونا چاہئے کہ معمولی اخبار ہے - یہ ایک ادبی اور علمی جریدہ ہے اور فاضل اڈیٹر اپنی جدید اور اعلیٰ معلومات سے خیالات میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں - ان کی تحریر میں شان و شکوہ ہے - وہ معمولی الفاظ اپنے جریدہ کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اکثر ان کی بجاے شاندار الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں اور جب نہیں ملتے تو خود وضع کر لیتے ہیں - البتہ یہ بات دل میں کھٹکتی ہے کہ یہ پر شکوہ طرز بیان ایک جریدہ کے لئے کہاں تک مناسب ہے ؟

ہمیں تعجب ہوا ہے کہ ایک ایسا صاحب عزم ادیب بعض اخباروں کی تنقید سے اس قدر برہم ہو کہ آپے سے باہر ہو جاے اور جواب میں ایسے الفاظ اور فقرے لکھہ جاے جو متین اہل قلم کے لئے زیبا نہیں - مثلاً وہ تحریر فرماتے ہیں " اعتراض

کیا جاتا ہے کہ مطالعہ کی ضخامت بہت کم ہے ' سمجھہ میں نہیں آتا کہ جب پہلے پوسٹر میں اس امر کی وضاحت کردی گئی تھی کہ صرف آٹھہ صفحے ہونگے تو اُس وقت وہ حضرات کیوں خاموش رہے ؟ اور اگر وہ کہیں کہ سائز تو ہمیں معلوم نہ تھا ' وہ خود ہی بتلائیں کہ ایک معقول هفت روزہ جریدہ کا سائز اور کیا ہو —

ضخامت ! ضخامت ! ضخامت !!! چہ خوب ! چہ خوش ! یہ شور بدتمیزی " سگ بانگ می زند " سے کم نہیں —

عشوہ فروشان " متانت " کو میرا جواب یہ ہے کہ انھیں کوئی مجبور نہیں آتا کہ وہ " مطالعہ " کا پرچہ خرید فرمائیں ' انھیں بار بار " صفحے تھوڑے ہیں " " صفحے تھوڑے ہیں " کہہ کہہ کر اپنی زبان مبارک کو جنبش تکلم دینے کی ضرورت نہیں ...... وہ " گرگان بارہ دید " جو بظاہر معصوم نظر آتے ہیں اُن " بھیگی بلیوں " پر گرم نوازش کیوں ہیں جن کی گرنجی آنکھوں میں " مطالعہ " کی ایک ایک زبر اور ایک ایک زیر نوک خار کی طرح کھٹک رہی ہے ؟ ...... ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ " مطالعہ " کے بعض متین اور سنجیدہ قارئین بھی ضخامت کے کم ہونے کے شاکی ہیں ' تو اگر وہ اپنا چندہ بھجوا چکے ہوں تو خط بھیج کر واپس منگوالیں اور اگر یہ بھی اُن کے مزاج مقدس پر گراں ہو اور وہ غوغا آرائی کو ترجیح دیں تو اس کا بلیغ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اور خریداروں کو تو آٹھہ صفحے ارسال کئے جائیں ' اُن کو صرف چار - ! "

کیا بلیغ جواب ہے - ہمیں اس جواب کو پڑھ کر افسوس اور صدمہ ہی نہیں ہوا بلکہ بہت شرم معلوم ہوئی اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ " مطالعہ " کے سمجھنے کے لئے صحیح دماغ کی ضرورت ہے " - اللہ اکبر ! یہ دماغ !

اگر کسی نے یہ کہا کہ آٹھہ صفحے کم ہیں تو اس میں برا ماننے اور اس قدر طیش میں آنے اور ایسے سخت اور نا ملائم الفاظ کہنے کے کیا معنے - ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ آٹھہ صفحے کم ہیں اور یہی نہیں بلکہ اُن کا استعمال بری طرح کیا جاتا ہے - مثلاً اس کی کیا ضرورت ہے کہ پہلا صفحہ پورا غیر معمولی جلی قلم میں مطالعہ اور اڈیٹر کا نام لکھنے میں صرف کردیا - اس کے لئے آدھا صفحہ کافی ہے اور باقی آدھا آپ اپنے خیالات لطیفہ کے لئے رکھئے - دوسرا صفحہ پورا ایک نظم کی نذر ہو جاتا ہے - اگر نظم جلی قلم میں نہ ہو تو اس میں

بھی کفایت ہوسکتی ہے - اور ایک بار تو سارا اخبار جلی قلم سے لکھی ہوی نظم کی نذر ہوگیا - آخری پورا صفحہ قدر دانوں کے خطوں کے لئے محفوظ ہے - اکثر تین چار سطر کے خط کے لئے پورے صفحے کا خون کردیا جاتا ہے - ان خطوں میں کوئی بھی تو کام کی بات نہیں ہوتی - ان خطوں کا (جو خود اڈیٹر کی تعریف میں ہیں) ویسے بھی درج کرنا نامناسب ہے - ان خطوں سے تو نکتہ چینوں کے اعتراض هزار درجہ بہتر ہیں —

فاضل اڈیٹر کو خود سمجھنا چاہئے کہ اُن کے اخبار میں بہت کم گنجائش ہے اور جس قدر فضول چیزیں اس میں سے خارج ہوسکیں خارج کر دی جائیں اور ایک ایک انچ جگہ کام کی باتوں کے لئے محفوظ رکھی جاے - مثلاً انہوں نے ایک پرچے میں دو صفحوں پر اپنے دو انگریزی کے خانگی (پرائیوٹ) خط شایع کئے ہیں - ان میں سے ایک عشقیہ خط ہے - ہماری سمجھ میں مطلق نہیں آیا کہ اس سے آپ کی کیا غرض تھی اس خط میں زبان یا خیالات کی کوئی بھی تو ایسی خوبی نہیں کہ اسے اردو کے جریدے میں خاص طور پر شایع کیا جاتا —

بہر حال ہمارا مشورہ یہی ہے (اور اس میں ہرگز کسی بدنیتی کو دخل نہیں) کہ وہ ان تمام فضول اور بیکار چیزوں کو فوراً خارج کردیں اور ممکن ہو تو اس بارے میں کفایت کو کام میں لائیں ۔ چھپائی بہت خراب ہوتی ہے اس کی اصلاح فرمائیں - زبان کو جو بعض اوقات انگریزی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے ، کسی قدر سلیس اور عام فہم بنانے کی کوشش کریں - صبر اور تحمل سے کام لیں ، ذرا ذرا سے نکتہ چینی پر اس طرح بگڑنا ان کی شان کے خلاف ہے - اور بے ادبی معاف ! تھوڑا سا انکسار بھی ہو تو کچھ بیجا نہ ہوگا —